اُمِ مریم

میرے گمشدہ



پیش لفظ

شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے
تمام تر لازوال اور بے مثال تعریفوں کے لائق ہے، وہ پاک ذات
جو تمام جہانوں کا خالق و مالک ہے۔

ہر انسان کچھ خواب دیکھتا ہے، مگر ضروری نہیں کہ وہ خواب حقیقت کا خوبصورت روپ بھی دھار لیں۔ میں احسان مند ہوں اپنے رب کی کہ اس سے جو مانگا پا لیا اور یہ بہت بڑی خوش بختی ہے۔

میرے گمشدہ میری دوسری کتاب ہے جو شائع ہوئی۔ اور اس میں جتنی بھی کہانیاں ہیں ان میں جو موضوع ہے، وہ محبت کا ہی موضوع ہے اور یہی ان کی واحد یکسانیت ہے اور میرے خیال میں، محبت کو کسی ایک احساس یا جذبے سے منسوب کر دینا درست نہیں۔ میرے نزدیک محبت کا دائرہ بہت وسیع ہے، ہر خوبصورت احساس، اور ہر دلنشین جذبہ محبت ہے بقول شاعر ۔

کسی پیاسے کو اپنے حصے کا پانی پلانا بھی محبت ہے
بھنور میں ڈوبتے کو ساحل تک لے کے جانا بھی محبت ہے

کہیں ہم راز سارے کھول سکتے ہوں، مگر پھر بھی
کسی کی بے بسی کو دیکھ کر، خاموش رہ جانا محبت ہے

کسی کے واسطے جیرا ہی ہونٹوں پر ہنسی لانا محبت ہے
کبھی بارش میں بھیگتے بلی کے بچے کو

ذرا سی دیر کو گھر سے کے آنا بھی محبت ہے
کوئی چڑیا جو کمرے میں بھٹک آن نکلی ہو

تو اس چڑیا کو پنکھے بند کر کے راستہ باہر کا دکھانا محبت ہے۔
کسی بھی رنگ میں ہو یہ
مجھے اچھا لگتی ہے
یہ میرے دل کو بھاتی ہے
ایسے ہی حسین جذبوں اور احساسات کو جمع کر کے، میں نے اسے "میرے گمشدہ" کا نام دیا ہے آپ کے لئے، اپنے رب پہ موجود اس یقین کے ساتھ، کہ یہاں بھی مجھے "وہ" کامیابی، سرخروئی اور محبتوں سے نوازے گا۔
آپ سب اور خاص طور پہ اپنے ملک کی سلامتی کی شدتوں سے دعا گو!

اُمِ مریم

میرے گمشدہ

کیا آپ نے کبھی سنہری پروں والی تتلی کو غور سے دیکھا ہے؟ میں نے دیکھا اور کئی بار دیکھا مگر مجھے کبھی نہ تو کسی رنگین تتلی نے متاثر کیا اور نہ اسے چھونے کی بے تاب سی خواہش میرے اندر اُمڈی۔ شاید اس سے قبل میں نے کسی تتلی کو اور وہ بھی سنہرے پروں والی تتلی کو اتنے دھیان سے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا، جب میں نے پہلی بار گلاب کے پھول پہ سنہرے پروں والی تتلی کو دیکھا تو قدرت کی اس قدر حسین اور نازک تخلیق نے مجھے کئی ثانیوں تک مبہوت کیے رکھا۔ تکنگی باندھے سحر زدہ سا میں اسے تکتا چلا گیا تھا اور پھر — پھر اچانک میرے اندر اسے چھونے کی ایک بے کل کر دینے والی خواہش اُمڈی جس پہ میں کسی طور بھی قابو نہ پا سکا۔ اسے چھونے اور اپنی انگلیوں کی پوروں پہ اس کا سنہرا پن اترتا ہوا دیکھنے کی عجیب سی خواہش نے مجھے اتنا مضطرب کیا کہ میں کسی طرح بھی خود کو روک نہ پایا، اسی خواہش کے زیرِ اثر میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی بے خبری کے عالم میں اسے اپنی مٹھی میں قید کر لیا۔ اس کی خوب صورتی اس کے سنہرے پن میں تھی، اور وہ سنہرا پن اب میری پوروں میں سما چکا تھا۔ میرے ہاتھ کی حدت اور سختی اس کا نازک وجود برداشت نہ کر پایا اور ایک عجیب سی کسک میں مجھے مبتلا کر گیا۔ وہ لڑکی بھی تو اس سنہری پروں والی تتلی کی ہی طرح تھی اجلی، پاکیزہ اور معطر جسے میری اندھی خواہش نے اجاڑ ڈالا اور وہ عمر بھر کی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کسک میرے دل میں چھوڑ گئی۔

☆☆☆

لندن کی ایک دھند آلود... شام دھرتی پر اترنے ہی والی تھی مگر فضا میں تیرتا ہوا دھند لا غبار شام سے بہت قبل ہی شام کا سماں باندھ چکا تھا۔

لندن کے اس ریلوے اسٹیشن پر مخصوص گہما گہمی تھی۔ ٹرین آچکی تھی اور چونکہ یہاں ہر کام اعتدال اور قرینے سے انجام پاتا ہے سو کوئی افراتفری نہیں تھی۔ اور کوٹ کے کالر کھڑے کیے ہاتھ میں موجود بیگ دھکیلتے ہوئے اسرار شاہ بہت اطمینان سے چلتے ٹرین میں سوار ہوئے اور اپنی سیٹ پہ جا کر بیٹھ گئے۔ کوٹ کی آستین ہٹا کر انہوں نے رسٹ واچ پر ٹائم دیکھا، پونے پانچ ہو چکے تھے۔ بیگ سے میگزین نکال کر وقت گزاری کے لیے انہوں نے یونہی ورق گردانی کرنا شروع کی تھی، مگر جلدی ہی اکتا گئے اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ ان کی اگلی منزل شہر لیسٹر تھا۔ جہاں انہیں اپنے دوست سے ملاقات کرنے کے بعد واپس پاکستان کے لیے فلائی کرنا تھا۔

''تم اتنے سالوں بعد آئے ہو اور اتنی جلدی لوٹ رہے ہو۔ یار تمہارے کون سے بیوی بچے گھر بیٹھے راہ دیکھ رہے ہوں گے جو تم اتنی جلدی بھاگنا چاہ رہے ہو۔'' وہ لیسٹر پہنچ کر صالح کے مکان پہ جانے کے بجائے سیدھے اسٹور چلے آئے تھے کہ جانتے تھے وہ اس وقت انہیں وہیں مل سکتا ہے۔

خشک میوہ جات کے پیکٹ کاؤنٹر سے اٹھا کر الماری کے سب سے نچلے خانے میں رکھتے ہوئے صالح نے مسکرا کر انہیں چھیڑا۔ ان کے وجیہہ چہرے پہ ایک تاریک سا سایہ لہرا کر معدوم ہو گیا۔

''سوری یار! لیکن میں چاہ رہا تھا کہ تم کچھ دن ضرور رکتے۔ میں بھی کئی دنوں سے بچوں کو چھوٹے لارے دے رہا ہوں کہ انہیں سیر کے لیے سوئزر لینڈ لے جاؤں گا۔ اب تمہارے ساتھ سنجیدگی سے پروگرام فائنل کر لیتا ہوں۔''

''نہیں یار! پلیز تم میری وجہ سے کوئی پروگرام نہ ہی بناؤ تو اچھا ہے میں اس مرتبہ یہاں آ کے کچھ بے چین سا ہو گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا ایسا کیوں ہے۔''

''ایکسکیوز می! بل کلیئر کر لیں۔ مجھے ذرا جلدی ہے پلیز۔'' سولہ سے اٹھارہ سال کے درمیان گندمی رنگت اور سیاہ ریشمی بالوں والی ملکوتی نقوش کی لڑکی رواں انگلش میں کہتی ان کی گفتگو میں مداخلت کر گئی تھی، صالح معذرت کرتا اس کی سمت متوجہ ہوا تھا۔ اسرار شاہ

بھی عام سے انداز میں اسے دیکھنے لگے تھے مگر عام سے انداز میں اٹھی ان کی نگاہ پلٹنے سے انکاری ہو گئی۔ سامان کے بیگ اٹھائے وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے پلٹی تب وہ چونکے تھے ان کا دل بے ترتیبی سے دھڑکتا رہ گیا۔ ''ایکسکیوز می پلیز جسٹ اے منٹ۔'' انہیں بہت شدت سے احساس ہوا تھا کہ اگر انہوں نے یہ ایک لمحہ گنوا دیا تو وہ ساری عمر تشنہ رہ جائیں گے، سرعت سے لپکتے ہوئے اس کا راستہ روک لیا۔

''آر یو پاکستانی؟''

''یس۔'' وہ کچھ حیران سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

''کیا آپ مجھے اپنا نام بتا سکتی ہیں۔'' انہوں نے دھونکنی کی طرح تیز چلتی ہوئی سانسوں کے درمیان سوال کیا تو اس کے چہرے پہ جو تاثر ابھرا اس میں انہیں مسکراہٹ کا شائبہ محسوس ہوا تھا۔

''یس آئی ایم دعا۔''

''دعا بہت منفرد نام ہے۔ گڈ گرل'' انہوں نے بے ساختہ اس کا گال سہلایا۔ تب وہ جیسے کھل کر مسکرا دی۔

''تھینکس، اب میں جاؤں۔''

''ہاں، مگر ایک کام کرو۔'' انہوں نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

''جی۔'' وہ منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

''کیا میں تمہاری مدر کا نام پوچھ سکتا ہوں؟'' انہوں نے تھوک نگل کر حلق تر کرتے ہوئے یہ مشکل سوال کیا تھا۔ انہیں لگا اس کے چہرے کا خوشگوار تاثر پل بھر میں بدلا ہے، انہیں دیکھے بغیر بھی صالح کی نگاہوں کا بہت شدت سے احساس تھا مگر وہ اس وقت گویا اپنے حواسوں میں نہیں تھے۔

''سوری میں آپ کو اپنی مدر کا نام نہیں بتا سکتی، ویسے کیا میں پوچھ سکتی ہوں آپ یہ سب کیوں جاننا چاہ رہے ہیں؟'' اس نے ہلکی سی خفگی لیے انہیں دیکھا۔ تب وہ نگاہ چرا کر کچھ بے تاب سے ہو گئے۔

''کیا... کیا تم مجھے اپنے فادر کا نام بھی نہیں بتاؤ گی۔''

''نہیں کیونکہ ممی نے مجھے منع کیا ہے۔'' اس کی بات پہ انہوں نے بری طرح

چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی گرے گرین آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ان کے اندر کچھ کلک ہوا تھا۔ وہ گم صم سے رہ گئے جبکہ وہ جا چکی تھی۔

تمہیں پلٹ کر دیکھنا ایسا ہی ہے
جیسے کوئی مرنے کے بعد پھر سے زندگی پا لے

☆☆☆

وہ شفاف موتی ان کی آنکھوں سے ٹوٹ کر بکھرے اور گریبان میں کہیں گم ہو گئے۔

"یا ذوالجلال والاکرام، مجھ پر رحم فرما۔" بے چینی، اضطراب اور بے کسی کے عالم میں انہیں بھی وہی رب یاد آیا تھا جو انسان کے سب سے زیادہ نزدیک ہے۔ ساری رات وہ بے چین رہے تھے۔ تلخ یادیں تمام تر اذیت کے احساس سمیت انہیں بے کل کرتی رہی تھیں، خاصی دیر تک دعا مانگنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے پردہ ہٹا کر سلائیڈ کھولی تو تیز ہوا کا نم جھونکا پورے کمرے میں پھیل گیا۔ انہوں نے فضا میں تیرتی کہر کو اداسی سے دیکھا اور پلٹ کر اپنے لیے کافی بنانے لگے۔ ان کا مضبوط لمبا چوڑا شاندار سراپا آج بھی ہر محفل میں نمایاں رہتا تھا۔ ان کے جاننے والے ابھی تک ان کی وجاہت کی مثال دیا کرتے تھے۔ بہت بھرپور اور مکمل زندگی گزاری تھی انہوں نے مگر اب..... اب جو بے چینی ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی وہ کسی پل انہیں چین نہیں لینے دیتی تھی بہت کچھ کھو دینے کا ملال اور بالکل تنہا رہ جانے کی اذیت انہیں پل پل کچوکے لگاتی انہیں ان کی زیادتی کا احساس دلا رہی تھی۔

"کیا بگاڑ سکتی ہو تم میرا، ہاں، بولو۔" ان کی وحشی رونجتی اور انہیں اپنی ہی آواز کسی بازگشت کی طرح سنائی دی جو بات کبھی انہوں نے بہت متکبرانہ انداز میں کی تھی۔

"میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، اسی لیے تو تم نے میرے ساتھ یہ کیا، لیکن میرا اللہ تمہارا سکون چھین لے گا اسرار شاہ! تمہارا سب کچھ بگاڑ دے گا اس لیے کہ جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا وہ اسے پسند نہیں۔"

جواباً اس نے سسکتے ہوئے انہیں بددعا دی تھی..... کافی کا بھاپ اڑاتا مگ ان کے سامنے پڑا بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ اس پر جمی بالائی کی تہہ اس سے ان کی غفلت کی گواہ تھی وہ سر

جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے گرد آلود ہوا کی طرح ماضی ان کی آنکھوں میں چبھنے لگا۔

☆☆☆

ایک قیامت تھی جو ٹوٹی تھی۔ ایک روح فرسا انکشاف۔ حویلی میں ہر سو آہ بکا تھی۔ مضطرب تو وہ بھی تھا آخر وہ اس کی بہن تھی جواں سال جڑواں بہن جس نے ماں کے پیٹ میں اس سے اپنی دھڑکنیں، اپنی سانسیں بھی شیئر کی ہوں گی، وہ اچانک زندگی سے منہ موڑ گئی تھی اگر اسے اس کے سرہانے پڑا وہ تہہ شدہ کاغذ نہ ملتا تو وہ بھی باقی سب کی طرح اندھیرے میں رہتا۔

تو یہ وجہ تھی اس کی موت کی۔ میں تمہیں کتے سے بدتر موت ماروں گا معاذ ارتضیٰ تم نے میری بہن کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ کاغذ کا وہ پرزہ اس کے فولادی ہاتھ میں چرمرا گیا تھا۔ دہکتی لہو ٹپکاتی آنکھوں اور سرخ چہرے سمیت وہ جیسے خود سے عہد باندھ رہا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو اسرار شاہ؟ ابھی تو میرہ کا چالیسواں بھی نہیں ہوا۔" اسے بیگ سمیت بالکل تیار دیکھ کر اماں نے بے ساختہ سوال کیا پھر پلو سے نم آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے بلک اٹھی تھیں۔

"ہائے اللہ سائیں، ایک ہی تو دھی تھی۔ مجھے تو اسے سوہا جوڑا پہنا کر ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرنا تھا۔ سفید کفن میں نہیں۔" ان کی درد بھری پکار نے اسرار شاہ کا دل چیر کے رکھ دیا۔ اسے لگا تھا وہ بھی ضبط کھو کر رو دے گا جب ہی لب بھینچے سرعت سے پلٹ کر باہر نکلتا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

کال بیل کے جواب میں کھلا ہونے پہ جو چہرہ اسے نظر آیا اسے روبرو پا کے اسرار شاہ کو اپنے وجود میں بھونچال سا اٹھتا محسوس ہوا تھا جبکہ دوسری طرف وہ اسے یوں اچانک سامنے پا کے خوشگواریت میں گھرتا والہانہ انداز میں بغلگیر ہو گیا تھا۔

"اسرار! واٹ اے سرپرائز یار، رئیلی بہت خوشی ہو رہی ہے مجھے تمہیں یہاں دیکھ کر۔ کیسے ہو؟" اس کے کاندھے پہ اپنا بازو دھرے وہ اندر کی جانب بڑھا تھا۔

اسرار شاہ نے بہ مشکل اپنے چہرے کو نفرت چھلکانے سے باز رکھا مگر پھر بھی جب بولا تو اسکے اندر کی ساری تپش اس کے لہجے میں سمٹ آئی تھی۔

"مگر میں بالکل ٹھیک نہیں ہوں نہ مجھے تم سے مل کر کوئی خوشی ہوئی ہے۔" معاذ ارتضیٰ کو جھٹکا لگا تھا۔ شاید اسے اس جواب کی قطعی امید نہیں تھی۔ اس نے بغور اس کا چہرہ دیکھا، جو بالکل سپاٹ تھا ماسوائے آنکھوں کے کہ ان خوبصورت آنکھوں میں اسے دھندلا غبار نظر آیا تھا۔

"آؤ بیٹھو اسرار! مجھے تمہاری طبیعت کچھ اچھی محسوس نہیں ہو رہی۔" وہ اسے لیے ڈرائنگ روم میں آگیا تھا۔

"ہاں میری طبیعت واقعی اچھی نہیں ہے۔" اس نے فوراً اعتراف کر لیا۔ اس کے اندر جو جوار بھاٹے اٹھ رہے تھے اس میں اتنی شدت تھی کہ چہرے سے چھلک رہی تھی۔

"مہرو مر گئی، میری بہن مر گئی ہے۔" بھرائے ہوئے لہجے میں کیا گیا یہ انکشاف معاذ ارتضیٰ کو پل بھر میں سرد کر گیا۔ اس کا چہرا فق ہوا تھا۔"

اسرار شاہ نے بہت عمیق نگاہ سے اس کے چہرے کے اس اتار چڑھاؤ کو دیکھا تھا اور دل میں اس کے لیے شدید قسم کی نفرت محسوس کی۔

"یہ وہی بہن تھی نا تمہاری جس کی شادی ہونے والی تھی۔ مجھے واقعی بہت افسوس ہوا۔ اللہ اسے جوار رحمت میں جگہ بخشے۔ آمین۔" اگلے ہی پل وہ خود کو سنبھال کر ڈھارس بندھانے والے انداز میں اس کا ہاتھ تھپک کر بولا تو اسرار شاہ نے اپنا چہرا جھکا کر اپنی نفرت اور تپش کو چھپانے کی کوشش کی۔

"میری ایک ہی بہن تھی۔" وہ آہستگی سے کہہ رہا تھا۔

"بھائی! آپ مارکیٹ کب جا رہے ہیں۔ مجھے بھی....." اپنے دھیان میں بات کرتی ہوئی عید اندر آتے ہی ٹھٹکی تھی۔

"اوہ۔ سوری، [illegible] میں پھر بات کر لوں گی بھائی۔" اسرار شاہ کی پر اسرار، گہری اندر تک اتر جانے والی نگاہوں سے خائف ہوتی، وہ کچھ بے ربط سے انداز میں کہتی تیزی سے پلٹ گئی تھی۔

"میری بہن ہے عید۔" معاذ ارتضیٰ نے دھیمے سے مسکرا کر گویا تعارف کی رسم نبھائی تھی، اسرار شاہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا ذہن بہت سرعت سے کچھ سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

معاذ ارتضیٰ کے چہرے پر لاتعداد شکنیں تھیں۔ الجھن، پریشانی، تاسف، پشیمانی۔

اسرار شاہ جا چکا تھا اور وہ نیٹ پریکٹس کے لیے جانے کی بجائے اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی تلخ کافی نہیں پی تھی مگر ابھی کچھ دیر قبل وہ تلخ کافی کے دو مگ چڑھا گیا تھا۔ اس سے قبل اس نے کبھی خود کو اتنا ذہنی طور پر مفلوج بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ خود کو کچھ کرنے کے قابل نہ پائے گو کہ وہ جانتا تھا آج کی نیٹ پریکٹس بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے مگر.....

اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ کل کوچ کے علاوہ اس پر بورڈ کے تمام ارکان کی وجہ سے کتنا پریشر ہو سکتا ہے۔ اس کوتاہی پر اسے بڑے نقصان سے بھی دوچار ہونا پڑ سکتا تھا۔ مثلاً اس اہم ٹور سے اس کا نام خارج کر دیا جاتا یا پھر اسے بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑتا، کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر وہ اس کے باوجود نہ جا سکا۔ فون کی گھنٹی بجتی رہی تھی مگر اس نے کان بند کر لیے تھے، اس نے ملازمہ کو ڈسٹرب کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس نے بڑی دقتوں سے اسرار شاہ کے سامنے خود کو کمپوزڈ رکھا تھا ورنہ اس خبر نے اس کے اندر ہول اٹھا دیے تھے۔

وہ بے حس ہی تو نہیں تھا، اسی لیے تو بے قصور ہوتے ہوئے بھی وہ سخت ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔ اسے وہ شام اچھی طرح یاد تھی جب وہ اسرار کے بے پناہ اصرار پر اس سے ملنے گاؤں گیا تھا۔ وہ پچھلے ایک سال سے اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا اور اب تو باقاعدہ ناراض ہو چکا تھا اور معاذ ارتضیٰ اپنا اتنا اچھا دوست کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پاس رشتوں کی بہت کمی تھی۔ اس کے ماں باپ عید کی پیدائش کے ایک سال بعد روڈ ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو چکے تھے اب وہ اور عید ہی تھے اور ان کی بے تحاشا دولت۔ اسے شروع ہی سے کرکٹ سے لگاؤ تھا۔ اسکول و کالج میں وہ اپنی ٹیم میں ہمیشہ بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ وہ بھی اس کا کالج کی طرف کھیلا گیا ایک اہم ٹورنامنٹ تھا ان کے کالج کی ٹیم نے لاہور کے کالج کی ٹیم کو دس وکٹوں سے شکست دی تھی اور اس میچ میں پانچ وکٹوں اور ہیٹ ٹرک کی وجہ سے اسے مین آف دی میچ کا ایوارڈ دیا گیا تھا۔

"پھر خدا کا فضل اور مہربان خصوصی کی نگاہ کرم اسے بہت جلد قومی کرکٹ ٹیم کا اہم رکن بنا گئی۔ اب یہ وقت تھا کہ ٹیم میں اسے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ کرکٹ کی دنیا کا درخشاں ستارہ تھا لمبا قد... سرخ و سفید رنگت، وہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے دل کی دھڑکن بنا ہوا تھا اس کے باوجود بھی اس کے مزاج میں نہ تو تکبر و غرور تھا نہ ہی

دکھاوا وہ منکسر المزاج اور سلجھا ہوا نوجوان تھا۔

اسرار شاہ سے اس کی دوستی اسکول لیول سے تھی جو قومی ٹیم میں شمولیت اور اس کے بعد کی روز بروز بڑھتی مقبولیت کے بعد بھی کم نہ ہوئی تھی۔ اسرار شاہ صحافی تھا اور وہ کرکٹر۔ اکثر ان کا سامنا بھی ہوتا رہتا۔ اسرار شاہ پڑھا لکھا باغی نوجوان تھا۔ باپ کی جاگیر اور سرداری کو چھوڑ کر شہر میں اپنی پسند کی زندگی جی رہا تھا۔ اب وہ اپنی بہن کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں گاؤں میں تھا اور معاذ ارتضیٰ کو ابھی دنوں ایک طویل کرکٹ سیزن کے بعد ذرا فراغت نصیب ہوئی تو اس کا شکوہ دور کرنے اس کے گاؤں چلا گیا۔ دو دن اس کے ساتھ گزار کر وہ اس روز واپس آنے والا تھا جب ایک نازک اندام دلکش لڑکی اس شام اس کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ چونکہ اسرار کے روکنے کے باوجود جانے کا ارادہ باندھ چکا تھا۔ جب ہی کپڑے بیگ میں رکھتے ہوئے دروازے پر آہٹ محسوس کر کے چونکے بنا بولا تھا۔

''مجھے مزید مت روکو یار، ورنہ عید بہت خفا ہو جائے گی، بالکل بات نہیں کرے گی مجھ سے۔''

''عید کون ہے؟'' وہ عین اس کے سامنے آ کر جس اعتماد سے بولی تھی، اس نے معاذ کے اعتماد کو بکھیر کر رکھ دیا۔ حلیے اور صورت سے وہ ہرگز ملازمہ نہیں لگتی تھی۔

''آ...... آپ؟'' وہ گھبرا کر یہی کہہ پایا کہ اس حویلی کی کسی لڑکی کی یہاں اس کے کمرے میں آمد اسے ششدر کر گئی تھی۔

''میں مہرو ہوں، اسرار شاہ کی بہن۔''

''اوہ مگر مہرو بی بی! اسرار تو اس وقت یہاں نہیں۔''

اس نے بند دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے جلدی سے وضاحت دی۔ کسی بھی وقت کوئی بھی آ سکتا تھا اور اسے یہاں سے ذلیل ہو کر نکلنے کا خیال ہی پسینے میں نہلا رہا تھا۔

''جانتی ہوں کہ بھائی اس وقت یہاں نہیں اسی لیے تو آئی ہوں ورنہ دو دن سے تم یہاں ہو، میں تب نہ آ چکی ہوتی۔ مگر بھائی تو کسی سائے کی طرح تم سے چپکے ہوئے تھے۔'' وہ جو کہ کہتی اسے کچھ اور حیران کر گئی تھی۔

''مم مگر آپ کیوں مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔'' وہ ہکلا کر بولا تھا۔ اس پل اس کا ازلی اعتماد اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔

''تم سے ملنے، تمہیں روبرو دیکھنے کی خواہش تھی اور سب سے بڑھ کر مجھے تم سے کچھ کہنا بھی تو تھا نا۔'' بات کے اختتام پر وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔ معاذ ارتضیٰ حیرت سے اسے تکتا رہ گیا۔

''تمہیں پتہ ہے جتنے تم ٹی وی اسکرین پر نظر آتے ہو اس سے کئی گنا بڑھ کے ڈیشنگ ہو۔ ریئل میں تمہارا کوئی میچ مس نہیں کرتی اور جس میچ میں تم نہ ہو، میں وہ دیکھتی ہی نہیں۔ اور میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں، یہ میری دعاؤں کا ہی ثمر ہے کہ تم یہاں ہو میرے سامنے۔ شادی کرو گے مجھ سے؟'' اس کا لہجہ دھیما ہوتے ہوتے سرگوشی میں ڈھل گیا تھا۔ معاذ ارتضیٰ سُن سا کھڑا رہ گیا۔ یہ نہیں تھا کہ اس اظہار نے اسے شاکڈ کیا تھا، یہ بھی نہیں تھا کہ اس سے قبل اس نے اس قسم کی بولڈ لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اس کا واسطہ تقریباً ہر روز ہی ایک سے بڑھ کر ایک بولڈ لڑکی سے پڑتا تھا۔ اسے روزانہ سینکڑوں کے حساب سے کارڈ موصول ہوتے تھے، جن میں اس کے لیے وارفتگی و محبت کا اظہار کیا گیا ہوتا۔ اسے تقریباً روزانہ لڑکیاں شادی کی آفر کرتی تھیں مگر اس طرح بند کمرے میں مکمل تنہائی کے ساتھ یہ پہلا موقع تھا اور وہ بھی اسرار شاہ کی بہن کی طرف سے۔ اس کا گھبرا جانا کچھ ایسا بھی عجیب نہیں تھا۔ اسرار شاہ کے حوالے سے وہ اس کے لیے قابل احترام تھی مگر اب وہ شکنجے میں کسا ہوا محسوس کر رہا تھا خود کو۔

میں کیسے شادی کر سکتا ہوں، آپ سے، ہم میں تو......''

''تم اسرار بھائی سے بات تو کرو۔'' وہ التجا آمیز لہجے میں گڑگڑائی، مگر وہ دامن بچانا چاہتا تھا کہ یکدم وہ لہجہ بدل کر پھنکاری تھی۔

''سنو اگر تم نے میری بات نہ مانی، مجھ سے شادی نہ کی تو میں...... میں بہت برے طریقے سے پیش آؤں گی۔''

''مم مگر یہ سب اتنا آسان تھوڑی ہے۔ میں کیسے اسرار سے بات کروں۔ اس نے بتایا تھا آپ کی شادی طے ہو گئی ہے۔'' وہ اس کی دھمکی سے بری طرح خائف ہوا تھا۔

اسے اپنی آکورڈ پوزیشن کا احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس پر کوئی بھی الزام لگ سکتی تھی۔ اسے یہی خوف اس سے سنبھل کر بات کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

''تو ٹھیک ہے، ہم بھاگ جاتے ہیں۔ میں تمہارے علاوہ کسی سے بھی شادی نہیں

کروں گی سنا تم نے۔" وہ اس کا گریبان پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے بے حد قریب آ گئی۔ معاذ ارتضٰی کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ معاً اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔ اس نے کوشش کرتے ہوئے زبردستی اپنے لبوں پر مسکراہٹ سجائی اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"مگر ہم بھاگ کر کہاں جائیں گے، تمہارا بھائی ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔" وہ جواباً سرگوشی میں ہی بولا۔

"کہیں بھی کسی بھی جگہ۔ پہلے یہاں سے تو نکلو۔"

اس پہ جلت سوار تھی۔ معاذ نے سوچنے کی ایکٹنگ کی تھی پھر اسے دیکھ کر عجیب انداز میں مسکرایا۔

"ٹھیک ہے ——— ابھی میں ایسا کرتا ہوں کہ رات کو تم نکلنا میں تمہارے ایک گھنٹے بعد آؤں گا۔"

"ڈن بالکل ڈن۔" وہ ہنستی ہوئی باہر بھاگ گئی تھی معاذ ارتضٰی کئی لمحوں تک حرکت نہ کر سکا، وہ یوسف نہ تھا کہ اس کی بے گناہی کے لیے دلیل اتر آتی پھر وہ اسی وقت اسرار شاہ کی ناراضگی کی پرواہ کیے بغیر نکل آیا تھا اور اب ..... اب اسرار شاہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ مر گئی۔ مہرو مر گئی۔ وہ جنونی جذباتی لڑکی اپنی تمام تر بے باکی اور نادانی سمیت یوں جان سے ہاتھ دھو کر اسے شدید قسم کے ذہنی خلجان میں مبتلا کر گئی تھی۔

☆☆☆

پاکستان کی سترہ رکنی ٹیم انگلینڈ کے دو ماہ کے ٹور کے لیے کراچی ایئرپورٹ سے فلائی کر چکی تھی معاذ ارتضٰی بھی ساتھ تھا۔ پیچھے عیشہ رہ گئی تھی، گھر کے ملازموں سمیت۔ ایک بوڑھی آیا بھی تھیں وہ اس گھر کی بزرگ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ معاذ ارتضٰی کے باپ نے بھی انہی کے ہاتھوں پرورش پائی تھی۔ معاذ کو اپنی عدم موجودگی میں بھی گویا کبھی عیشہ کی تنہائی نے فکر مند نہیں کیا تھا کہ آیا اماں کی اس کے پاس موجودگی سے وہ بہت مطمئن رہتا تھا۔ اسرار شاہ کو اس کے پاکستان سے جانے کا ہی انتظار تھا اس کی عدم موجودگی میں جب وہ پہلی بار ان کے گھر آیا تو وہ اسے لان میں ہی زخمی بلی کی مرہم پٹی کرتے ہوئے مل گئی تھی۔ تاہم اس کے متوجہ کرنے پہ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"..... آپ؟" اس کی سحر انگیز آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری تھی۔

"مگر معاذ بھائی تو نہیں ہیں۔"

اور اس کا جی چاہا تھا کہہ ڈالے میں اس کے لیے نہیں تمہارے لیے آیا ہوں۔

"آپ کو نہیں پتہ معاذ بھائی تو انگلینڈ جا چکے ہیں۔" وہ انجان تھا۔

"چلیں آپ آئے ہیں تو پلیز بیٹھیں۔ میں چائے منگواتی ہوں۔ آیا اماں پلیز چائے بھجوا دیں ڈرائنگ روم میں۔ سوری بھائی میں آپ کا نام بھول گئی ہوں، حالانکہ بھائی اکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں۔" اسی کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھتے ہوئے اس نے اسی معصومیت سے کہا تھا۔ اس پہلی ملاقات میں وہ اپنے پلان کے مطابق کوئی عمل نہ کر سکا، البتہ جاتے جاتے وہ اشارتاً کہہ آیا تھا کہ آج کی ملاقات اس کی باتیں اسے بہت اچھی لگیں، مگر اسے اتنی امید نہیں تھی کہ وہ احمق سی لڑکی اس کے لہجے کی معنی خیزی کو سمجھ سکی ہو گی۔ اس کا اندازہ اسے اگلی ملاقات میں بہت اچھی طرح سے ہو گیا۔ جب اس نے دوسری مرتبہ بھی اسے معاذ کی عدم موجودگی کے باوجود اپنے روبرو پایا اس روز وہ ملازم کے اس پیغام پہ کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے اپنی اسائنمنٹ ادھوری چھوڑ کر آئی تھی۔

"بھائی کو تو ابھی دو تین ماہ لگ جائیں گے۔ انہیں انگلینڈ ٹیسٹ سیریز کے بعد لنکا شائر کی طرف سے کاؤنٹی کرکٹ کی آفر ہے اور بھائی نے یہ آفر قبول کر لی ہے۔"

"مگر میں تم سے ملنے آیا ہوں۔" اب کے وہ صبر نہ کر سکا۔ وہ اس لڑکی پہ زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"مجھ سے؟" اس کی آنکھوں میں معصومیت امڈ آئی۔ تب اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کے اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ اس روز اس نے اس سے بہت باتیں کی تھیں، اس کے بھائی کی، والدین کی، اسٹڈی کے متعلق بہت سی باتیں۔ وہ دراصل خود سے اس کی جھجک کو دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنا عادی بنانا چاہتا تھا اس کی شخصیت اتنی سحر انگیز اور پرکشش تھی کہ وہ جہاں بھی جاتا سارے لوگ خاص طور پہ نوجوان لڑکیاں نہ صرف متوجہ ہوتیں بلکہ اس کی توجہ حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتی تھیں مگر یہاں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اسے باقاعدہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی سعی کرنا پڑی تھی تو اس کی وجہ اس کی وہ حد سے بڑھی ہوئی معصومیت تھی جو اس کے ہر حربے کو ناکامی سے دوچار کر رہی تھی۔

☆☆☆

مشکل سے سہی، بہر حال وہ اسے اپنی جانب مائل کرنے میں کامیاب رہا تھا اور کچھ ایسے انداز میں اس نے اس پہ گرفت کی تھی کہ وہ بہت برے طریقے سے اس کے پھینکے جال میں پھنس چکی تھی۔ اس کی جکڑ لینے والی نگاہیں، سحر طاری کر دینے والی شخصیت اور باتیں، باتیں تو ایسی تھیں کہ عیشہ کو اس کے دکھائے گئے سبز باغ سچے معلوم ہوتا ہی تھے۔ وہ نہ صرف کم عمر تھی بلکہ معصوم بھی، جب ہی تو وہ اس کی نگاہوں سے چھلکتے رنگ نہ پہچان پائی۔

"اتنے دن سے کہاں تھے آپ؟ آئے کیوں نہیں؟ آپ کو میرا بالکل خیال نہیں تھا۔" پچھلی ملاقات کے بعد اس نے تین دن تک اسے نہ فون کیا تھا نہ ملنے آیا۔ اور تب عیشہ نے غصے میں اس سے بات نہیں کی تھی، اور تب وہ بجائے اسے منانے کے الٹا خفا ہو گیا تھا، اور اب پانچ دن کے بعد اس کی قوت برداشت کو اچھی طرح آزما لینے کے بعد سامنے آیا تو اس بار عیشہ اسے دیکھتے ہی اس کے بازو سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ اسرار شاہ کے لبوں پہ اسے شدتوں سے روتے دیکھ کر تمسخرانہ ہنسی بکھر گئی تھی۔ اس کے اندر تک ٹھنڈک اتر گئی تھی۔ یہی تو چاہتا تھا وہ کہ یہ لڑکی اس کے سوا سب کچھ بھول جائے اور اس کا سسکنا بلکنا تڑپنا اس کی ہار کی کہانی چیخ چیخ کر سنا رہا تھا۔

"عیشہ! کم آن کیا ہو گیا یار، سنبھالو خود کو۔ دیکھو کوئی آ جائے گا۔" اس کے گرد بازو کا حلقہ بنائے وہ بالکل متضاد بات کر رہا تھا۔

"میں مر جاؤں گی آپ کے بغیر۔ اگر آپ نے آئندہ ایسا کیا۔" اس نے گلوگیر لہجے میں شکوہ کیا۔

"نہیں کروں گا پرامس!" وہ میٹھے سروں میں چہکا مگر پھر اسے ڈرانے کو بولا تھا۔

"تمہارا بھائی...... اس کا پتہ ہے۔ اگر اسے پتہ چل جائے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے ہیں تو مجھے جان سے مار دے گا۔"

"بھائی ایسے نہیں ہیں۔" وہ اس کا حصار توڑتی فاصلے پہ چلی گئی۔

"وہ ایسا ہی ہے نہ مانو۔" اس نے درشتی سے کہا تب عیشہ نے نگاہ بھر کے اس کے خفگی کا تاثر چھلکاتے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ اپنی کچھ دیر قبل کی دیوانگی اور بے اختیاری پہ خجل تھی۔

"عیشہ! میں خود بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے

سرگوشی میں گنگنایا۔ عیشہ کے چہرے پہ دھنک بکھر گئی۔

"آپ بھائی سے بات کریں نا۔ وہ منع نہیں کریں گے۔ انہیں میری خوشی بہت عزیز ہے۔"

"اسوہ" میں کہہ رہا ہوں نا کہ، کیا ضروری ہے یہ سب...... تم......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر لبوں سے چھوتے ہوئے بولا تھا۔

"عیشہ! یہ جدائی میرے ضبط کا امتحان ہے، پلیز ان فاصلوں کو مٹا دو۔" عیشہ جھٹک کر اس سے دور ہوئی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ سراسیمہ تھی۔

"وہی جو تم سمجھتی ہو۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولا تو عیشہ سرعت سے دور ہو گئی۔

"آپ مجھے غلط سمجھے ہیں اسرار شاہ! سوری میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔" وہ اسے ششدر چھوڑ کر جا چکی تھی۔

☆☆☆

عیشہ کا صاف صاف جواب اسرار شاہ کو بھڑکا گیا تھا تبھی تو چاہا تھا شوٹ کر ڈالے اس لڑکی کو مگر یہ تو بہت عام سا انتقام تھا۔ وہ معاذ ارتضیٰ کو ایسی ٹھوکر لگانا چاہتا تھا، کہ وہ عمر بھر نہ اٹھ پائے، وہ اس کے منہ پہ کالک پھیر دینا چاہتا تھا اس طرح، کہ وہ کسی کا سامنا نہ کر پائے مگر عیشہ اس کی کے ہر ارادے میں بڑی رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ ہر حربہ آزما چکا تھا مگر وہ اس کے کچھ سننے پہ آمادہ نہیں تھی، بلکہ اب تو اس نے ملنے سے انکار کر کے اسے جلا کے راکھ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کے پاس کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ وہ اس سے نکاح کر لیتا، کیونکہ عیشہ کے اندر گناہ اور ثواب کا فرق اتنی گہرائی اور مضبوطی سے ڈالا گیا تھا کہ اس کے بہکانے کے باوجود نہ نکلا، ہاں وہ اپنے بھائی کی رضامندی کے بغیر اس سے نکاح کرنے پہ آمادہ ہو گئی تھی تو اس کی وجہ ایک تو محبت میں بے بسی تھی، اس کے نزدیک اسرار شاہ کو کھونے کا تصور ہی سوہان روح تھا تو دوسری اہم وجہ معاذ ارتضیٰ کا انکار تھا۔ اس نے سرسری سے انداز میں بہت جھجکتے ہوئے معاذ سے اسرار کے متعلق بات کی تھی، تب اس نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔

"نہیں گڑیا! اسرار میرا صرف دوست ہی رہے گا۔ اس کے ساتھ کسی قسم کا نیا رشتہ

مجھے منظور نہیں۔" معاذ ارتضٰی کے دل میں خوف تھا اسے لگا تھا جیسے اسرار کو اس پہ شک ہے، وہ اسے غلط سمجھ رہا ہے ساتھ ہی آپا اماں سے فون پہ بات کر کے عیشہ کے متعلق معلومات لی تھیں یہ سن کر کہ اسرار اس کی غیر موجودگی میں آتا اور عیشہ سے ملتا رہا ہے، وہ پریشان ہو گیا تھا۔

"آپ نے اسرار کو منع کیوں نہیں کیا۔" "بیٹا میں نے دبے لفظوں میں روکا تھا اور عیشہ کو بھی منع کیا مگر۔"

"مگر کیا؟ پلیز آپا اماں! آپ عیشہ کو اس سے بالکل ملنے نہ دیں۔" اس نے سختی سے تاکید کی تھی جبکہ عیشہ بھی اس کے بعد محتاط ہو گئی تھی۔ اسے اسرار شاہ کی بات بالکل درست لگی تھی۔ اسے یقین کرنا پڑا کہ معاذ کو اسرار شاہ اس حوالے سے پسند نہیں اور جس روز اسے یہ یقین ہوا اسی روز اس نے اسرار کو فون کر کے خفیہ نکاح پر رضا مندی دے دی تھی۔ وہ تو جیسے منتظر ہی تھا، اسی روز اسے کالج سے پک کر کے اس نے عیشہ سے نکاح کر لیا تھا۔

وہ اس کے سامنے بندھی ہاتھوں میں چہرا ڈھانپے سسک رہی تھی، جبکہ اسرار شاہ اس قدر مطمئن تھا۔ نکاح کے بعد وہ اسے اپنے شہر والے گھر لے آیا تھا۔ عیشہ نے جب اسے اس کے ارادوں سے باز رکھنا چاہا تو الٹا وہ خفا ہو گیا تھا۔ اپنا مقصد حل کرنے کے بعد وہ اسے روتا چھوڑ کر خود باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد اسے گھر کے گیٹ پہ چھوڑ کر وہ باہر سے ہی لوٹ گیا تھا پھر اس کا روز ملنے کا مطالبہ بڑھنے لگا۔ عیشہ مکمل طور پر اس کی مٹھی میں تھی۔ پھر جانے کیا ہوا تھا عیشہ نے اس سے ملنا کم کر دیا۔

"آپا اماں کو شک ہو گیا ہے۔" اس نے جواب میں جو وضاحت پیش کی اس نے اسرار کا دماغ گھما ڈالا۔

"اس بڑھیا کی یہ جرأت کہ تمہیں مجھ سے ملنے سے روکے، تم اسے اپنے گھر سے نکالتی کیوں نہیں ہو۔"

وہ بھڑک گیا۔

"اسرار میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ ہماری بزرگ ہیں۔" "ایک ملازمہ تمہاری دادو کی جگہ تو لینے سے رہیں۔" اس کی بات کاٹ کر وہ تمسخرانہ لہجے میں ہنسا تو عیشہ بے بس

ہو کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

☆☆☆

دو ماہ کیسے گزرے عیشہ کو پتہ ہی نہیں چلا معاذ ارتضٰی خاصا بے سکون تھا جب ہی کانٹریکٹ کا معاہدہ منسوخ کر کے واپس چلا آیا۔ عیشہ سے اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کا بدلا ہوا انداز ہی اسے چونکا گیا تھا۔ اس پہ آپا اماں کا اعتراف جرم۔

"مجھ سے کچھ نہیں ہو سکا بیٹے! بھلے تم مجھے ملازمہ نہیں سمجھتے۔ یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے مگر پھر کوئی ایسا نہیں سوچتا۔" اور معاذ ارتضٰی کو ایسا لگا تھا جیسے کوئی بہت بڑا ناقابل تلافی نقصان ہو گیا ہو۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپا اماں۔" اس کی آواز کانپ گئی تھی۔

"میں نے تمہیں حالات سے آگاہ کر دیا تھا بیٹا! عیشہ بی بی کو بھی میں نے اسرار سے ملنے سے روکا تھا مگر انہوں نے میری بات نہیں مانی۔ الٹا اسرار بہت خفا تھا مجھ پر۔" معاذ چہرے پر تشویش کے رنگ لیے عیشہ کے پاس تصدیق کے لیے آیا۔

"جو آپا اماں کہہ رہی ہیں کس حد تک سچ ہے؟"

"وہی سچ ہے بھائی۔" اس نے پہلی بار بھائی سے کسی بات پہ نگاہ چرائی تھی۔

"میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔" اس نے خود کو کسی بڑے صدمے کے لیے تیار کیا۔

"وہ شادی کر چکے ہیں مجھ سے۔" اب کی بار عیشہ کے لہجے میں زعم تھا، مان تھا اور شاید خود سری بھی۔ اس نے اس بار نگاہ بھی نہیں چرائی۔ معاذ کو حیرت نہیں ہوئی کہ وہ جانتا تھا جو شخص اسے اتنا بڑا قدم اٹھانے پہ مجبور کر چکا تھا وہ اسے خود سر اور بولڈ بھی بنا سکتا ہے۔

"عیشہ! یہ تم نے اچھا نہیں کیا، میں نے انکار کیا تھا مگر یہ کوئی طے شدہ بات نہیں تھی۔ اگر وہ تمہیں پسند تھا تو تم مجھے بتا سکتی تھیں۔" اس کا لہجہ صدمے کی زیادتی سے چور تھا۔

"آپ پھر بھی انکار کر دیتے بھائی! میں اسرار کو کھو نہیں سکتی تھی۔"

اور معاذ کو خود کو یہ یقین دلانا پڑا کہ عیشہ بڑی ہو چکی تھی، بہت بڑی، اتنی بڑی کہ اپنے فیصلے خود کر سکنے پر قادر تھی۔

"مجھے بہر حال تمہاری خوشی عزیز ہوتی۔ تمہیں میرا اعتبار کرنا چاہیے تھے۔" "مگر

وہ ہار چکا تھا مگر آخری کوشش کے طور پر کم از کم اس کے دل سے وہ بدگمانی دور کر دینا چاہتا تھا جو اسرار شاہ اس کے دل میں معاذ کی طرف سے پیدا کر چکا تھا۔

''اٹس آل رائٹ بھائی، جو ہو چکا ہے اچھا ہی ہوا ہے۔'' اس نے جیسے معاملہ ہی نپٹا دیا تو معاذ کو لگا جیسے اس کے پاس مزید کچھ بھی کہنے کو نہ رہا ہو۔

''ٹھیک ہے پھر تم ایسا کرو، اسرار شاہ سے کہو وہ تمہیں رخصت کرانے کے بعد ولیمہ کر کے اس شادی کو اناؤنس کرے۔''

''ٹھیک ہے، میں کہہ دوں گی۔'' عیشہ نے آہستگی سے کہہ کر توجہ کتاب کی جانب مبذول کر لی۔ ایک طرف سے یہ معاذ ارتضیٰ کو سگنل دیا گیا تھا کہ اب وہ جا سکتا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اسے اپنی ٹانگیں بے جان ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ آپا اماں کی بات پر اب اسے یقین کرنا پڑا تھا کہ عیشہ اب وہ نہیں رہی وہ بہت بدل گئی ہے اور معاذ جانتا تھا اسے ان سے متنفر کرنے والا بھی اسرار شاہ تھا۔

☆☆☆

پھر عیشہ کو اسرار شاہ سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا اس سے پہلے ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے طبیعت خرابی کی جو وجہ بتائی وہ ان دونوں بہن بھائی کو ایک دوسرے سے نگاہ چرانے پہ مجبور کر گئی تھی۔ معاذ ارتضیٰ کی تشویش بڑھ گئی تھی۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اسرار شاہ سے رخصتی کی بات کرنا۔''

''میں نے ٹرائی کیا تھا مگر وہ فون ریسیو نہیں کرتے۔''

عیشہ کے جواب سے معاذ کا ماتھا ٹھنکا۔ پھر اس نے خود اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکامی ہوئی تو تھک ہار کر وہ اس سے ملنے گھر چلا آیا۔

''صاحب! آپ سے ملنا نہیں چاہتے۔'' ملازم کے پیغام نے معاذ ارتضیٰ کو حق دق کر دیا تھا۔

''تم نے میرا نام صحیح بتایا تھا، میں معاذ ہوں، معاذ ارتضیٰ۔'' اس نے بڑی دقت سے کہا۔

''صاحب! آپ کو تو ساری دنیا جانتی ہے۔ اگر آپ نہ بھی اپنا نام بتاتے تب بھی میں ہرگز غلطی نہ کرتا۔'' ملازم نے کہا تو معاذ ارتضیٰ کے اندر شدید قسم کا طیش اٹھا پھر وہ ملازم کی ہائیں ہائیں کی پرواہ کیے بغیر بپھرے ہوئے انداز میں اندر جا گھسا تھا۔

''تم...... تم یہ کیا بکواس کر رہے ہو اسرار شاہ! تم مجھ سے ملنا نہیں چاہتے؟'' اتنے دنوں کا ذہنی انتشار اور شدید قسم کی کھولن اس کے غصے کی شدت کو بڑھا گئی۔

''شٹ اپ، یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' جواباً وہ غرایا تھا۔

''تم جانتے ہو کہ تم نے کیا کیا۔ میری بہن کو میرے خلاف بھڑکا کر اس سے نکاح کر لیا۔'' غالباً اسے احساس ہو گیا تھا کہ اسے تحمل کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے تب ہی لہجہ بدل کر بولا۔ اس کی بات پہ وہ شعلہ بار نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پھنکار کر بولا تھا۔

''اتنی معصوم تھی تمہاری بہن کہ میری سازش کا شکار ہو گئی اپنی بہن کو سنبھالنا تھا۔ دوسروں پہ الزام تراشیاں کرنے پر کوئی تمہارا گریبان بھی پکڑ سکتا ہے۔''

''اسرار! یہ سب کیوں کیا تم نے؟'' وہ خون کے گھونٹ پی کر بولا تھا۔

''کیا کیا ہے میں نے۔ اب اگر تمہاری بہن نے کسی کے ساتھ......''

''بند کرو یہ بکواس......'' اس کا ضبط جواب دے گیا۔

''تم نے نکاح کیا ہے اس کے ساتھ۔ اب میں تمہیں مکرنے نہیں دوں گا۔'' ''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ میں نے نکاح کیا ہے اس سے؟ بولو؟'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ معاذ صدمے سے گنگ رہ گیا چند لمحوں بعد بوجھل قدموں سے وہ واپس جا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ بے حد اپ سیٹ تھا۔ پوری رات اس نے تڑپتے ہوئے گزاری تھی۔ دہا ایک بار پھر اسرار کے پاس گیا تھا اس مرتبہ وہ اس سے لڑنے نہیں اس کی منت کرنے گیا تھا اس نے اسے قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ مہرو کی موت میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس نے اپنے اور مہرو کے درمیان ہونے والی ایک ایک بات اسے بتا دی تھی مگر اسرار شاہ نے اس کی کسی بات پر کان نہیں دھرا۔ یقین کرتا تو پھر بہت دور کی بات تھی۔ اور عیشہ کے معاملے میں تعاون کرتا تو بالکل عبث تھا۔ ایک خوفناک قسم کا سوالیہ نشان اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ عیشہ کی پریگنینسی۔ کو وہ زیادہ عرصہ تک چھپا نہیں سکتا تھا۔

اس رات والدین کی وفات کے بعد وہ پہلی بار رویا تھا۔ اسی رات با شعور ہونے اور یہ جاننے کے باوجود کہ موت مانگنے سے اللہ ناراض ہوتا ہے، اس نے اپنے لیے موت کی دعا مانگی تھی۔ جب دو دن تک وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلا تو تیسرے دن عیشہ اس کے پاس

آ گئی تھی۔

''بھائی! میرا اسرار شاہ سے کانٹیکٹ نہیں ہو رہا۔ وہ۔۔۔۔ گھر پہ بھی نہیں ملے۔''

معاذ ارتضیٰ نے سوجی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا، زرد رنگت اور آنکھوں تلے حلقے لیے یہ وہ عیشہ تو نہیں تھی جو اس کی ذرا سی تکلیف پہ خود پہ نیندیں حرام کر لیا کرتی تھی۔ آنکھیں شدت گریہ سے سوج گئی تھیں مگر اسے یہ سب نظر نہیں آیا تھا اسے اسرار شاہ کی فکر تھی، اس کے اندر زیاں کا احساس کچھ اور بھی شدید ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ عیشہ کو اسرار شاہ کی حقیقت بتائے تو کیا وہ یقین کرے گی؟

''نہیں یقیناً نہیں۔'' اسے جھنجلاہٹ نے آن گھیرا۔ کوئی جواب دیے بغیر وہ اٹھ کر واش روم میں جا گھسا تھا۔ عیشہ کے سوالوں سے بچنے کے لیے اس کے پاس یہی ایک وقتی حل تھا۔

☆☆☆

''مجھ سے کوئی بات نہیں کرو۔'' وہ از حد تلخی سے گویا ہوا تو عیشہ کو دھکا سا لگا تھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ ٹھٹکی تھی۔ آج وہ اسے ملا تھا کتنے ہی چکر لگا لیے تھے اس نے اس کے گھر کے۔ کتنے فون کیے تھے اس نے اس کے نمبر پہ مگر سب بے کار رہا تھا اور آج جب اتنے دنوں بعد ملا تھا تو اس رو کھے بے اعتنا لہجے پر اسے بے تحاشا رونا آیا تھا۔

''تمہیں تمہارے بھائی نے کچھ نہیں بتایا؟''

عیشہ نے حیرانی سے اسے دیکھا اور جواب میں اسرار شاہ نے مہرو کی موت سے لے کر اس کے خط میں معاذ پہ لگائے گئے الزام تک ساری روداد سنا کر اپنے انتقام کا بھی اعتراف کر لیا تھا۔

''یعنی آپ میرے ساتھ دھوکا کرتے رہے؟'' وہ پل بھر میں سرد پڑ گئی تھی۔

''دھوکا کیوں، انتقام کہو۔ تمہارے بھائی نے مجھ سے میں نے تم سے۔ بے شک مجھے نکاح کرنا پڑا کہ تم اس طرح ہاتھ نہ آ گئیں۔'' وہ اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں دیکھ کر کمینگی سے ہنسا تھا۔ تب وہ بپھر گئی اس کا گریبان پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے چلانے لگی تھی۔

''تمہاری جرأت کیسے ہوئی اسرار شاہ! کہ تم مجھے دھوکہ دو۔''

اسرار شاہ نے انتہائی حقارت سے نہ صرف اپنا گریبان چھڑایا بلکہ ایک ہی جھٹکے

سے اسے دور پھینک دیا تھا۔

''یہ بچوں والے چونچلے مت کرو مجھ سے، تمہاری حیثیت میرے نزدیک کیا ہے، یہ میں تمہارے بھائی کو اچھی طرح باور کرا چکا ہوں۔ سو ناؤ گیٹ لاسٹ فرام ہیر۔''

''تم نے اچھا نہیں کیا اسرار شاہ! تمہارے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوگا۔'' وہ خاصی دیر کے بعد بولنے کے قابل ہوئی تو بھیگے لہجے میں بولی تھی۔

''کیا بگاڑ لو گی تم میرا ہاں۔'' وہ متکبرانہ انداز میں ہنسا تھا۔

''میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی مگر میرا خدا منصف ہے۔ وہ تمہارا سکون چھین لے گا۔ تمہارا سب کچھ بگاڑ دے گا۔'' اب جب اس نے اس کی بات پہ کان نہیں دھرا تھا۔ وہ پلٹ کر روتی ہوئی چلی گئی تھی، ہمیشہ کے لیے۔ اس کے بعد وہ اسے کبھی نظر نہ آئی۔ معاذ ارتضیٰ قومی کرکٹ ٹیم کا اہم رکن تھا۔ اس کی پراسرار گمشدگی ایک معمہ بن گئی۔ ایک عرصہ دو عرصہ تک اخبارات اور ٹی وی میں اس کے متعلق خبریں آتی رہیں پھر لوگ دھیرے دھیرے اس قصے کو فراموش کر گئے۔ اسرار شاہ نے اپنی پسند سے شادی کی۔ اس لڑکی سے اس کی ملاقات کسی تقریب میں ہوئی تھی۔ شوخ و شنگ اور اعتماد سے بھرپور رشنا سے اسے پہلی نگاہ میں ہی محبت ہو گئی۔ شادی کے دو سال بعد اس کے ہاں تین بچے ہو چکے تھے، پہلی بیٹی پھر دو جڑواں بیٹے۔ ان کے بچے بالترتیب چھ اور پانچ سال کے تھے جب سیر کی غرض سے مری جاتے ہوئے ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ رشنا تینوں بچوں سمیت موقع پر ہی جاں بحق ہو گئی۔ وہ شدید زخمی ہوا تھا۔ مہینوں بستر پہ پڑا سسکتا رہا اور تب اتنے عرصے میں پہلی بار اسے عیشہ یاد آئی تھی، اور اس کے ساتھ ہی اسے عیشہ کی بددعا یاد آئی تھی۔ اسی دن پہلی بار اسے معاذ ارتضیٰ کی قسموں کا یقین آیا۔ اسی روز ہی پہلی بار اس کے اندر عیشہ سے کی گئی زیادتی کا احساس جاگا تھا۔

☆☆☆

کوئی بھی دکھ دل میں بسیرا کر جائے تو پھر بے ٹھکانا ہونا نہیں چاہتا۔ بے دری کا درد شاید اسے بھی گوارا نہیں۔ اس کا دکھ بھی یونہی تو میرے دل میں نہیں آ بسا، مجھے بہت شدتوں سے احساس ہے کہ میں بہت غلط کر چکا ہوں۔ کبھی وہ وقت تھا جب دماغ پہ نفرت و انتقام کا غلبہ تھا مگر اب موسم زبردست تغیر کے بعد کچھ اور ہے۔ اب تو دل کی تمام گلیوں میں

اس کی محبت کا بسیرا ہے۔احساس ہی سب سے بڑی قوت ہے اگر نہ ہو تو کچھ نہیں اور جب ہو جائے تو کہیں پناہ بھی نہیں۔اسی انتقام کے احساس پہ زیادتی اور پھر محبت کا احساس غالب آیا تو پہلے احساس پہ برف گرتی چلی گئی احساس سکڑا اور محبت کا دائرہ پھیلتا چلا گیا۔

"اب تو بس محبت ہے اور پچھتاوا۔کاش وہ مجھے کبھی ملے تو میں اپنا گناہ معاف کروانے کے بجائے صرف اسے اتنا یقین دلا دوں کہ میں نے اس سے انتقام نہیں لیا بلکہ اس سے محبت کی تھی۔ایسی محبت جو مجھے اس سے بچھڑنے کے بعد ہوئی۔" وہ سوچ رہے تھے۔

"دعا۔دعا بیٹے۔" اسرار شاہ پکارتے ہوئے اندر آ رہے تھے۔اس نے گڑبڑا کر ہاتھ سے چھوٹ کر......گری مخملیں جلد کی ڈائری کو جھک کر اٹھایا اور عجلت بھرے انداز میں اٹھا کر الماری میں چھپا دیا، مگر اسرار شاہ اس کی اس حرکت کو دیکھ چکے تھے اور اب ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔اس کی دوسری ملاقات بھی ان سے اسی اسٹور پہ ہوئی تھی اور اسے لگا تھا جیسے وہ اسی کے منتظر ہوں۔انہوں نے اس سے ایک کپ کافی ساتھ پینے کی التجا کی تھی، جسے اس نے ذرا سے ردوکد کے بعد قبول کر لیا تھا اور تب انہوں نے اسے اپنے بارے میں بتایا تو عبید کے متعلق بتا کر کہا تھا کہ انہیں شک ہے۔وہ عبید کی بیٹی ہے۔اس لیے کہ اس کی شکل ہو بہو عبید جیسی ہے اور دعا......اس پہ تو شادی مرگ طاری ہو گئی تھی۔اپنے باپ کا تذکرہ ہمیشہ ہی اس کی ماں کے چہرے پہ اذیت کو بکھیر دیتا تھا۔وہ تو شاید ان کی اس اذیت کو سمجھ نہ سکتی اگر ماموں اسے اپنے پاس بٹھا کر پیار سے نہ سمجھاتے۔

"دعا بیٹے! کیا آپ نے میری محبتوں میں کمی محسوس کی ہے جو بابا کا پوچھتی ہو۔"

"نو ماموں! بٹ بابا تو پھر بابا ہوتے ہیں نا۔" اس نے معصومیت سے کہا تھا۔ "میری ڈاکومنٹس میں ان کا نام ہے۔وہ میرے فادر ہیں مگر ہمارے ساتھ نہیں۔مما بھی مجھے کبھی ان کے متعلق کچھ نہیں بتاتیں۔ان کے پاس تو بابا کی تصویر تک نہیں ہے۔" اس کے شکوے بجا تھے۔معاذ ارتضیٰ کچھ دیر بعد اسے سمجھانے والے انداز میں بولے تھے۔

"اس لیے بیٹا کہ آپ کی مما اور بابا کے درمیان علیحدگی ہو گئی تھی۔"

"علیحدگی، یو مین ڈائی ورس!" وہ خوف زدہ ہوئی تھی۔

"نو، ڈائی ورس تو نہیں البتہ ان کے درمیان کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی جس کی وجہ سے دونوں الگ ہو گئے۔"

"ایسی کیا غلطی ہوئی تھی ماموں کہ مما نے بابا کو چھوڑ دیا۔" وہ ٹھٹک کر بولی تھی۔

"غلطی تو ہوئی تھی مجھ سے۔تمہارے باپ سے شادی کی غلطی، وہ اس قابل نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھ رہتی۔" عبیرہ پتہ نہیں کب سے دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔اندر آ کر چلائی تو معاذ ارتضیٰ گھبرا گئے۔

ماں کو روتے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھی تھی۔

"مما......پلیز۔"

"شٹ اپ "بھائی" اسے بتائیں کہ اس کا باپ کیسا تھا۔" معاذ ارتضیٰ نے گھبرا کر اس کے لڑکھڑاتے وجود کو سہارا دیا تھا۔اسے بتا دیں بھائی کہ وہ کتنا غلط انسان تھا۔" وہ چلاتے ہوئے یکلخت گری تھی۔

"سوری مما! رئیلی ایکسٹریملی سوری، آئندہ میں کبھی آپ سے بابا کی بات نہیں کروں گی" اس کے ہوش میں آنے کے بعد دعا نے اس کے سینے پہ سر رکھ کر سسکتے ہوئے یقین دہانی کروائی تھی۔

اس کے بعد ان کے درمیان کبھی اس موضوع پہ کوئی بات نہ ہوئی مگر دعا کے اندر اس واقعہ کے بعد تجسس جاگ اٹھا تھا۔اسرار شاہ کا اسے دیکھ کر چونکنا اور اس سے اس کا، اس کے باپ اور ماں کا نام اضطراری کیفیت کے زیر اثر پوچھنا اسے بری طرح سے چونکا گیا تھا۔پہلے اس کا جی چاہا تھا وہ ماں سے تذکرہ کرے مگر پھر اسے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ان دنوں معاذ ارتضیٰ اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ دوسرے شہر گیا ہوا تھا ورنہ وہ اس سے پوچھ لیتی۔اس کا یہی تجسس اسے پھر سے اسی اسٹور تک لے گیا تھا۔وہ اس اسٹور کے مالک سے اسرار کے متعلق پوچھنا چاہتی تھی مگر وہاں اس کی ملاقات اسرار شاہ سے ہو گئی۔یقیناً وہ بھی اس کی طرح بے چین تھے اور تب کافی کے دوران اسرار شاہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔

"تمہاری مما مجھ سے خفا ہو گئی تھیں۔" اس کے اس سوال کے جواب میں کہ وہ دونوں علیحدہ کیوں ہوئے، اسرار شاہ نے مختصر سا جواب دے کر اسے مطمئن کر دیا تھا اور اب ان کے بیگ سے ان کی پرسنل ڈائری میں لکھا ان کی حیات کا ایک ایک لمحہ کھل کر اس کے سامنے آیا تو اسرار شاہ ایک بار پھر کھو دینے کے خوف میں مبتلا سکتے کے عالم میں کھڑے

تھے۔ دعا نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

"آج کٹلس آپ ہمیں بنا کر کھلائیں گی۔ پچھلی بار جو آپ نے پیزا بنایا تھا وہ اتنا بد مزا تھا کہ میں نے زندگی میں اتنا بدمزا پیزا نہیں کھایا ہوگا۔" ان کے ہاتھ سے شاپر لیتے ہوئے وہ خوش دلی سے کہتی ان کے ساتھ کچن کی سمت بڑھی تو اسرار شاہ کو اپنا رکا ہوا سانس بحال ہوتا محسوس ہوا۔

☆☆☆

"مما! کوئی آپ سے ملنے آیا ہے لیکن پرامس کریں کہ پہلے آپ ساری بات سنیں گی، پھر کوئی فیصلہ کریں گی۔" دعا نے عیدہ کے گلے میں بازو حمائل کر کے التجا آمیز لہجے میں کہا تو عیدہ نے کچھ بغیر مسکرا کر ہامی بھری۔

"او کے مگر ہے کون؟" اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔

"او کے بلاتی ہوں، آپ آنکھیں بند کریں پہلے۔" اس نے ہنس کر شرط عائد کی تھی۔ پھر اسے آنکھیں موندتے دیکھ کر چپکے سے باہر نکل گئی۔

"جائیے آپ اپنا کیس خود لڑیں۔ میں اور ماموں آپ کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔" بیک گراؤنڈ میں قدرے نروس سے نظر آتے اسرار شاہ کو دیکھ کر شرارت سے مسکاتی ہوئی، وہ معاذ ارتضیٰ کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی تو اسرار شاہ چند لمحوں کے توقف کے بعد اندر چلے گئے۔

"آپ نے اچھا نہیں کیا پاپا!" اس روز کٹلس کھانے کے بعد دعا نے بہت پُر درد لہجے میں کہا تھا اور وہ جو سمجھ رہے تھے ان کی نگاہوں نے دھوکا کھایا تھا، دعا نے ڈائری نہیں پڑھی ہوگی، ایک بار پھر ساکت رہ گئے۔ "سزا تو مما کو ملی نا اور ان کے ساتھ مجھے بھی۔ ماموں کے ساتھ بھی آپ نے زیادتی کی۔ ذرا سوچیں پاپا! اگر آپ کی دعا کے ساتھ کوئی......"

"دعا۔" وہ تڑپ ہی تو گئے تھے۔

"یہی ہوتا ہے پاپا اپنوں کا درد، چونکہ غلطی آپ کی تھی سو ایکسکیوز بھی آپ کو ہی کرنا ہے۔ پہلے ماموں سے پھر مما سے۔ ویسے ایک بات میں آپ کو بتادوں ماموں تو شاید آپ کو معاف کردیں مگر مما کا مشکل ہے۔" اس نے راستہ دکھانے کے بعد ڈرانا ضروری سمجھا تو اسرار شاہ جو اس کی بات سن کر مسکرا رہے تھے۔ بے ساختہ اسے ساتھ لگا کر ہنسے تھے۔

"ڈونٹ وری میری بچی ہے میری سفارش کرنے کے لیے۔ کرو گی نا۔" اور وہ بے ساختہ اثبات میں سر ہلا گئی تھی۔ پھر دعا کی ہی کوششوں سے ان کی معاذ ارتضیٰ سے ملاقات ہوئی تھی، اور ساتھ ہی معافی تلافی بھی۔ دعا کا اندازہ درست تھا۔

"میں نے اللہ کے لیے تمہیں معاف کیا اسرار شاہ مگر میرا دل تب ہی خوش ہوگا، جب میری بدنصیب بہن کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ لوٹے گی، وہ مجھے جتنی عزیز تھی جتنی پیاری تھی تم نے اسے اتنا ہی گہرا صدمہ پہنچایا۔

میں اسے منالوں گا۔ ڈونٹ وری۔ انہوں نے کتنے مان سے کہا تھا اور اب وہ اس کے سامنے تھے۔

"کیا ہے دعا! آخر ایسی کون سی ہستی ہے کہ جسے تم......" خاصی دیر آنکھیں بند کیے رکھنے کے باعث جھلا کر کہتے ہوئے اس نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں تو سامنے سیاہ سوٹ میں ملبوس، وہ شخص اسے اپنی بصارتوں کا دھوکا محسوس ہوا تھا۔ کوئی التوژن...... ہاں وہ التوژن ہی ہوسکتا تھا کہ اس کے انتہائی سلوک کے باوجود وہ اس کی محبت کو دل سے نکالنے میں بری طرح ناکام رہی تھی۔

"دعا..... دعا! دعا جا چکی ہے! اکیلی وہ چاہتی ہے کہ اس کے پاپا اس کی مما سے معافی مانگ کر جلدی سے صلح کر لیں۔" دو قدم آگے بڑھ کر انہوں نے مسکرا کر کہا تب عیدہ ساکت سی انہیں دیکھنے لگی۔ اس کی بصارتیں دھوکا کھا سکتی تھیں، مگر سماعتیں تو نہیں۔ تو اس کا مطلب تھا وہ سچ مچ آچکا تھا۔

"ایسے مت دیکھو عیدہ! اتنا شرمندہ ہوں کہ معافی کے الفاظ نہیں مل رہے، بس اتنا جان لو کہ تمہیں ستا کر خود بھی چین سے نہیں رہ پایا۔ تمہیں یاد ہے، تم نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کیا تھا اور اس سے بڑھ کر کون انصاف کرنے والا ہے، دیکھو، تمہیں انصاف مل گیا عیدہ! اپنے گناہ گار کو اللہ کی خاطر معاف کردو۔" دونوں ہاتھ اس کے سامنے باندھ کر وہ کسی طرح بھی آنکھوں کی نمی کو بہنے سے نہ روک پائے۔ عیدہ کے تنے ہوئے اعصاب یکلخت ڈھیلے پڑے تھے۔

"اللہ کے لیے......" اس کے لب کانپے تھے۔

"خدا کی قسم اسرار شاہ! اگر تم اللہ کا واسطہ نہ دیتے تو کبھی معاف نہ کرتی تمہیں۔

مگر اب پونچھ لو اپنے یہ آنسو۔ میں نے اللہ کے نام پہ آپ کو معاف کیا۔ اپنی وہ تذلیل بھی وہ پچھلے اٹھارہ سالوں سے بھولے لگاتی رہی ہے۔" ان کے قریب آ کر دوپٹے کے پلو سے ان کی نم آنکھوں کو پونچھتی وہ انہیں اتنی اچھی لگی کہ بے اختیار اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"تھینکس عیدہ! تم واقعی بہت اچھی ہو۔" وہ مسکرا دی تھی۔

"اٹس او کے، اب اپنے گھر چلیں! معاذ کا کیا قصور ہے کہ تم مستقل بے چارے کی شادی شدہ زندگی میں کباب میں ہڈی کا رول ادا کرتی رہیں۔" اس نے اسے چھیڑا۔

"بابا! میں اندر آ جاؤں؟" ویسے کیا صورت حال ہے، مما مانیں؟" دعا نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے وہیں سے ہانک لگائی۔

"بالکل بابا کی جان اور صورت حال تو بہت شاندار ہے۔ خود آ کے دیکھ لو۔" انہوں نے جواباً چہکتے ہوئے کہا تو دعا، معاذ اور تقی کے ساتھ ہنستی ہوئی اندر آ گئی۔

"ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ بابا ماما سے یہی کہہ رہے ہوں گے جو چچا ابرار الحق آج کل کثرت سے کہتے ہیں مثلاً۔

ساڈے نال رہو گے تے، عیش کرو گے سارا عشق اے
ہور کتے جاؤ گے تو بڑا وڈا رسک اے

عیدہ بری طرح جھینپ گئی اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اسے ابھی شکرانہ بھی تو ادا کرنا تھا کہ خدا نے اس کے دل کی التجا سن کر ناممکن کو ممکن بنا ڈالا تھا پھر شکرانہ تو فرض تھا نا اس پر!



پہلی بوند

اس نے گیت گاتے ہوئے احتیاط سے موڑ کاٹا۔ دائیں جانب گہری سرسبز کھائی تھی تو بائیں جانب اونچے پہاڑ پر سدا بہار پائنز کے سر بفلک درخت پوری شان سے ایستادہ تھے۔ پہاڑی ڈھلوان میں گھنی ہریالی تھی۔ اور ہریالی میں تا حد نگاہ پھیلے سر اٹھائے خودرو پھول یوں لگ رہے تھے جیسے آسمان کے ستارے زمین پر اتر آئے ہوں۔

قدرے فاصلے پر سر پہ خشک لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے ڈھلوان سے اترتی پہاڑی دوشیزہ اس سحر انگیز ماحول کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس کی سرخ اوڑھنی ہوا کی شوخی پہ لہرا کر دور تک اڑتی اور پھر اس کے نازک وجود سے لپٹ جاتی۔ اس نے بے ساختہ اس سحر طاری کر دینے والے منظر سے نگاہ چرائی اور اپنے برابر فرنٹ سیٹ پر موجود اپنی گریس فل مگر قدرے بے تاثر چہرے لیے بیٹھی ماں کو دیکھا۔

"ماما۔" ان کے اگنور کرنے کے باوجود وہ خود کو انہیں پکارنے سے باز نہیں رکھ پایا۔

"آں ہاں۔" وہ جیسے کسی گہری سوچ سے چونک کر متوجہ ہوئیں۔

"معزز خاتون اگر آپ بھول نہیں چکی ہوں تو آج ہی آپ ایک اہم کام کی انجام دہی کا ارادہ لے کر گھر سے نکلی تھیں اور اسی نیک کام کا براہ راست تعلق آپ کے اس لائق فائق اکلوتے سپوت سے ہے پلیز نیل می۔" اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی تو لبوں پہ دبی دبی مسکان۔ انہوں نے سپاٹ و منجمد نظروں سے اسے تکا اور نروٹھے پن سے بولی تھیں۔

''کچھ نہیں۔''

''کچھ نہیں واٹ ڈو یو مین۔'' اس کی آنکھوں میں تحیر و استعجاب سا اترا۔ منزہ بیگم نے اسے اسٹیرنگ وہیل سے مضبوطی سے ہاتھ ہٹا کر ہارن بجاتے دیکھا۔

درخت کی اوٹ سے نکل کر اچانک ہی چند چوپائے دوڑتے ہوئے جیپ کے سامنے آ گئے تھے۔ اسے بروقت نہ صرف گاڑی کی رفتار آہستہ کرنا پڑی بلکہ ہارن پہ ہارن بھی بجانا پڑا تھا تب کہیں جا کے وہ سائیڈ پہ ہوئے تھے۔

''ماما میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔'' وہ اسی الجھن میں گھرا اپنا سوال دہرا رہا تھا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ جس گھر میں اس مقصد سے آپ گئی تھیں وہاں کوئی خاتون آئی مین کوئی لڑکی تھی ہی نہیں۔'' منزہ بیگم کو اس کی جرح پہ اور موضوع کو طول دینے پہ جھنجلاہٹ کے ساتھ طیش آیا تھا۔ جبھی کچھ جتا کر بولی تھیں۔

''تھی کیوں نہیں تھی مگر مجھے پسند نہیں آئی۔'' کیپٹن عاطف نے قدرے چونک کر بہت حیرانی سے ان کے سرد اور ترش انداز کو ملاحظہ کیا۔ وہ شاکڈ ہوا تھا جبھی کچھ بول نہیں پایا۔ جب قدرے سنبھلا تب بولا تو لہجہ مودب اور دھیما تھا۔

''آپ کو یاد ہے ماما میری ایک ہی شرط تھی اس سلسلے میں اور وہ یہ تھی کہ...''

''کوئی ضرورت نہیں دہرانے کی مجھے بھولی نہیں ہے۔'' انہوں نے ہنوز اسی انداز میں کہتے ایک مدد تیز نگاہ اس پہ ڈالی اور مزید گویا ہوئیں۔

''مگر اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے عاطف کہ ہم بھی تمہاری طرح حماقت کا مظاہرہ ہی کریں وہ لڑکی مجھے پسند نہیں ہے تو بات ختم۔'' ناخوشگوار تاثرات سے مزین چہرہ خشک و سپاٹ انداز کیپٹن عاطف کو تحیر تیجی اور تاسف میں مبتلا کر گیا۔

اسے خود کو یہ یقین دلانے میں دشواری محسوس ہوئی تھی کہ یہ اس کی نرم خو محبت کرنے والی اپنائیت و اخلاق کی پیکر ماما ہی ہیں۔

''ماما جب میری کوئی ڈیمانڈ نہیں تو پھر آپ۔'' چند لمحے لب بھینچ کر خود کو کمپوز کرتے رہنے کے بعد وہ جیسے ہی بولا منزہ بیگم بگڑے ہوئے انداز میں اسے ٹوک گئی تھیں۔

''تمہاری ڈیمانڈ نہیں ہے مگر ہماری تو ہے نا کیا اب جو بھی پہلی لڑکی دیکھیں گے اسے ہی اٹھا کر تمہاری دلہن بھی بنا دیں عجیب اور فضول منطق ہے بھئی۔'' تنفر انداز میں کہہ

کر انہوں نے زور سے سر جھٹکا۔ تو کیپٹن عاطف نے ایک نظر ان کے سرخ دہکتے چہرے کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر گہرا سانس کھینچ کر رہ گیا۔

دولت، تعلیم، حسن اور فیشن یہ چار چیزیں آج کے دور میں کسی بھی رشتہ کے طے ہونے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ خاندانی نجابت، مذہب کی پیروی اور اخلاقی اقدار کی پاسداری ثانوی حیثیت اختیار کر چکی ہے لوئر مڈل کلاس سے مڈل کلاس تک کتنے ہی ایسے گھر ہوں گے جہاں رشتہ، مناسب رشتہ نہ ملنے کی بنا پر لڑکیاں والدین کی دہلیز پہ اچھے رشتوں کے انتظار میں بیٹھی عمریں گنواتی نظر آ رہی ہیں روز بروز بے دردی سے رد ہوتی لڑکیاں اپنا درد کہتے کسی سے نہ کہیں مگر گزرتے وقت کے ساتھ بجھتی آنکھیں اور شاکی لب اس طبقے اس معاشرے کی بے حسی پر نوحہ کناں ہیں۔ لڑکے والے اپنے سے نیچے دیکھنا پسند نہیں کرتے جہیز کی ڈیمانڈ۔ نتیجہ یا تو انتظار رہتا ہے یا پھر بے جوڑ شادیوں کی صورت سامنے آ رہا ہے۔

عاطف ایک سلجھا ہوا نفیس عادات اور حساس و دردمند دل رکھنے والا نوجوان تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ بہت سال قبل جب وہ ہوسٹل سے گھر آنے پہ غیر ارادی طور پہ منزہ بیگم کی وہ پرسنل ڈائری پڑھ بیٹھا تھا جس میں ان کی ذات کا تمام کرب صفحات پہ بکھرا پڑا تھا اور گویا عاطف کے لاابالی مزاج کو یکلخت حیات کے گہرے احساس سے روشناس کرا گیا تھا۔

پچھلے ہفتے جب ماما نے اپنی تنہائی کا اس سے شکوہ کرنے کے ساتھ ہی اس سے شادی کی بات کی تو اس نے ہاں کرنے کے ساتھ اپنی واحد شرط بھی بتا دی تھی۔

''ہاں بولو کیا شرط ہے۔'' وہ مسکرائی تھیں۔

''لڑکی کا خوب صورت اور پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ خاندان بھی اچھا ہو اس کے علاوہ بھی اگر کچھ خاص چاہتے ہو تو بتا دو۔'' انہوں نے محبت اور پیار سے اپنے خوبرو اور شاندار بیٹے کو دیکھا تھا۔ جس کی سنجیدگی و متانت اس پل بہت انوکھی اور متاثر کن تھی۔

''ان میں سے کوئی بھی شرط نہیں ہے ماما بس میں چاہتا ہوں لڑکی جیسی بھی ہو مجھے کسی قسم کا اعتراض نہیں، شرط صرف یہ ہے کہ آپ میرے لیے پہلی بار جہاں بھی رشتہ دیکھنے جائیں وہیں پیغام بھی دے دیں اپنی وجہ سے میں کسی لڑکی کو رد نہیں کرنا چاہتا۔''

''پلیز ماما اس بات کا ضرور خیال رکھیے۔'' وہ ان کی جھنجلاہٹ اور خفگی کو محسوس

کرنے کے باوجود اسی سکون سے بظاہر بہت لجاجت سے بولا تھا۔ اور اب ماما اس کی توقع کے عین مطابق لڑکی کو ناپسند بلکہ رد کر چکی تھیں۔

اس نے ونڈ اسکرین سے نگاہ ہٹا کر ان کے تنے چہرے کو تکا جہاں کوئی گنجائش نہ پا کر وہ بددل سا ہوا تھا کہ پھر چھانے لگی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کے شیشے چڑھا دیے نگاہ بھر کے آسمان کو دیکھا۔ سیاہ بادل منڈلاتے پھر رہے تھے ان سے پچا بچا تا ہیرے کی مانند دمکتا چمکتا تھا سا اکلوتا نوخیز ستارہ جھلمل جھلمل کرنے لگا تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

شام کے سائے گہرے ہونا شروع ہو چکے تھے۔

"ویسے ماما وہ دیکھنے میں کیسی تھی۔" اندرونی بے چینی کو دبا کر اس نے ان کے چہرے کی رکھائی و سرد مہری کو محسوس کرنے کے باوجود سلسلہ کلام جوڑا اور وہیں سے جوڑا جہاں سے انہیں ناگوار محسوس ہو سکتا تھا۔ انہوں نے گردن موڑ کر تیکھی نگاہ میں دھمکی سمو کر اسے دیکھا تو جواب میں وہ اثر لیے بغیر کھلکھلا کر ہنسا تھا اور لاڈ بھرے انداز میں اپنے توانا آہنی بازو ان کے شانے پر پھیلا دیے۔

"کم آن ماما اتنا تو بتا دینے میں کیا حرج ہے؟"

"مگر تم سے مطلب، کیوں اتنا الو ہو رہے ہو خوامخواہ۔"

انہوں نے غیض بھرے انداز میں کہہ کر زور سے اس کا بازو جھٹکا پھر اس کے پھولے ہوئے منہ کو دیکھ کر بے بس سی ہو گئیں گہرا سانس کھینچ کر بولی تھیں۔

"ضدی تو تم کبھی نہ تھے۔"

"ضدی نہیں مستقل مزاج تو ضرور ہوں۔" اس جانب حد درجہ اطمینان کی کیفیت تھی۔ جس نے ان کی جھنجھلاہٹ اور خفگی کو بڑھا دیا تھا۔

وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اسے خفا کرنا کتنا دشوار اور تکلیف دہ تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی وہ بھی جانتا تھا جبھی کچھ کچھ ضدی ہو رہا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اسے ماں کو منانے کے ہزار طریقے ازبر تھے۔

"بس عام سی تھی وہ۔ درمیانہ سا قد دھان پان سا وجود، گندمی رنگت، بال البتہ لمبے تھے۔ تعلیم بھی اتنی زیادہ نہیں محض ایف اے اور آج کے دور میں اس کی کیا اہمیت جبکہ

میرا بیٹا کتنا قابل ہے۔" نخوت سے بتاتے انہوں نے آخر میں کچھ متکبرانہ سے انداز میں ناک چڑھائی۔

"ہوں۔" وہ انگشت شہادت لبوں پہ رکھ کے کھل کر مسکرایا اور ان کی آنکھوں میں جھانکا۔

"چلے گی ماما۔"

"چلے گی۔" وہ بے اختیار چلائیں اور بل کھا کر تلملاتے ہوئے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

"یس ماما چلے گی بلکہ دوڑے گی سو پلیز۔" اس کی آنکھیں شرارتی انداز میں مسکائیں تو انہوں نے بھرپور خفگی کا تاثر دیتے رخ پھیر لیا تھا۔

☆☆☆

اسے رد ہونے سے جتنا ڈر لگا کرتا تھا اسی قدر رجکشن۔۔۔ تقدیر نے اس کے نصیب میں لکھ دی تھی۔ یہ اس کا نصیب تھا یا پھر تقدیر کا کوئی چکر جو بھی تھا بہرحال وہ بہت ہرٹ ہو چکی تھی وہ بہت چھوٹی عمر سے آزمائشوں میں گھر گئی تھی ماں باپ کے درمیان چپقلش رہتی اور پھر ایک دن دونوں نے سمجھا کر اکٹھے نہیں چل سکتے تو راہیں علیحدہ کر لیں۔

وہ اکلوتی تھی۔ اس کے باوجود دونوں کے گھروں میں اس کے لیے جگہ نہیں تھی باپ نے دوسری شادی رچا کر اپنی دنیا بسائی تھی تو ماں نے اپنی، اور یہ دنیا اتنی مکمل تھی کہ اس کے لیے گنجائش ہی نہیں نکل سکی۔ کبھی ادھر کبھی ادھر رہتے وہ بچپن چھوڑ کر جوانی کے دور میں داخل ہو گئی۔

اسے بچپن سے ہی پینٹنگ کا شوق تھا، ڈرائنگ اتنی اچھی بناتی کہ پہلے اسکول کی ٹیچرز بھی اور اسٹوڈنٹس سے ہمہ وقت نالاں رہنے والی ٹیچرز بھی اس کی ڈرائنگ اور خطاطی کی تعریف کیے بنا نہ رہ پاتیں، اسی تعریف نے جذبے اور شوق کو تقویت دی اور وہ لگن سے کام کرنے لگی۔ بڑی ہوئی تو اس کے پاس پنسل اسکیچ اور خطاطی کے لاتعداد نمونے جمع ہو چکے تھے، جنہیں خیر خواہ کے مشورے پر اس نے نمائش کے لیے رکھوایا، نمائش میں اس کی خطاطی کو وہ اہمیت اور پذیرائی نہ مل سکی جس کی اسے توقع تھی۔

یہ پہلی کے بعد دوسری اور تیسری رجکشن تھی اس روز دل کی دھرتی پہ سیاہ گھمبیری

گھٹائیں اتریں اور دھرتی جل تھل ہوگئی، کچھ آنسو دل پہ گرتے ہیں اور سوراخ کر دیتے ہیں، اس نے وہ تمام اثاثے اٹھا کر بکس میں رکھے اور تالا ڈال دیا کبھی نہ کھولنے کے لیے، وہ بزدل تھی نہ کم ہمت ہاں البتہ رد ہونے کی اذیت سہنے کی تاب نہیں رکھتی تھی مگر جب رد ہونا لکھا جا چکا ہو پھر کوئی کیا کرے۔ وہ بڑی ہو چکی تھی۔ باپ غافل تھا اور ماں، وہ جلد اس سے جان چھڑا لینا چاہتی تھی۔ ہر تیسرے دن لوگ اُسے دیکھنے آتے اور اس کی ذات میں ہزار خامیاں نکال کر رد کر کے چلتے بنتے بربادہ دل پہ آنسو گرتے اور سوراخ کرتے جاتے۔

انہی تکلیف دہ لمحات کی اذیت کو سہتے اس کے زرخیز دماغ نے ایک اور کرشمہ دکھایا زندگی کے جبر اور تلخیوں کو صفحہ قرطاس پہ بکھیرا تو کتنی ہی نظمیں نظم بن گئیں، ایک روز اس کی دوست نے پڑھا اور ہمت افزائی کے ساتھ اسے شائع کروانے کا مشورہ بھی دے ڈالا وہ بھی جانے کس دھن میں تھی کہ نظم لکھ کر معروف میگزین کے پتے پہ ارسال کر دی مگر نتیجہ پھر وہی رنجگئی، اس نے دل برداشتہ ہوتے ہوئے قلم سے ناتا توڑ ڈالا۔

''ایسا کیوں کیا تم نے۔'' کنول کو پتا چلا تو حیرت سے چلائی۔

''مجھے بالآخر یہی کرنا تھا جلد یا بدیر۔'' اس نے جلتے ہوئے کاغذات کے پلندے پہ نظریں گاڑیں ٹوٹتے بکھرتے اعصاب جیسے اس پل تناؤ کا شکار تھے اور پھر ایک دن ایک لمبی سی گاڑی ان کے دروازے پہ آ کر رکی، ماں اسے بتا چکی تھی آج اسے دیکھنے کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ بے دلی سے سہی وہ اپنی نمائش کے لیے تیار تھی، وہ خواتین پڑھی لکھی سوبر اور بااخلاق دو ہی مرد جو خوشحال اور مہذب نظر آتے تھے۔ بہت اچھے انداز میں اس سے ملے اس کے دل کی ڈھارس سی بندھی تھی ان لوگوں کے اخلاق سے اپنائیت اور خوشگوار تاثرات سے۔

''چلو اچھا ہوا اگر یہاں ہی بات طے ہو جائے۔ جان تو چھوٹے گی اس روز روز کے عذاب سے۔'' اس نے مطمئن ہو کر سوچا تھا۔ ورنہ اس سے قبل تو آنے والے محض اس کے سلام کا جواب دیتے تھے نہ ہی کبھی اسے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرتے بات کرنا تو بہت دور کی بات تھی بہت ہی اسٹینڈرڈ رویہ ہوا کرتا تھا مگر یہ بہت بردبار اور مہذب فیملی تھی۔

اس کے دل نے پوری شدتوں سے وہیں اپنا نصیب جڑنے کی دعا مانگی۔ مگر تیسرے دن اس کی ماں نے ان لوگوں کیا انکار کو اس تک پہنچا کر اسے سن کر دیا تھا۔

کچھ انجانے سہانے سپنے جو ڈرتے ڈرتے اس کی آنکھوں نے سجائے تھے مگر سجا تو لیے تھے۔ ان لوگوں کے ہی خوش فہمی دلانے پہ وہ کرچیوں کی صورت میں اس کی آنکھوں کو زخمی کر گئے تھے وہ پھر رد ہو چکی تھی دل برداشتگی کا کیا عالم تھا یہ صرف اس کا اللہ جانتا تھا۔

اپنے ہر شوق کو صرف بار بار کے رد ہونے کی اذیت سے بچنے کی خاطر ترک کر دینے والی اس رنجگئی سے اپنا دامن کسی طرح بچائے کاش کوئی تو ایسا بھی ہوتا جو پہلی بار ہی آتا اور اسے قبول کر لیتا اس کے دل نے کتنی بے بسی سے یہ چاہا تھا اور اس کی یہ ہی خواہش برسوں بعد اس کے بیٹے نے پڑھی تھی اور دل کے سب سے اہم حصے میں سنبھال کر رکھ لی تھی۔

☆☆☆

گاڑی کو زور دار جھٹکا لگا تھا۔ اس کی نوک مژگاں پہ ٹھہرا جگنو ڈھلک کر گال سے ہوتا ہوا گریبان میں گم ہو گیا۔ نگاہ غیر ارادی طور پہ آسمان کی سمت اٹھ گئی سیاہ گھٹائیں تیزی سے بڑھی تھیں اور ننھے چمکتے ستارے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور نم آلود خنک جھونکے نے ونڈ اسکرین کو چھوا اور شیشہ دھندلا کر رہ گیا، انہوں نے ایک جتاتی نگاہ بیٹے پر ڈالی، جو ہاتھ بڑھا کر وائپر چلا چکا تھا ''باہر دھند ہر لمحہ بڑھ رہی تھی'' چکر دار سڑک کی گولائی کاٹتے ہی آبادی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

انہوں نے گہرا سانس کھینچ کر بیٹے کو دیکھا۔ وہ لب بھینچے خاموش تھا، اور بھرپور سنجیدگی سے ڈرائیونگ میں مگن۔ فل آرمی یونیفارم میں اس کے کاندھے پہ لگے ستارے اس کے یونیفارم کی شان کو بڑھا رہے تھے۔

وہ عام طور پہ جتنا اسمارٹ اور گڈ لکنگ نظر آیا کرتا اس یونیفارم میں اس کی یہ اسمارٹنس اور خوب صورتی مزید دو چند ہو جایا کرتی۔ وہ فرمانبردار سعادت مند بچہ رہا تھا مگر اس مقام پہ آ کر وہ جانے کیوں اڑ گیا تھا انہوں نے کھڑکی کے دھندلے شیشے کے پار دیکھا، پہاڑی ڈھلان پہ واقع اونچے اونچے گھروں میں جھلملاتی روشنیاں دور سے کسی جگنو کی مانند دکھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''پہاڑی علاقوں میں اندھیرا بھی تو جلدی چھا جاتا ہے نا۔'' انہوں نے سوچا۔

''پیاری ماما جانی'' آپ کو منانے کے لیے مجھے کون سی زبان میں بات کرنا

چاہیے۔" نظریں ونڈ اسکرین پہ ہی مرکوز رکھے وہ بھاری آواز میں بولا تھا۔

"پیار کی زبان میں۔" انہوں نے جواب میں بھرپور سنجیدگی مگر شرارت سے کہا تھا، تو اسے جھٹکا لگا تھا۔

"واٹ۔" اس نے گاڑی ایک جھٹکے سے روکی اور حیرت و غیر یقینی سے پھیلی نگاہوں سے انہیں تکا، ان کے چہرے پہ ایک شوخی ایک اپنائیت بھری شرارت تھی کھلا کھلا روشن چہرا ان کی خوب صورتی کو بڑھا رہا تھا۔

ماما" ماما جانی۔" وہ بے اختیار ان سے لپٹا تھا۔ اور دونوں بازو ان کے گلے میں حائل کر دیے۔

"آپ تب سے میرے ساتھ مذاق کر رہی تھیں۔" وہ بسورا تھا بالکل بچوں کی طرح۔

"کیوں بھئی کیا اب میں اتنا مذاق بھی نہیں کر سکتی۔" ان کی آنکھوں میں ماتا کی چمک تھی اور اس کے ساتھ خفیف سی شرارت بھی وہ جھینپ سا گیا۔

"وائے ناٹ میم" سارے رائٹس آپ کے لیے الاٹ ہیں۔" وہ کورنش بجالایا۔

"نہیں سارے نہیں صرف میرے حقوق میرے نام رکھو باقی اپنی بیوی کے لیے سنبھال رکھو۔" ان کی لطیف سی لفظی چھیڑ چھاڑ پہ وہ ایک بار پھر جھینپا اور خجالت سے سرخ ہوتا ہنسا تھا۔

"چلو اب دیر ہو رہی ہے۔" انہوں نے کہتے اسے خود سے الگ کیا تب وہ سیدھا ہوتا ہوا ڈرائیونگ کی سمت متوجہ ہو گیا۔

موسم خراب ہے" لگتا ہے بارش ہوگی۔" عاطف آسمان کو بادلوں سے بھرتا دیکھ کر تشویش سے کہتا اسپیڈ بڑھانے لگا۔

"ہاں بارش تو ہوگی اور تسلسل سے ہوگی کیونکہ پیاس دھرتی پر برسنے میں جھجک تو پہلی بوند کو ہی ہوتی ہے اس خیال کے سنگ کہ محض اس کے حقیر بے مایا وجود سے اتنی بڑی زمین کیونکر سیراب ہو سکے گی مگر ایک بوند اگر اپنی جھجک کو ختم کرتے ہوئے ابتدا کرے تو پھر باقی کی بوندیں اس کی دیکھا دیکھی وہی عمل کریں گی اور یہ عمل بارش کا روپ دھارے گا، یہ فیصلہ مشکل سہی مگر ناممکن ہرگز نہیں۔۔۔

جبھی تو اپنی پچیس سالہ اذیت کو فراموش کرنے کی بجائے آج میں اس روایت

کے خلاف علم اٹھا رہی ہوں، بغاوت کر رہی ہوں، معاشرے میں ناسور کی طرح پھیلی اس فرسودہ روایت کا، میں اگر کسی ایک لڑکی کو حزہ بننے سے بچاؤں گی تو شاید نہیں یقیناً یہ سلسلہ چل نکلے گا۔ یہ رسم آگے بڑھے گی، آج میں کل میری بہو اس سوچ کو اپنائے گی اور یوں چراغ سے چراغ جلے گا ہم خوامخواہ یہ سمجھتے ہیں، کہ فیصلے کی ڈور ہمارے ہاتھ ہے، فیصلے کرنے والا تو اوپر بیٹھا ہے اور فیصلے تو کیے جا چکے، ہاں البتہ ہمارا عمل ہماری پہچان کراتا ہے اچھائی اور برائی کی پہچان۔"



اک شخص دلربا سا

مما اور بابا نے عمرے پہ جانے کا ارادہ کیا تو اس کے تنہا رہ جانے کا خیال الجھن و پریشانی میں مبتلا کر گیا۔

''اے لو بھلا کیا اس کی پھپھو مر گئی جو آپ پریشان ہو رہی ہیں۔'' پھپھو جانی، بھائی اور بھاوج سے ملنے آئی تھیں ان کی الجھن کا سراپا کر بھرپور خفگی سے گویا ہوئیں تو مما جو خود سے کہتے جھجک رہی تھیں بے اختیار مطمئن سے انداز میں مسکرائیں یوں ان لوگوں کے روانہ ہوتے ہی وہ بھی پھوپھو کے ساتھ ساہیوال آ گئی۔

جاتی گرمیوں کی وہ خوش گوار سی سہ پہر تھی نیلے آسمان پر تیرتے بادلوں کے سفید ٹکڑے روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھر رہے تھے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے کالونی کے گھروں کی بیرونی دیواروں پہ پھیلی بیلوں کی ٹہنیاں جھومتے ہوئے پھول برسا رہی تھیں اس کی سوچ سے بھی بڑھ کر شاندار استقبال کیا تھا۔

کبھی بچپن میں آئی تھی وہ ساہیوال، اسے تو ٹھیک سے یاد بھی نہیں تھا اب اپنے اتنے سارے کزنز کی کمپنی میں وقت گزارنے کے خیال سے ہی اسے خوشی کی کیفیت نے اپنے حصار میں جکڑ لیا تھا پھوپھو جانی کے تین بیٹے تھے، حسان، اذلان اور ریحان جبکہ چھوٹی بیٹی صبا اس کی ہم عمر تھی سب نے بے تکلفی کے ریکارڈ قائم کرتے ہوئے منٹوں میں اس سے دوستی گانٹھ لی تھی۔

''اوکے مام اب چلتا ہوں ڈیڈ ویٹ کر رہے ہوں گے۔''

حسان چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پہ رکھتا اٹھ کھڑا ہوا وہی انہیں اسٹیشن سے یہاں لایا تھا یقیناً آفس چھوڑ کر آیا ہوگا بلیک ٹو پیس میں لیے دیے انداز سمیت وہ اچھا خاصا بردبار سا شخص آئمہ کو جانے کیوں بہت اچھا لگا تھا۔

''اوکے کزن اب شام میں ملاقات ہوگی یقیناً تب آپ فریش ملیں گی۔''

رکھی سے انداز میں مسکرا کر کہتا وہ پلٹ کر چلا گیا آئمہ یونہی مسکراتے ہوئے صبا کی سمت متوجہ ہو گئی تھی جو اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

تب سے جو وہ سوئی تو پھر شام کی بجائے رات کی خبر لائی وہ بھی اس طرح کہ صبا نے کئی بار آ کر جگایا تھا اور اب تو کھانا لگنے کی اطلاع کے ساتھ آئی تھی کہ ٹیبل پہ ڈیڈ سمیت سب اسی کے منتظر ہیں۔ تب وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنے پہ مجبور ہوئی تھی وال کلاک کی سوئیوں کو دس کے ہندسے کو عبور کرتے دیکھ کر اسے خفیف سی خجالت نے آن لیا۔

''سب کیا سوچ رہے ہوں گے میرے بارے میں۔''

منہ پہ پانی کے چھپاکے مارتی دوپٹہ درست کرتے ہوئے وہ ڈائننگ روم کی سمت آتے یہی سوچ رہی تھی، وہ بھلے لوگ بے چارے اس کے انتظار میں کھانا ٹھنڈا کر رہے تھے، پھر بھلا اس حرکت سے مما کی تربیت پہ حرف نہ آتا۔

''آئی ایم ساری فار ویٹ انکل جی، تھکن کی وجہ سے مجھے بہت گہری نیند آ گئی۔''

خجالت سے کتنی وہ رواداری نبھا رہی تھی جب پھپھو نے اسے اس خفت سے نکالنے کو ہی نرمی سے ٹوک دیا تھا۔

''اوہ کم آن ڈارلنگ اٹس آل رائٹ چلتا ہے اس طرح، تم بتاؤ نیند تو اچھی آئی نا۔'' پھوپھا جان کو سلام کرنے کے بعد وہ کرسی گھسیٹ کر صبا کے مقابل بیٹھ رہی تھی جب پھپھو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر لگاوٹ کا مظاہرہ کرتے اسے اپنے مقابل بٹھا لیا، اس طرح کہ اب اس کے دائیں سائیڈ پہ حسان کی کرسی تھی وہ فطری طور پہ کچھ جھجک سی گئی سمٹ کر بیٹھتے وہ اپنا دھیان پھپھو کی باتوں پہ لگا رہی تھی پھپھو کے ساتھ ان کی چاروں اولادوں نے جس خصوصی پروٹوکول سے اسے نوازا تھا وہ اسے بہت خفت زدہ کرنے لگا تھا۔

''اوہ پلیز حسان بھائی میں اتنی بچی نہیں ہوں۔''

حسان کی بڑھائی کوفتوں کی ڈش سائیڈ پہ رکھتے ہوئے ہچکے سے ہنس کر اس نے نرمی و انکساری سے ٹوکا۔

"واقعی تم بھی اتنی اسمارٹ ہو۔"

صبا نے بہت بے باکانہ انداز میں منہ پھاڑ کر جس طرح سب کے سامنے کہا تھا وہ یکلخت سرخ پڑی تھی اس کھلی ہوئی تعریف پہ وہ بھی اتنے سارے مردوں کے سامنے، پانی کا گلاس لبوں سے لگاتے وہ جز بز سی ہو کر رہ گئی۔

"یہ کباب تو لو نا آئمہ جانو پتا ہے ہمارا بٹلر بہت اچھا کھانا پکاتا ہے۔"

پھپھو نے صرف کہا نہیں تھا کباب اٹھا کر اس کی پلیٹ میں رکھ دیا حسان کا سیل فون بجا تو ایکسکیوز کرتا اٹھ کر چلا گیا آئمہ کا چمچ کی سمت بڑھتا ہوا ہاتھ زور کے چھناکے اور دلخراش چیخ کی آواز پہ اسی زاویے پہ ساکن ہوا تھا اس کی سوالیہ نگاہیں اہل خانہ کی سمت اٹھیں۔

"یہ یہ کیسی آواز تھی پھپھو؟" وہ ڈر نہیں پائی تھی تب ہی کچھ گھبراہٹ میں گویا ہوئی.....ان کے چہرے پہ موجود خفگی کسی قدر مزید بڑھی تھی ذرا سا غور کرنے پہ اسے تمام لوگوں کے چہروں پر تشویش و پریشانی کے بجائے برہمی کے آثار جھلکتے محسوس ہوئے تو یہ گھبراہٹ یکلخت ہی حیرانی میں ڈھل گئی۔

"واٹ نان سنس کوئی منع کیوں نہیں کرتا کیا سب بہرے ہو گئے ہیں یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔"

اس کا سوال اگنور کر کے پھپھو ایک دم سے چلائیں کہ ذرا سے توقف کے بعد یہ شور اور چیخ و پکار کا سلسلہ پھر سے شروع ہو چکا تھا فلان اور ریحان جواب تک کسی حد تک لاپرواہی و بے نیازی دکھانے میں مصروف تھے کاندھے اچکا کر پھر سے مصروف نظر آنے لگے۔

"یوں پریشان نہ ہوا کریں مام یہ کوئی آج کی بات تو نہیں، کام ڈاؤن کھانا کھائیں پلیز۔" صبا نے دنیا بھر کی رکھائی سے کہتے ہوئے کانٹے اور چھری کی مدد سے لیگ پیس اٹھایا انداز میں زمانے بھر کا زہر اور نفرت نمایاں تھی۔ پھوپھا جان لب بھینچے بالکل خاموش بیٹھے تھے جبکہ وہ حیران پریشان سی بیٹھی اسی عجیب صورت حال کو سمجھنے کی سعی میں مصروف بس ٹکر ٹکر ان کی صورتیں دیکھ رہی تھی۔

"ممی پلیز اور کتنا صبر کا امتحان لیں گے روکیں جا کے یہ ڈرامے بازی اونہہ ادھر ہی کان لگے رہتے ہیں کہ کوئی آیا ہے بس ماں بیٹے کا ناٹک شروع ہو جاتا ہے۔"

پھپھو کے غصیلے اثرات سے سجے چہرے پہ تنفر و حقارت کے ساتھ رعونت و درشتگی بھی سمٹ آئی۔

"مجھ سے یہ فرمائش کرنے کی کیا ضرورت ہے وہ ہے نا تمہارا چہیتا صفت سپوت از خود پہنچ گیا ہوگا وہاں اسے تو موقع چاہیے ہوتا ہے۔"

"پھوپھا جان نے بے تحاشا سرخ ہو کر خون چھلکاتی آنکھوں سے پھپھو کو سخت — نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور کرسی دھکیل کر دروازے کو ٹھوکر رسید کرتے نکل گئے وہ دم بخود سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

"اونہہ۔" پھپھو نے نہایت غصے سے سر جھٹکا اور اسے دیکھ کر زبردستی مسکرائیں۔

"تم یہ چکھا لو نا آئمہ۔" انہوں نے فروٹ ٹرائفل کا باؤل اس کی سمت بڑھاتے یوں بات کی تھی جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو وہ گہرا سانس کھینچتی خود کو کمپوز کرنے لگی البتہ ذہن میں جیسے جوار بھاٹے اٹھنے لگے تھے۔

☆☆☆

یہ واقعہ اس کے ذہن پہ بہت اثر انداز ہوا تھا پھپھو کی خفگی و نفرت پھوپھا جان کا اشتعال بھرا طنز اور بچوں کی لاتعلقی و بے حسی نے اسے صرف حیران ہی نہیں کچھ حد تک ڈسٹرب بھی کر ڈالا تھا کون تھے وہ ماں بیٹا ملازم، نہیں یقیناً ملازموں کو ایسی ہمت و جرأت نہیں ہو سکتی تھی پھر......

"ارے کہیں پھوپھا جان نے دوسری شادی تو......مگر نہیں۔"

اس کی سوچ کو بریک لگا گر ایسا کچھ ماضی بعید میں ہو چکا ہوتا تو یقیناً اس کے پیرنٹس بے خبر نہ ہوتے وہ جتنا سوچتی رہی تھی اس قدر الجھ گئی تھی وہ پر اسرار ماں بیٹا اس کے ذہن سے چپک گئے تھے اسی بے چینی میں اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

"او کے میں کل صبا سے پوچھ لوں گی۔" کروٹ بدلتے ہوئے اس نے خود کو ریلیکس کرنا چاہا یہ نہیں تھا کہ وہ ٹوہ لینے والی کھوجی مزاج کی مالک تھی البتہ ان لوگوں کے اس قدر عجیب و غریب رویے نے اسے کھٹکنے پر مجبور کر دیا تھا وہی ماں بیٹے جو اس کے آگے

بچے جا رہے تھے کسی اور کے ذکر..... پہ تاثرات میں یوں یک بیک تبدیلی کی وجہ کیا ہو سکتی تھی چونکہ وہ خود بہت حساس تھی تبھی اس دو ٹکے..... طرزِ عمل پہ ششدر تھی۔

صبح ایک بار پھر اس کی آنکھ بہت دیر سے کھلی ورات کی طرح ناشتے کی ٹیبل پہ وہ سب اس کے منتظر نہیں تھے وہ کسی قدر خفیف سی ملازمہ کی معیت میں ڈائننگ روم میں آئی تو پھپھو کو گلاسز لگائے نیوز پیپر میں مصروف پایا ہاتھ میں موجود چائے کا کپ ان کے بھی ناشتا کر چکنے کا اعلان کر رہا تھا۔

"آئی ایم ساری میں پھر لیٹ ہو گئی۔" کھسیاہٹ زدہ سے انداز میں کہتے اس نے کرسی کھینچی تھی۔

"اٹس آل رائٹ جانو، ذرا ذرا سی باتوں پہ یوں گھبرا کیوں جاتی ہو، تمہارا اپنا گھر ہے۔" انہوں نے اخبار سائیڈ پہ رکھ کر خوش دلی سے مسکرا کر کہا پھر پکار کر ملازمہ کو اس کے لیے تازہ ناشتا لانے کو کہا تھا۔

"سب لوگ کہاں ہیں۔" اس نے یونہی برمحل تذکرہ پوچھا۔

"اولادان، ریحان تو یونیورسٹی چلے گئے ہیں صبا البتہ آج کالج نہیں گئی تمہاری وجہ سے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کی فرینڈ کا فون آیا تھا ارجنٹ کام تھا بس بہت شرمندہ تھی کہہ رہی تھی تم سے ایکسکیوز کر لوں وہ جلد آ جائے گی۔" انہوں نے کچھ اسی انداز میں کہا کہ آئمہ اچھی خاصی شرمندہ ہو گئی۔

"حسان تمہارے انکل کے ساتھ آفس چلا گیا ہے تمہارا پوچھ رہا تھا بہت مخلص ہے میرا بیٹا، ڈونٹ وری آج جلدی آنے کا کہہ رہا تھا تم تیار رہنا آؤٹنگ کے لیے۔" وہ بولنے پہ آئیں تو نان اسٹاپ بولتی چلی گئیں آئمہ خفیف سی بیٹھی تھی، جس قدر محبت اور پیار سے انہوں نے ناشتا کروایا تھا بہت کم کھا کر ہی اس کا جی اوب سا گیا جانے کیوں یہ سب اسے اوپری سا لگ رہا تھا پھپھو کے اصرار کے باوجود وہ ٹیبل سے اٹھ آئی تھی۔

☆☆☆

بوریت سے اکتا کر وہ اپنے کمرے سے نکل آئی تھی رات وہ سیل فون کی بیٹری چارج کرنا بھول گئی تھی اور اب لائٹ غائب تھی ایک تو گرمی اس پہ عین دوپہر کا وقت ایسے وقت میں کسی کی گھر میں موجودگی کی توقع ہی عبث تھی تنہائی کا احساس اسے سخت بے زار کر

چکا تھا سٹائی وی لاؤنج سے گزرتے ہوئے وہ بے اختیار رکی، حسان اندر نا صرف موجود تھا بلکہ اس کی طرف متوجہ بھی، نگاہ ملنے پہ بے اختیار مسکرایا۔

"کیسی ہو آئمہ آؤ بیٹھو۔" اپنائیت بھرا نرم لہجہ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی قدم بڑھانے پڑے البتہ اس وقت اسے گھر پہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی یہ اس کے ورکنگ آورز تھے۔

"آپ اس وقت کیسے نظر آ رہے ہیں آفس نہیں گئے۔"

قدم بڑھا کر سائیڈ کے صوفے پہ ٹکتے ہوئے اس نے سرسری سے انداز میں استفسار کیا تھا۔

"بس یونہی کچھ طبیعت اچھی نہیں تھی سو گھر آ گیا، آپ سنائیں کیسا لگا ہمارا گھر اور یہاں رہنا، بوریت تو نہیں ہوتی۔" وہ اب پورے کا پورا اس کی سمت متوجہ تھا۔

"آں، بوریت تو ہوتی ہے آف کورس ایک دم سے فارغ ہو گئی ہوں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھنا مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔"

"اوہ او....." حسان نے ہونٹ سکوڑ کر ہمدردی ظاہر کی۔

"ایسا کریں ماموں کو فون کر لیں۔ آئی ایم شیور کہ موڈ بہتر ہو گا۔"

اس کے پاس حل موجود تھا مگر اس نے سننے کے ساتھ ہی منہ بسور لیا۔

"میرے سیل کی بیٹری ڈاؤن ہے اور اس وقت لائٹ بھی نہیں ہے۔"

"افوہ گھر کے فون سے کر لو۔"

"اس میں بھی کوئی مسئلہ ہے شاید ڈیڈ ہو گیا ہے۔"

آئمہ کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھری۔

"نو پرابلم میرے سیل فون سے کر لیں۔" حسان نے کمال فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوٹ کی جیب سے سیل فون نکال کر اس کی سمت بڑھایا تو آئمہ جو قدرے حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی جھجک کر سیل تھامنے میں تذبذب کا شکار نظر آئی۔

"ارے نہیں بھائی پلیز رہنے دیں، مما بابا سے کال کرنے میں آپ کا اچھا خاصا کریڈٹ ختم ہو جائے گا۔" شائستگی سے کہتے ہوئے اس نے انکار کیا تھا۔

"اوہ کم آن ڈونٹ یو وری بائی گرل سارا بھی جاتا ہے تو نو مینشن۔" مبہم سا مسکرا کر کہتے حسان نے اپنا قیمتی سیل زبردستی اس کے ہاتھ میں دیا تب تعلق ایک لمحے کو اس کا نرم

و نازک گداز ہاتھ اس کے پرحدت مضبوط ہاتھ سے ٹچ ہوا تھا آئمہ نے بے اختیار ہاتھ کھینچ لیا حسان نے اس کے اس وجہ گریز اور ناگوار تاثر کو بہت حیرانی سے تکا تھا، اس کے صبیح چہرے پہ جو خفت زدہ سی سرخی دوڑی تھی، اس نے حسان کی اٹھی ہوئی نگاہ کو ٹھہرنے اور وہیں ٹھٹک جانے پہ اکسایا تھا۔

"آپ تو اچھے خاصے کئی ہیں بھائی مجھے نہیں پتا تھا"، اس کی گہری نگاہوں کے ارتکاز کو محسوس کرتی وہ گھبرا کر دھیان بٹانے کو بولی، حسان نے محسوس کیا تھا اور گہرا سانس کھینچ کر آہستگی سے نگاہ کا زاویہ بدل ڈالا۔

"اپنوں کے لیے سخاوت کا نہیں محبت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔"

اگر وہ نرمی سے سرسری انداز میں یہ بات کہتا تو آئمہ کبھی نہ چونکتی اس کے لہجے کی جو معنی خیزی تھی اس نے آئمہ کو ٹھٹکنے پہ مجبور کیا تھا اس کی مسکراہٹ یکلخت اس کے لبوں سے غائب ہوئی تھی اور گھمبیر سنجیدگی نے چہرے کا احاطہ کیا۔

"سب مجھے حسان کہتے ہیں اور تخاطب کا یہی انداز مجھے اچھا لگتا ہے، اچھی خوب صورت لڑکیوں کے منہ سے لفظ بھائی مجھے کتنا زہر لگتا ہے کاش میں تمہیں بتا سکتا، پلیز ریکوسٹ ہی آئندہ مجھے بھائی مت کہنا اور ہاں۔" اس کی تحیر سے پھیلی نگاہوں میں جھانک کر مسکرا کر کہا وہ لمحہ بھر کو رکا تھا کہ اسے کچھ کہنے کو منہ کھولتے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"مجھ پہ غور کر کے بتانا کیسا لگتا ہوں تمہیں۔" اس کے تاثرات کو دیکھتا وہ اسی اطمینان سے کہتا پلٹ کر باہر چلا گیا آئمہ ششدر سی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

"آئمہ پلیز ایک کپ میرے لیے بھی۔" اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا جب وہ چائے بنانے کے ارادے سے کچن میں آئی تھی بٹلر نے اسے دیکھ کر مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی خدمات پیش کرنی چاہی تھیں مگر آئمہ نے منع کر دیا تھا ابھی چائے کا پانی رکھ کر چینی کے جار کی سمت ہاتھ بڑھانے ہی والی تھی جب حسان کی آواز پہ گہرا سانس کھینچتی نہ چاہتے ہوئے بھی پلٹی، ہاتھ میں بریف کیس لیے سیاہ پینٹ کوٹ میں وہ اپنی شاندار شخصیت سمیت کچن کے دروازے پہ موجود تھا، نگاہ چار ہوتے ہی دل آویزی سے مسکرایا، آئمہ کی لمبی

پلکیں بے اختیار جھکی تھیں۔

"تھینکس۔" وہ مسکراہٹ اس کی سمت اچھال کر چلتا بنا، پیچھے وہ الجھنے کو رہ گئی تھی، چائے بنا کر اس نے کتنی دیر یہ فیصلہ کرنے میں لگائی تھی آیا حسان کو چائے دینے اس کے کمرے میں جانا چاہیے، ملازمہ پتا نہیں کہاں تھی اور بٹلر ابھی کچھ دیر قبل سودا لینے مارکیٹ گیا تھا ناچار اسے ہی آنا پڑا۔

"چائے حسان بھائی۔" اس نے دستک دے کر اجازت ملنے پہ اندر قدم رکھا تھا کپ ٹیبل پہ رکھ کے پلٹی جب بے اختیار ہی حسان نے پکارا تھا۔

"جی۔" وہ رکی تھی البتہ پلٹے بغیر محض گردن موڑ کر دیکھنے پہ اکتفا کیا وہ بھی ایک نظر۔

"بیٹھو پلیز۔" وہ سگریٹ سلگا رہا تھا وہ یقیناً فریش ہو چکا تھا اس کے نم بالوں سے وہ اندازہ کر پائی تھی آئمہ نے ایک پل اسے دیکھا پھر کچھ کہے بغیر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"تم چائے نہیں پیو گی۔" اسے یونہی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے دیکھ کر حسان نے بات کا آغاز کیا۔

"میں پی چکی ہوں آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

آئمہ نے جواباً کسی قدر سنجیدگی سے کہہ کر اسے احساس دلانا چاہا تھا کہ اسے یوں تنہا اس کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں۔

"کہنا تو بہت کچھ ہے اگر تم سن لو تو اچھا ہے، یہ بتاؤ میری بات پہ غور کیا تھا۔" وہ چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگاتا ہوا بھرپور دلچسپی سے اس کا جائزہ لینے لگا" آئمہ نے سوالیہ انداز میں نظر اٹھائی مگر اگلے ہی پل اس کی نگاہ جھک کر رہ گئی پلکوں پہ لرزش سی اتر آئی وہ دیکھ ہی ایسے رہا تھا۔

"پلیز آئمہ میں منتظر ہوں۔" وہ مضطربانہ انداز میں گویا ہوا۔

"ابھی تو میں سوچ ہی نہیں پائی۔" اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبایا تھا اور کچھ شرارت بھری مسکان سمیت اسے تکا۔

"واٹ......؟" وہ جھٹکے سے چیخا۔

"تم جھوٹ بولتی ہو آئمہ بی سیریس پلیز کسی کی جان پہ بنی ہے یار۔"

"وان اے منٹ حسان بھائی آپ یقین کریں کہ میں ایسا سوچنے میں کامیاب نہیں ہو پائی شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسے شریک حیات کا تصور میرے ذہن میں بسا ہے، آپ ویسے نہیں ہیں سوری ٹو سے بٹ......"

حسان کے چہرے پہ لرزتے خفیف سے سائے کو دیکھتی وہ بات ادھوری چھوڑ کر معذرت خواہانہ نظروں سے اسے تکتی اٹھ گئی، حسان ٹوٹتے بکھرتے اعصاب سمیت تپتی ہوئی نظروں سے گھورتا لب بھینچے بیٹھا تھا جب وہ اچانک رکی تھی اور پلٹ کر اسے دیکھا حسان نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اپنی سرخ آنکھوں کو جھکایا تھا۔

"لیکن میں آپ سے یہی کہوں گی مایوسی کفر ہے، اچھی امید رکھیں، بقول شاعر، پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ، ہوسکتا ہے میرے دل میں بھی آپ کا خیال پیدا ہو جائے۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں تھی حسان کے تاثرات میں یکلخت تبدیلی رونما ہوئی تھی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی اگلے ہی لمحے وہ کچھ گنگناتے ہوئے چائے کا مگ اٹھا کر لبوں سے لگا چکا تھا۔

☆☆☆

لان میں گلابوں کے کیاریوں کے پاس کھڑی وہ مما سے فون پہ بات کر رہی تھی جب کسی کی پرتپش نگاہوں کے حصار میں خود کو جکڑا محسوس کرتے ہوئے اس نے یونہی نگاہ اٹھائی تھی یہ احساس اتنا زور آور تھا کہ وہ پلٹ کر دیکھنے پہ مجبور ہوئی، بالائی منزل کی سفید ریلنگ کے پار وہ تیس سے بتیس سال کی درمیانی عمر کا لمبا تڑنگا بھرپور شخص تھا جو اس کے متوجہ ہوتے ہی بوکھلائے ہوئے انداز میں بے اختیار دو تین قدم پیچھے ہٹا اور اگلے ہی لمحے جھٹکے سے مڑ کر اندر غائب ہو گیا۔

وہ بات کرنا بھول کر بھونچکی سی کھڑی رہ گئی، مما کے ہیلو پکارنے پہ وہ چونکی تھی اور اگلے چند لمحوں میں گفتگو سمیٹ کر سلسلہ منقطع کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر سر اونچا کرتے ہوئے بالکونی کی سمت سفید ریلنگ کے پار دیکھا، جہاں ہمہ وقت رہنے والی ویرانی کا راج تھا۔

"کون ہوسکتا ہے۔" اس کا ذہن الجھا تھا۔

آمد کی پہلی شب اور اس کے بعد عجیب وغریب شور اور چیخوں کی آوازیں اس

نے سنی تھیں ابھی ان کا ہی عقدہ نہیں کھلا تھا کہ یہ نئی الجھن، گلابی پھولوں کی ٹہنی کو ہوا کے زور پہ ہولے ہولے جھومتے دیکھ کر وہ یکلخت قائل تھی فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوتی وہ لازما اوپر جاتی مگر کچھ سوچ کر تھم سی گئی جانے وہ کون تھا اور کس حیثیت سے وہاں قیام پذیر تھا اس کا یوں بے دھڑک وہاں چلے جانا یقینا غیر معیوب حرکت ہوتی۔

"آئمہ۔" وہ اپنے دھیان میں تھی جب حسان کی بھاری بھرکم آواز پہ اچھی خاصی اچھل سی گئی۔

"اوہ آئی ایم ساری تم ڈر گئیں کس کے خیالوں میں گم تھیں۔"

وہ کب آیا تھا اسے قطعی خبر نہ ہوئی البتہ اسے روبرو پا کے مروتا مسکرا دی تھی۔

"تیار ہو جاؤ آج تمہیں کہیں گھمالاتے ہیں اسی مقصد سے میں نے بالخصوص صبا کو ساتھ تیار کیا ہے تاکہ انکار کی کوئی گنجائش نہ نکلے۔"

وہ اس کی پچھلی بار کی گئی آفر کو ٹھکرا دینا یاد رکھے ہوئے تھا آنچ دیتے لہجے میں جتا کر بولا تو آئمہ خفیف سی ہوگئی۔

"اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی خیر اٹس اوکے۔"

وہ کاندھے اچکا کر بولی تو حسان جو اسے ہی دیکھ رہا تھا قدم بڑھاتا ہوا بولا تھا۔

"تم تیار ہو جاؤ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔"

"اوکے فائن۔" وہ اسے اندر جاتے دیکھتی رہی پھر گہرا سانس کھینچ کر لان چیئر پہ بیٹھ گئی۔

کچھ خاص تیاری کیا کرنی تھی ابھی کچھ دیر قبل ہی اس نے نہا کر یہ ریڈ اینڈ بلیک کنٹراس سوٹ پہنا تھا۔ جو اس کی اجلی روشن رنگت پہ بہت جچ رہا تھا۔ اگلے چند لمحوں میں وہ اس کے سامنے آیا تھا۔

"آر یو ریڈی۔"

"ہوں۔"

"مگر صبا۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے کاندھوں کے پار جھانکا۔

"وہ آئمہ صبا گھر پہ نہیں ہے کیا اس روز کی طرح آج بھی تم میرے ساتھ تنہا جانے پر متردد ہو۔" آئمہ فوری جواب نہیں دے پائی۔

''ڈونٹ مائنڈ بٹھو پلیز۔''

''جی۔'' وہ کچھ گھبرا کر اسے دیکھنے لگی۔

''اگر تم نہیں چاہتیں تو زبردستی نہیں پلیز ریلیکس۔''

''اوہ تھینکس۔'' وہ یکا یک ممنون ہوتی ہلکی پھلکی سی ہو گئی۔

''جانے صبا میری تاکید کے باوجود کیوں نہیں رکی اپنی وے پھر سہی۔''

ہوا کے دوش پر اڑتے بالوں کو انگلیوں کی مدد سے پیشانی سے ہٹاتا وہ جانے اپنی کھسیاہٹ دور کر رہا تھا یا اسے تسلی دے رہا تھا وہ سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔

''آپ کے شہر میں دیکھنے لائق ایسا کیا ہے جو آپ لازماً مجھے گھمانے پر کمربستہ ہیں۔'' اس نے خفیف سی شرارت سے کہا تھا اور آہستگی سے مسکرا دی۔

''بہت کچھ، سب سے خاص تو میں ہوں۔'' اس نے جواب سنجیدگی سے دیتے اسی خاص نگاہ سے اسے تکا۔

''تمہاری اسٹڈی کمپلیٹ ہو گئی آئمہ۔'' اب وہ موضوع بدل چکا تھا۔

''نہیں سائیکالوجی کی اسٹوڈنٹ ہوں۔''

''ہیومن سائیکالوجی۔ یا پھر برڈ سائیکالوجی۔''

آئمہ نے چونک کر اسے دیکھا تو نگاہوں میں استعجاب چھلک رہا تھا اسے حسان کا یہ سوال جس قدر عجیب سا لگا تھا اس سے بڑھ کر احمقانہ محسوس ہوا تو اسی تحیر و استعجاب سے کسی حد تک جھلا کر بولی تھی۔

''آف کورس ہیومن سائیکالوجی۔'' جواباً حسان بہت بے ساختگی میں ہنسا تھا۔

''تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم ان برڈز سے توجہ ہٹا کر اس چھ فٹ کے انسان پہ دھیان دو۔'' چمکتی ہوئی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر شرارت لیے وہ پنجرے کی سمت اشارہ کرتا ہوا بولا جس میں موجود آسٹریلین طوطے اور مینا اس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں اور اسے یقیناً یہ بے توجہی کھلی تھی۔ آئمہ یکا یک بہت سنجیدہ نظر آئی تھی۔

''تمہیں پرندے اچھے لگتے ہیں۔''

وہ یقیناً ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا آئمہ کو کوفت ہوئی تھی جانے کیوں۔

''ہوں مگر قیدی نہیں فضاؤں میں اڑنے والے آزاد پنچھی۔'' پھوپھو نے اس کے

استفسار پہ بتایا تھا یہ حسان کا شوق ہے۔

''آپ نے انہیں قید کیوں کر دیا ہے۔'' اس نے اچانک مڑ کر اسے دیکھا جو بہت توجہ بہت دھیان سے اسے ہی دیکھ رہا تھا اس کے متوجہ ہونے پر بے ساختہ مسکرایا۔

''اس لیے کہ تمہاری طرح یہ بھی مجھے پسند آ گئے ہیں اچھے لگتے ہیں۔''

آئمہ کے اندر ناگواری اور تلخی کا احساس بہت تیزی سے پھیلا مگر ایک بار پھر کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اندر امڈتے اشتعال کو لب بھینچ کر دبائے خود کو کچھ کہنے سے باز رکھ پائی۔

''کیا جو اچھا لگتا ہے اسے آپ یونہی قید کر لیتے ہیں۔''

اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا حسان اس کا بگڑا ہوا انداز پوری طرح محسوس کرتا زور سے ہنسا تھا پھر آہستگی سے چلتا اس کے عین مقابل آن ٹھہرا۔

''جو اچھا لگے اسے ہی تو قید کرنے کا لطف ہے۔''

اس کی خفا خفا سی آنکھوں میں جھانک کر وہ جانے کیا جتانا چاہ رہا تھا آئمہ کے اندر ان نگاہوں کا ارتکاز اور سرد سا انداز بہت سرعت سے خوف کا احساس بن کر بکھرا۔

''مگر یہ تو سراسر زیادتی ہے آپ اس حد تک اذیت پسند ہوں گے میں نہیں جانتی تھی۔'' اس نے بھرپور خفگی سے کہا۔

''زیادتی کیوں سلی گرل، یہ قید تو محبت کی قید ہے تاکہ من چاہی چیز دام رسائی میں ہی نہیں نگاہوں کے سامنے بھی رہے۔'' وہ مسکراہٹ ضبط کرتا ہوا بولا تو آئمہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

''آپ انہیں آزاد کیوں نہیں کرتے۔''

''تم کہو گی تو کر دوں گا ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔'' انداز سراسر احسان جتانے والا تھا آئمہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

''تمہاری آنکھیں بہت خوب صورت ہیں آئمہ۔''

ابھی کچھ دیر قبل وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہوئی تھی کھانے کی ٹیبل پہ آئی تو دوپٹہ ابھی تک نماز کے اسٹائل میں لپٹا ہوا تھا اس مقدس سے روپ نے اس کی معصومیت بھری

دلکشی کو ایسا انوکھا نکھار بخشا تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود نگاہ نہیں ہٹا پایا۔

"جی۔" وہ خائف سی ہو کر رہ گئی اس وقت ٹیبل پہ ان دونوں کے سوا تیسری ملازمہ تھی جو کھانے کی ڈشز بہت سلیقے سے رکھ رہی تھی۔

"او خفا ہو گئیں، کم آن آئمہ کیوں مجھے قدم قدم پہ حیران کرنے کا عہد کر لیا ہے، اسلام آباد جیسے شہر میں رہ کر بھی اگر تم آزاد خیال نہیں بن سکیں تب بھی مائی ڈیئر اظہار تو ہر دور میں عورت کی طلب رہی ہے تم اس قدر انوکھی کیوں ہو، چاہے وہ عورت فیشن ایبل ہو، بولڈ ہو یا پھر محدود سے ذہن کی مالک، بہر حال مرد کا برملا اظہار پسندیدگی اسے ایک نئے انوکھے خوش کن احساس سے روشناس کراتا ہے۔"

اس کے چہرے پہ اپنی بات کے جواب میں جو ناگواری محسوس کی تھی اسے دیکھتے وہ بہت عجیب انداز میں کہتا چلا گیا، تب آئمہ کی نگاہوں میں موجود سرد سا تاثر کھمبیر قسم کی خفگی میں ڈھل گیا۔

"سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں اسلام آباد میں رہتی ہوں انگلینڈ یا امریکہ میں نہیں، دوسری بات میں کلیئر کر دوں کہ آزادی اور بے حیائی یہاں ہوتی ہے اپنے ذہن میں......"

اس نے سر کی سمت اشارہ کیا۔

"آپ کی بات بالکل درست ہے حسان بھائی کہ اظہار پسندیدگی اور تعریف ہر عورت کی کمزوری ہے حقیقتاً میری بھی ہے مگر جائز تعریف اور جائز پسندیدگی، یہ بات آپ کی بجائے اگر میں اپنے شوہر کے منہ سے سنتی تو مجھے یقیناً اچھا لگتی مگر اب نہیں، مائنڈ اٹ پلیز بی کیئر فل نیکسٹ ٹائم۔" اس کا موڈ کچھ اس طور پر غارت ہوا تھا کہ وہ مزید ایک پل بھی وہاں نہیں ٹھہری تھی کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم راضی ہو جاؤ تو یہ بھی مشکل نہیں۔" وہ اس کے پیچھے معنی خیزی سے ہانک لگا کر بولا تھا، آئمہ کو شدید قسم کا تاؤ آ گیا، اس سے قبل کہ وہ اپنی یہ برہمی واضح کرتی، بالائی منزل سے کسی کے زور سے چیخنے کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونجتی چلی گئی۔ وہ ہڑبڑا کر باہر بھاگ جانا چاہتی تھی کہ حسان کی مداخلت پہ ٹھٹک گئی۔

"رک جاؤ آئمہ۔" حسان کی سرد ٹھہری ہوئی آواز پہ وہ الجھ کر پلٹی۔

"کچھ نہیں ہے فیک اٹ ایزی۔"

"مم مگر میں نے خود دیکھا ہے وہ وہاں۔" وہ ہکلائی ابھی کچھ لمحوں قبل کی تمام تر تلخ کلامی بھلائے وہ ایک نئی فکر میں ہلکان تھی۔

"ہاں بولو کیا دیکھا۔" حسان اپنی جگہ چھوڑتا ہوا اٹھ کے اس کے قریب آیا اس کی آنکھوں سے چھلکتے خوف اور تشویش کو دیکھ کر درشتگی سے بولا، تب آئمہ نے عجیب سے انداز میں چونکتے ہوئے اس کے اس ناگوار تاثر کو دھیان سے دیکھا، حسان اس کی نگاہ کو بھٹکتے پا کر فوری ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

"بیٹھو بتاتا ہوں۔"

"نہیں میں پھپھو سے پوچھ لوں گی۔"

وہ اس سے کترا گئی تھی اور تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی، اس احساس سے بے خبر کہ حسان پیچ و تاب کھا رہا ہے۔

☆☆☆

"صبا وہاں اوپر کوئی رہتا ہے۔" وہ سخت بے چین تھی مگر بظاہر بہت سرسری سے انداز میں پوچھا تھا۔

"ہاں آسیب۔" صبا نے فیشن میگزین کا صفحہ پلٹتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔

"واٹ، مگر وہ تو ایک اچھا خاصا انسان تھا۔"

"ارے۔" صبا اس کا فق چہرہ دیکھ کر زور سے ہنسی۔

"پاگل ہے وہ۔"

"ارے کوئی آسیب نہیں ہے وہ ہمارا سگا تایا زاد ہے مگر مکمل طور پہ ذہنی مریض ہے۔" آئمہ ششدر سی بیٹھی رہ گئی۔

"اس کے علاوہ استھما کا مریض ہے مکمل طور پہ پاگل ہے بے چارہ، اسے مینٹل ہاسپٹل میں ہونا چاہیے جس قدر وہ خطرناک ہے وحشی جنونی ہو جاتا ہے، جب دورہ پڑتا ہے، توڑ پھوڑ کرتا ہے، چیختا چلاتا ہے اس رات تم نے وہ چیخیں سنی تھیں نا، بسا اوقات تو اپنے آس پاس موجود لوگوں کو جان سے مار دینا چاہتا ہے، پولو بڑی اماں کو تو اس نے کئی بار گلا دبا کر

مارنے کی کوشش بھی کی مگر..... مگر" وہ مکمل طور پہ حراساں ہو چکی تھی، اس کی بڑی بڑی ساحر آنکھیں تحیر و استعجاب سے پھیل کر مزید کشادہ ہو گئیں۔

"مگر اللہ نے بچا لیا۔" صبا آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

"اچھا۔"

"مگر جب میں نے اسے دیکھا تب تو نارمل نظر آ رہا تھا، وہ اچھا خاصا ابھی۔"

"دور سے کیا پتا لگتا ہے یہ سب میں نے تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ تم احتیاط کرنا ذرا بچ کر رہنا۔" وہ اسے نصیحت کر کے چلتی بنی تھی آئمہ گم سم بیٹھی تھی۔

☆☆☆

گرمیاں رخصت ہو چکی تھیں، یہ سہ پہر کا وقت تھا، موسم اچھا ہو رہا تھا، وہ اپنے کمرے سے نکلی تو ہر سو خاموشی کا بسیرا تھا، لاؤنج میں جھانکا جو خالی پڑا تھا، کچھ سوچ کر وہ لان کی سائیڈ سے اوپری منزل پہ جاتے زینے کی سمت آ گئی، جانے کیوں صبا کی بڑی اماں اور ان کے بیٹے کے متعلق جان کر اس کے نرم ہمدرد دل میں دونوں ماں بیٹے کے لیے ہمدردی کا احساس امڈ آیا تھا، ارادہ ان سے مل کر بات چیت کر کے یونہی دل بہلانے کا تھا، بوریت اور تنہائی دور کرنے کا تھا، مگر زینہ طے کر کے اوپر آنے پر سیڑھیوں کے اختتام پہ موجود دروازہ بھڑا ہوا پا کر وہ کچھ دیر یونہی کسی سوچ میں گم ہو گئی۔

آنے کو تو آ گئی تھی مگر اب کچھ متذبذب سی تھی، کیا خبر پہلے ہی قدم پہ سامنا اس خبطی انسان سے ہو جائے اپنے اس خیال کو جھٹکتے ہوئے اس نے بند دروازے پہ ہلکا سا دباؤ ڈالا تو لکڑی کا وہ رنگ اڑا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ سے کھلتا چلا گیا، اللہ کا نام لے کر اس نے اندر قدم رکھ دیا تھا کہ دل میں اس بگی کا خیال بہرحال خفیف سا خوف پیدا کر رہا تھا مگر فطری تجسس نے اسے قدم بڑھانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"کون آئمہ بیٹی۔" وہ غالباً کچن تھا جہاں سے اس کی پکار کے جواب میں قدرے فربہ جسم کی ادھیڑ عمر خاتون نے دروازے سے جھانکا اور بہت اپنائیت سے مسکرائیں، آئمہ کو بہت ہی حیرانی نے آن لیا بھلا وہ اس سے کیسے واقف تھیں۔

"آؤ بچی بہت خوشی ہوئی تمہیں یہاں دیکھ کر۔"

خود سے بڑھ کر اسے لپٹا کر پیار کرتیں وہ اسے پھپھو اور صبا وغیرہ کے بیانات

سے یکسر مختلف بہت مشفق اور نرم خو محسوس ہوئی تھیں۔

"سوری مجھے تو بالکل پتا نہیں تھا کہ پھپھو کے علاوہ ان کا کوئی اور اتنا قریبی رشتہ بھی یہاں رہائش پذیر ہے، ورنہ پہلے ہی ملنے چلی آتی، ویسے آپ نے کیسے پہچان لیا اتنی جلدی مجھے۔"

ابھی خاصی خجالت محسوس کرتی آخر میں وہ کچھ حیرانی سے بولی تھی۔

"میں نے تمہیں اکثر لان میں دیکھا تھا اور یہ تو پتا چل ہی گیا تھا کہ تم آئمہ ہو، ماشاء اللہ بہت پیاری تھیں بچپن میں تم، مگر اب کچھ اور بھی زیادہ پیاری ہو گئی ہو، اللہ صورت کی طرح نصیب بھی روشن کرے۔"

اسے کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کرتیں وہ پکھا چلا چکی تھیں۔

"اطمینان سے بیٹھو بیٹا میں ذرا چولہا بند کر دوں۔"

اثبات میں سر ہلا کے وہ گہرا سانس کھینچتی اطراف میں نگاہ دوڑاتے چونک سی گئی، پلستر اکھڑی دیواریں، برآمدے کے آگے کی چق اور خستہ حال میز، جس کرسی پہ وہ بیٹھی تھی اس کا رنگ روغن بھی جانے کب کا اڑ چکا تھا، کھڑکیوں کی حالت زار کا چیخ کر اعلان کر رہی تھیں۔

اسے عجیب سی حیرت نے آن لیا، نیچے اور اوپر کے حالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

"اور سناؤ بچی تمہارے بابا اور مما تو ٹھیک ہیں نا۔"

بڑی اماں چھوٹی ٹرے میں گلاس سجائے چلی آئیں۔

"تھینکس۔"

طلب نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے بہت خوش دلی سے گلاس تھاما اور چھوٹا سا سپ لیا۔

"بابا اور مما تو عمرہ کے لیے گئے ہیں۔ تبھی میں یہاں نظر آ رہی ہوں۔" ہلکے سے مسکرا کر اس نے کہا۔

"اچھا پھر تو مبارک باد کے مستحق ہیں ماشاء اللہ۔"

ان کے تاثرات میں یکایک عقیدت بھری خوشگواری لہرائی۔

"آپ یہاں تنہا رہتی ہیں۔" ایک اور سپ لے کر اس نے کمال معصومیت سے ادھر ادھر دیکھتے یہی تاثر دیا جیسے وہ واقعی کچھ نہیں جانتی، حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ان کے

بیٹے کے متعلق ہی جاننے کی خواہش لے کر یہاں آئی تھی۔

جب سے اس نے ریحان سے سنا تھا کہ وہ ہاورڈ یونیورسٹی کا کوالیفائیڈ تھا اور اب پچھلے چار سالوں سے نیم دیوانگی کے عالم میں تھا، اس کے اندر عجیب کھد بد لگ گئی تھی، اس نے ریحان سے اس سلسلے میں مزید جاننے کی سعی کی تھی مگر ریحان دوبارہ کچھ منہ سے نہیں پھوٹا تھا یہ بات بھی جانے کیسے اس کے منہ سے پھسل گئی تھی، اس نے ازلان اور پھپھو کی خونخوار نظروں کو بہت حیرانی سے تکا تھا، تب اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے ہر صورت اس مسٹری سے آگاہ ہونا ہے، وہ پراسرار سا شخص اپنی تمام تر پراسراریت سمیت اس کے نزدیک اہمیت حاصل کر چکا تھا۔

”نہیں میرا بیٹا ہے معید وہ میرے ساتھ رہتا ہے اس وقت سو رہا ہے۔“

بڑی اماں نے رسانیت سے کہا مگر اس کی تشفی نہیں ہوئی تھی اس ادھورے سے جواب سے، جبھی چونکتے ہوئے انہیں دیکھ کر بڑی معصومیت و حیرانی کا مظاہرہ کرتے آنکھیں پھیلائیں۔

”اس وقت سو رہے ہیں خیریت۔“ اپنی اس ایکٹنگ پہ وہ خود کو دل ہی دل میں داد دیے بغیر نہیں رہ پائی، چند دنوں میں بابا اور مما کو واپس آ جانا تھا تو ظاہری بات تھی، اس کے یہاں قیام کا جواز ختم ہو جاتا اور وہ جانے سے قبل اس راز کو پا لینے کی خواہش مند تھی۔

”ہوں دراصل اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

اس نے بہت شدت سے محسوس کیا اتنی سی بات کرتے بڑی اماں کی آنکھوں میں لمحے میں نمی اتری ہے۔

”خیریت۔“ وہ بغور انہیں تکنے لگی، البتہ یہ جان کر کہ وہ شخص واقعی پاگل ہے اسے عجیب سے دکھ نے آن گھیرا تھا، جانے کیوں سب کے کہنے کا وہ یقین نہیں کر پائی تھی کہ جب اس نے اسے بالکنی میں دیکھا تھا تو کسی انداز سے بھی وہ ابنارمل محسوس نہیں ہوا تھا۔

”ہوں وہ بیمار ہی رہتا ہے۔“ بڑی اماں نے مختصر جواب دے کر ایک بار پھر سر جھکا لیا، انداز کی رنجیدگی اور افسردگی چھپائے نہ چھپی۔

”تو ان کا علاج کروائیں نا بڑی اماں۔“ اس نے تسلی کے انداز میں اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پہ رکھ کر کہا۔

”ہوں۔“ وہ اب لب کچل رہی تھیں جھکا سر کچھ اور جھک گیا وہ یوں چپ تھیں جیسے اب کچھ نہ بولیں گی آئمہ کے پاس جیسے کچھ بھی کہنے کو باقی نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

مائیں نی مائیں منڈیر پہ تیری بول رہا ہے کاگا
جوگن ہو گئی تیری دلاری من جوگی سنگ لاگا

موسم بہت اچھا تھا آسمان پہ کالی گھٹائیں اُمڈی چلی آ رہی تھیں تو خوش گوار سی ہوا کے دوش پہ لہراتے پھول پودے اس کے من آنگن میں مستی بھر گئے تھے۔

اس نے کمرے سے موسم کی خوب صورتی کو محسوس کیا اور جوتے پہن کر باہر آ گئی لان میں ٹہلتے ہوئے آپ ہی آپ اس کے لبوں پہ گنگناہٹیں اتر آئی تھیں یونہی گنگناتے ہوئے اس نے گلابی پھولوں سے لدی بیل کو پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا تو اس نے فراخدلی سے پھول نچھاور کر دیے وہ بے اختیار مسکرا دی، خود میں مگن اس قدر تھی کہ اسے بالائی منزل کی بالکونی سے اپنی سمت تکتی ان نگاہوں کا قطعی احساس نہ ہو سکا جن کی وحشت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ گرین گھاس پہ آتشی گلابی لباس میں ملبوس وہ اڑتے آنچل کو سنبھالتے کو ہلکان لڑکی اس کے اندر دیوانگی کو جنم دے چکی۔

”سویرا۔“ اس نے سختی سے ریلنگ تھام کر آنکھیں پھاڑی تھیں۔ یہاں وہاں متحرک وہ دلکش نازک پیکر اس کا انوالون نہیں ہے، یہ خیال اس کے شعور نے اسے بہت تیزی سے بخشا تھا، اگلے ہی لمحے وہ ریلنگ چھوڑ کر سیڑھیوں کی سمت بھاگا۔

”معید“ بڑی اماں نے اسے یوں اندھا دھند دروازہ کھول کر سیڑھیاں پھلانگتے دیکھا تو کپڑے دھوتے یونہی اس کے پیچھے لپکیں، مگر وہ ان کی پکار نظر انداز کرتا باقی ماندہ سیڑھیاں بھی پھلانگ گیا تھا، لان تک آتے ہی اس کا سانس پھول گیا تھا۔

”سویرا، سویرا تم کہاں چلی گئی تھیں۔“ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی اس کا بازو اپنے آہنی ہاتھ میں دبوچتا اپنی جانب کھینچتا ہوا وہ پر وحشت انداز میں بے ربط سا ہوا تھا، جبکہ آئمہ تو اسے روبرو بلکہ اتنا نزدیک پا کر خوف کی زیادتی سے گنگ ہو گئی تھی خوف کی سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں بہت سرعت سے پھیلتی چلی گئی۔

”کہاں چلی گئی تھیں، مجھے تنہا چھوڑ کر تمہیں پتا تھا نا کہ میں...... میں تمہارے بغیر

نہیں رہ سکتا۔"

ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور چھلک پڑتی خوف زدہ آنکھوں سے اندتی جنون خیزی، وہ مکمل طور پہ حواسوں سے باہر ہو رہا تھا۔ وہ پوری آستی سمیت مل کر رہ گئی تھی، اس کا لمس ناگواری کا برقی رو بن کر احساس اس کے پورے وجود میں سرائیت کر چکا تھا مگر اس احساس پر بھی حاوی جو احساس تھا وہ خوف اور بے بسی کا تھا۔

"کیا کر رہے ہو چھوڑو مجھے۔" ماہی بے آب کی مانند مچل کر وہ اس کی گرفت سے نکلنے کو بے قرار ہوئی تھی، جب معید نے جانے کسی خوف کے زیر اثر اسے چھوڑنے کی بجائے پر وحشت سے انداز میں اپنی جانب کھینچ کر جنونانہ سی کیفیت میں بازوؤں میں جکڑ کر بے بس کر ڈالا۔

"نا......نہیں چھوڑوں گا، اب کبھی نہیں چھوڑوں گا، تم چلی جاؤ گی، تم مجھے چھوڑ کر چلی جاتی ہو۔"

اس کے لہجے کی وحشت اور تیزی پہ بے بسی اور آنسوؤں کی نمی غالب آ گئی، آئمہ اگر اس حد تک سراسیمہ و متوحش نہ ہو چکی ہوتی، تو اس کا گھٹ گھٹ کر رونا ضرور محسوس کرتی، اپنا پورا زور لگا کر بھی وہ اس سے اپنا آپ چھڑانے میں کامیاب نہ ہو پائی تو سراسیمگی و بے بسی کی انتہاؤں کو چھوتی زور زور سے رونے لگی، مگر وہاں مطلق اثر نہ ہوا تھا۔

وہ اس کے سر اور چہرے کے مختلف نقوش کو چومتا ہوا بھینچے ہوئے لہجے میں جانے کیا کچھ کہے جا رہا تھا، بڑی اماں گرتی پڑتی لان میں پہنچ چکی تھیں اور اب اسے کسی نہ کسی طرح معید کی گرفت سے آزاد کرانے کی سعی میں مصروف معید دو چار اچھے خاصے دھموکے لگا چکی تھیں، مگر وہ تو جیسے پاگل ہو چکا تھا۔

اندرونی حصے سے نکل کر پورٹیکو کی طرف جانے کو لان کی سیڑھیاں اترتے حسان نے یہ سلگتا ہوا منظر دیکھ کر حواسوں پہ بجلی گرتے محسوس کی، مگر اگلے ہی لمحے اس میں جیسے پارہ بھر گیا تھا، درمیانی فاصلہ سمیٹتے ہوئے وہ بالکل کسی خونخوار وحشی درندے کی مانند ہی معید پہ جھپٹا تھا اور ایک ہی جھٹکے میں اسے آئمہ سے الگ کر کے اپنی جانب گھسیٹتے ہی اسے لاتوں اور گھونسوں کی زد پہ رکھ لیا۔

آئمہ اس جھونک میں بے توازن ہو کر دور گری تھی گالوں پہ بہتے آنسوؤں کو

پونچھے بغیر اس نے بکھرے حواسوں کو مجتمع کرتے ہوئے اٹھنا چاہا، مگر یہ دیکھ کر اسے شاک لگا تھا، کہ اتنی سی دیر میں گھر کے تقریباً تمام مکین وہاں جمع ہو چکے تھے، گھبراہٹ، سبکی، شرم اور خوف کا احساس اسے زمین میں گاڑھ گیا، حسان میں تو جیسے کوئی جن سا گیا تھا، چند لمحوں کے اندر اس نے معید کی حالت بگاڑ دی تھی، بے دریغ مغلظات بکتے ہوئے وہ ابھی تک اسے ٹھوکروں کی زد پہ رکھے ہوئے تھا۔ معید لہولہان ہو رہا تھا جبکہ بڑی اماں بلک بلک کر روتی اسے بچانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھیں، معید کی ہذیانی چیخوں سے در و دیوار لرزنے لگے تھے۔

"پاگل ہو گئے ہو حسان، جان سے مارو گے چھوڑو اسے رحم کرو چاند، لعنت بھیجو۔" بڑی اماں زور زور سے فریادی انداز میں روتیں معید کو اس سے چھڑانے کی کوشش میں حسان کی لاتیں اور مکے اپنے ناتواں وجود پہ سہہ چکی تھیں، تب پھپھو جو تب سے خاموش تماشائی بنی کھڑی تھیں، احسان جتانے والے انداز میں حسان کو روکتے ہوئے بولیں۔

"میں زندہ نہیں چھوڑوں گا اسے، جان سے مار ڈالوں گا، زندگی عذاب بنا کے رکھ دی ہے۔" وہ دانت کچکچا کے چیخا، آئمہ جو کچھ لمحوں قبل صدمہ و بیحد شرمندگی ناگواری کے احساس سے مغلوب تھی حسان کا یہ انداز پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی گویا قوت گویائی کھو بیٹھی، پھپھو کے پکڑتے پکڑتے بھی اس نے بپھرے ہوئے انداز میں مچل کر بڑی اماں کے دقتوں سے سہارا دے کر بمشکل کھڑا کیے معید کے منہ پہ گھونسا دے مارا تھا، وہ یہ جھٹکا سہارے بغیر لڑکھڑایا تھا اور اچھل کر دو فٹ دور سر کے بل جا گرا، اس کی ناک سے خون فوارے کی مانند ابل کر باہر آیا تھا، آئمہ کے حلق سے بے اختیار گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی، وہ بے اختیار بھاگ کر گرتے ہوئے معید کے پاس آئی تھی مگر بڑی اماں روتے ہوئے اس کی ناک پہ اپنا دوپٹہ رکھ چکی تھیں۔

"شکل گم کرو اس کی، ورنہ ضائع ہو جائے گا میرے ہاتھوں سے۔"

وہ چیخ کر کہہ رہا تھا، آئمہ نے گردن موڑ کر تیز نظروں سے اسے دیکھا اور پلٹ کر تیز قدموں سے اندر بھاگ گئی۔



"میں نے کہا تھا تم سے محتاط رہنا اس سے مگر تم......" وہ متورم چہرے اور سوجی

ہوئی آنکھیں لیے بیٹھی تھی جب حسان اس کے سر پہ آ کر برسا۔ آئمہ نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، وہ اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی، اس کے دل و دماغ میں ایک ہیجان سا برپا تھا۔

''وہ ایک ٹوٹلی میڈ انسان ہے''۔ ''ابنارمل اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔'' ''سویا جانے وہ کون تھی۔'' اس نے بوجھل دل سے سوچا۔

''حسان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا وہ اتنا ایموشنل کیوں ہو رہا تھا۔ حالانکہ برا تو مجھے لگنا چاہیے۔'' ''کیا مجھے برا لگا۔'' اس نے اپنا دل ٹٹولا اور عجیب سے سناٹے کو محسوس کرنے لگی۔ ایک ایسے شخص کی حرکت ہرگز قابل گرفت نہیں ہو سکتی، جو اپنے حواسوں میں نہ ہو، خاصی دیر کے بعد اس نے یہ طے کیا تھا۔ حسان اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد پاؤں پٹختا چلا گیا تھا۔

''کس بے دردی سے مارا تھا حسان نے، ''اگر اسے کچھ ہو جاتا تو اف۔''

اسے جھرجھری سی آ گئی، اسے بیک وقت ان دونوں سے ہمدردی محسوس ہوئی، ساتھ ہی وہ سب کچھ نئے سرے سے یاد کرتے وہ ایک اضطرابی کیفیت کا شکار ہوئی تھی۔

''آئی ایم ساری آنٹ یقیناً تمہیں اچھا نہیں لگا'' مجھے تمہیں یوں نہیں ڈانٹنا چاہیے تھا۔ وہ ایک بار پھر سامنے تھا، نہایا دھویا فریش کہیں جانے کو تیار، کچھ لمحوں قبل کا واقعہ جیسے یکسر فراموش ہو چکا تھا، اسے اس کی بے حسی اور سنگدلی بہت شدت سے محسوس ہوئی۔

''مجھ سے پہلے یہ ایکسکیوز آپ کو بڑی اماں اور ان کے بیٹے سے کرنا چاہیے تھا۔'' اسے اتنا غصہ آیا تھا کہ ناگواری سے کہہ گئی، حسان نے اچھا خاصا چونک کر بھنویں اچکاتے ہوئے اسے دیکھا۔

''اچھا مذاق نہیں کرو اپنا موڈ بحال کرو۔''

''پلیز حسان۔'' اس نے ٹوک دیا۔

''آپ کو فیل نہیں کر رہے کہ آپ نے ناجائز کسی سے اتنی بدسلوکی کی۔'' جانے کیوں اسے وہ احساس جتانا چاہتی تھی جو شاید کبھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

''تم کچھ نہیں جانتی ہو آئمہ اس لیے تم اس معاملے سے الگ رہو۔''

اس کے چہرے و آنکھوں سے یکایک درشتی چھلکی۔

''جو کچھ بھی ہوا مجھے غرض نہیں، میں اب کی بات کر رہی ہوں، میری وجہ سے آپنے اسے ہارچ کیا وائے۔'' چبھتے ہوئے لہجے میں کہہ کر وہ اسے بھڑکا گئی۔

''اوہ آئی سی، کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں اس سنکی سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ محض ہمدردی سمجھوں اسے یا کچھ اور بھی، کیونکہ اس کی صورت پہ تم جیسی بہت احمق یونہی مرتی ہیں۔'' زہر میں بجھا ہوا لہجہ اور تیکھا انداز آئمہ کو دو دھاری تلوار کی طرح کاٹ گیا۔

''شٹ اپ، ول یو شٹ اپ۔'' وہ ضبط کھو کر چلائی تھی۔

''آپ کی پست سوچ کا ابھی ابھی اندازہ ہوا ہے مجھے، اس قدر گری ہوئی ذہنیت ہے آپ کی، مجھے افسوس ہو رہا ہے، میری نارمل فیلنگ کو جو رنگ دینے کی آپ کوشش کر رہے ہیں، وہ آپ کی سوچ کی غماز ہے۔''

کھنچے ہوئے لہجے میں کہتی وہ تن فن کرتی وہاں سے چلی گئی۔ حسان نے لب بھینچ کر اپنے اشتعال پہ قابو پایا تھا۔

''تمہارا مجھے کچھ کرنا پڑے گا سعید حسن، ورنہ کچھ بھی ایسا ہو سکتا ہے، جو مجھے مر کے بھی گوارا نہیں، اور اگر اب کچھ ایسا ویسا ہوا تو تمہیں میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔''

اس نے ہونٹ سکوڑ کر نفرت سے کہا اور جھٹکے سے پلٹ کر باہر نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

''مجھے افسوس ہے بڑی اماں کہ میری وجہ سے۔''

اس کا احساس جرم ہی اسے وہاں دوبارہ کھینچ لے گیا تھا، اور اب وہ کسی مجرم کی طرح ہی سر جھکائے ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ بڑی اماں نے شدت گریہ سے سوجی آنکھوں سے اسے دیکھا اور سرد آہ بھری۔

''تم کیوں پریشان ہوتی ہو میری بچی، یہ میرے بیٹے کا نصیب ہے۔''

''مگر یہ زیادتی ہوئی ہے بڑی اماں ان کے ساتھ، حسان کو کس نے حق دیا تھا یوں ہاتھ اٹھانے کا۔'' بڑی اماں نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر سر جھکا لیا۔

''بڑی اماں پلیز کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں سویرا کون ہے؟ سعید کو غالباً مجھ پہ سویرا کا گمان ہوا تھا۔'' ان کے ہاتھ پہ نازک ہاتھ رکھتے وہ بہت التجائیہ انداز میں بولی تو اس مرتبہ بڑی اماں بھی خود پہ ضبط نہ کر پائیں کتنے ہی آنسو ان کے گالوں کو بھگوتے، گریبان

میں گم ہو گئے تھے۔

"سویرا کی وجہ سے ہی تو میرا بچہ ان نوبتوں کو پہنچا، وہ پاگل نہیں ہے، میرا بچہ پاگل نہیں ہے۔"

"یہ ہمیشہ سے ایسا تھوڑا ہی تھا، یہ تو اتنا خوبرو، اتنا شاندار تھا کہ جہاں چلا جاتا، بس ہر شخص صرف اسے ہی دیکھا کرتا، اس کی یہی صورت، یہی خوبروئی، اس کے لیے عذاب بن گئی۔"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولتے بولتے یکدم چپ ہوئیں، انداز چونکنے کا سا تھا، اس سے پہلے کہ آئمہ کچھ سمجھتی، وہ یکلخت اٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پہ گھبراہٹ یکبارگی اتری تھی۔

آئمہ نے حیرت سے انہیں اندر کمرے کی سمت بھاگتے دیکھا، کچھ ثانیوں کو وہ ہونق سی وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔ مگر پھر سنبھل کر اٹھتے ہوئے ان کے پیچھے کمرے میں آئی اور اپنی جگہ سکتے میں آ گئی تھی۔ کمرے کے وسط میں بچھے پلنگ پہ معید چت لیٹا تھا۔ اس کے جسم کو ازخود تڑپتے ہوئے جھٹکوں کو، آئمہ نے استعجاب اور خوف کی نگاہ سے دیکھا۔ بڑی اماں نے اندھوں کی طرح لپک کر پہلے اسے سنبھالنے کی سعی کی تھی۔ پھر سائیڈ ٹیبل پر دھرے ان ہیلر کو کانپتے ہاتھوں سے اٹھایا تھا۔ اور بری طرح سے کانپتے معید کے ہونٹوں سے لگانے کی کوشش کی، مگر ان کے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے۔

"معید سانس لو بیٹے، سانس اندر کھینچو۔" بھیگی آواز میں چیخ کر کہتے ہوئے انہوں نے ان ہیلر کا ڈھکن کھولے بغیر کھینچ دیا، یقیناً وہ گھبراہٹ و سراسیمگی کے عالم میں اس طرف دھیان نہیں دے پائی تھیں، آئمہ کا دل دکھ کی انتہائی شدت سے کھنچنے لگا۔

"تو گویا یہ شخص استھما کا بھی مریض ہے۔" اس نے انتہائی کرب سے سوچا، اور بے اختیار آگے بڑھ آئی۔

"بڑی اماں میں کرتی ہوں۔"

ان کے بری طرح لرزتے ہاتھوں سے ان ہیلر لے کر اچھی طرح اوپر تلے ہلانے کے بعد اس نے ماؤتھ پیس کا ڈھکن ہٹا کر ان ہیلر معید کے پھڑپھڑاتے نیلے پڑے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"سانس کو اندر کھینچیں۔" اس نے معید کی پیشانی پہ موتیوں کی مانند چمکتی پسینے کی بوندوں کو آزردگی سے تکتے نرمی و ملائمت سے کہا اور کنیسٹر کو دبا کر دوائی کا پف اس کے حلق تک پہنچایا۔ معید کی ہنوز وہی حالت تھی، یہی وجہ تھی، کہ اسے خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کے اپنے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ البتہ اس نے بڑی اماں کی طرح حواس نہیں کھوئے تھے۔ چند منٹ کے بعد اس نے متعدد بار اس عمل کو دہرایا۔

"اب آہستہ آہستہ سانس لیں۔" اس کے نقاہت زدہ چہرے پہ موجود تکلیف کے آثار کو تکتے ہوئے اس نے نرمی و آہستگی سے کہا، اس کا تنفس بحال ہوتے دیکھ کر آئمہ نے بے اختیار گہرا سانس کھینچ کر لیتے ہوئے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے سینے سے آتی خرخر کی آواز بتدریج کم ہو کر بالکل ختم ہو چکی تھی۔ جسم ڈھیلا چھوڑے وہ بے دم سے انداز میں پڑا تھا۔

آئمہ نے پیچھے ہٹتے ہوئے ان ہیلر کا ڈھکنا لگانے کے بعد سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔ بڑی اماں اس کی پیشانی اور چہرے پہ بہتے پسینے کو صاف کرنے کے بعد بکھرے بالوں میں ہاتھ پھیرتی آنسو ضبط کر رہی تھیں، مگر شدید ضبط کے باوجود ان کے کانپتے ہوئے ہونٹ ان کے دل کی کیفیت اس پہ عیاں کر گئے۔

"ٹیک اٹ ایزی اماں اب یہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

اس نے پیچھے سے آ کر ان کے کاندھوں کو چھو کر تسلی سے نوازا، اور غیر ارادی طور پہ معید کی سمت دیکھا، بھیگی بڑھی ہوئی شیو، پیشانی پہ بکھرے بالوں اور ہلدی کی مانند زرد ہوتی ہوئی رنگت..... وہ آنکھیں موندے پرسکون لیٹا تھا، دراز خمیدہ پلکیں، بوجھل پپوٹوں کی خوبصورتی کو بڑھا رہی تھیں۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد چوڑا کڑیل جوان کس بے جان سے انداز میں بستر پہ ڈھیر تھا۔

"آخر کب تک سنبھالوں گی میں اسے، بوڑھی ہڈیوں میں اب اتنا دم نہیں کہ یہ کر پاؤں، تم نے دیکھا، گھبراہٹ و پریشانی نے کیسے ہاتھ پیر پھلا دیئے تھے میرے، اور یہ پتا نہیں کس سے بدلہ لے رہا ہے، خود سے یا مجھ سے، کہ میرے سامنے یوں موت کی دہلیز کو چھونے لگتا ہے۔ اسے جب بھی دمہ کا دورہ پڑتا ہے، یہ یونہی بے حس پڑا رہتا ہے۔ خود..... مشین کی مدد سے بھی سانس بحال کرنے کی کوشش نہیں کرتا، یہ تو چاہتا ہی یہی ہے کہ مجھ

سے پہلے قبر میں جا اترے، ایسا انوکھا نرالا دکھ تھا اسکا کہ یوں زندگی سے بے زار ہو گیا، ماں پہ رحم نہیں آتا۔"

وہ انہیں تھام کر باہر لائی تو بڑی اماں اس کے کاندھے پہ سر رکھ کے روتیں بے ربط سی باتیں کرتی چلی گئیں۔ جن میں سے کچھ اس کے پلے پڑا تھا اور کچھ سر کے اوپر سے گزر گیا وہ کیا کہتی چپ گم سم بیٹھی رہی۔

"کیا انہیں ایسا ہر بار ایسا ہی شدید اٹیک ہوتا ہے بڑی اماں۔"

خاصی دیر بعد اس نے سر اٹھایا تھا، انہیں قدرے سنبھلا ہوا پا کر آہستگی سے پوچھا۔

"اگر مجھے بروقت پتا چل جائے تو میں ایسا نہیں ہونے دیتی، ان ہیلر لگا دیتی ہوں۔ لیکن اگر مجھے پتا نہ چلے تو یونہی ہوتا ہے۔"

بے بسی کے آنسو ایک بار پھر گالوں پہ اتر آئے۔

"یہ ایسا کیوں کرتے ہیں بڑی اماں، کیا وجہ ہے کہ یہ زندگی سے بے زار ہو چکے ہیں۔" اسے بڑی اماں کی درد بھری داستان پہ واقعی بہت ہمدردی ہو رہی تھی۔

"سویرا کی وجہ سے، اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہنا چاہتا۔" انہوں نے ہچکی بھری۔

"ماں کی پرواہ نہیں۔"

"بڑی اماں یہ سویرا کون تھی۔" وہ اصل بات کی طرف آئی "اس کی بیوی تھی اس کے ہونے والے بچے کی ماں، بہت محبت کرتا تھا معید اس سے، بہت چاؤ سے بیاہ کر لایا تھا۔"

ان کے چہرے پہ دکھ کے سائے لرزنے لگے، وہ جیسے کہیں کھونے لگی تھیں۔

"پھر، پھر کیا ہوا تھا بڑی اماں۔"

اس نے ان کے ہاتھ پہ دباؤ ڈال کر توجہ حاصل کی۔

"پھر" انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"بہت خوش تھے دونوں، مگر ان کی خوشیوں کو نظر لگ گئی۔ سویرا مر گئی۔ معید نے اسے جلتے ہوئے دیکھا تھا اور اپنے حواس گنوا دیے تھے۔ پورے دو سال یہ مینٹل اسپتال میں زیر علاج رہا۔ اپنا سب کچھ گروی رکھ کے میں نے اس کا علاج کروایا تھا۔ مگر یہ ٹھیک ہونا ہی نہیں چاہتا تھا۔ دو سالوں میں اس کی تھوڑی ذہنی حالت تو ٹھیک ہو گئی، مگر وہاں سے نیا مرض لگ گیا تھا۔ دمہ کا مرض، اب بھی اسے کبھی کبھار دورہ پڑ جاتا ہے۔"

"بڑی اماں سویرا کیسے جلی تھی۔" اس کا ذہن اسی نقطے پہ ٹھہرا تھا بڑی اماں نے سرد آہ کھینچی تھی۔

"پتا نہیں بیٹی میں اس روز گھر پہ نہیں تھی، مجھے بس اتنا پتا چلا کہ اس روز سویرا کھانا پکانے کچن میں گئی تھی، چولہے کا برنر کھلا رہ گیا تھا۔ ماچس جلاتے ہی آگ بھڑک اٹھی۔ جو لمحوں میں اس کے کپڑوں کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔"

"کیا گھر پہ کوئی بھی نہیں تھا۔" اس نے متحیر نظروں سے انہیں دیکھا۔

"سب تھے، ملازم بھی تھے، مگر کوئی کچھ نہ کر سکا۔ معید آفس سے آیا تو سویرا بری طرح جھلس چکی تھی۔ اسپتال جاتے جاتے راستے میں دم توڑ دیا۔"

وہ اس وقت کی اذیت سوچ کر پھر سے سسکنے لگیں۔ آئمہ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ ان کے بہتے آنسو ہی صاف کر ڈالے۔

☆☆☆

"لائیں اماں آپ کے سر کا مساج کر دوں۔"

وہ پچھلے کئی دنوں سے مسلسل آ رہی تھی۔ آج انہیں سر میں تیل ڈالتے دیکھا تو اپنی خدمات پیش کر دیں۔

"ارے نہیں بچی تم تکلیف نہ کرو میں لگا رہی ہوں۔"

"ارے۔" وہ ذرا خفی "بڑی اماں تکلف مت برتا کریں۔"

"پتا ہے، میری مما کہتی ہیں، مجھ سے اچھا سر کا مساج اور کوئی نہیں کر سکتا۔ بہت سکون ہے میری انگلیوں کی نرم پوروں میں، آپ کو یقین آ جائے گا۔"

وہ ان کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بہت بے تکلفی سے بولی۔ بڑی اماں محض مسکرا دیں، وہ یونہی ان سے تکلف کی ہر دیوار گراتی جا رہی تھی وجہ وہ ہی احساس جرم تھا، وہ جب تک یہاں تھی، ان کی تنہائی دکھ اور افسردگی کے احساس کو کم تو نہیں البتہ بانٹ ضرور سکتی تھی۔

اسے اس بات کا ملال نہیں جاتا تھا کہ پھپھو کی فیملی کے متعلق جو کچھ اس نے محسوس کیا تھا وہ سب نا صرف بالکل سچ تھا بلکہ وہ لوگ تو بے حسی اور سنگدلی میں بہت آگے تک چلے گئے تھے جہاں سے واپسی بھی شاید ممکن نہیں تھی۔ ان کے دلوں پہ مہر لگ چکی تھی تو

آنکھوں پہ پردے آن گرے تھے۔

اس نے محض ان کی آزمائش کے طور پہ گھر کے تمام افراد کے سامنے بڑی اماں کی کسمپرسی، بے چارگی اور معید کی خطرناک بیماری کے متعلق بات شروع کی ہی تھی، کہ پھپھو کے نرم چہرے پہ ہر دم بسیرا کیے رکھنے والی مسکراہٹ یوں غائب ہوئی تھی جیسے کسی نے اچانک نوچ کر پھینک دی ہو۔ وہ سب لوگ کھانے کی ٹیبل پہ تھے۔ اس نے محسوس کیا ہر چہرے پہ تناؤ کے ساتھ تنفر اور تلخی بھی بکھری ہے۔ سب سے برا حال تو حسان کا ہوا تھا، اس کی پیشانی پہ شکنوں کا جال بکھرا تھا تو نتھنے پھولنے لگے تھے۔

"تعاون کریں وہ بھی اس عورت کے ساتھ جس کا اکھڑ، خود سر اور جنونی بیٹا ہمارے سروں پہ ننگی تلوار بن کر لٹکتا رہتا ہے۔ شکر کریں کہ ہم نے اسے گھر پہ پناہ دے رکھی ہے۔ ورنہ ہمارے گھر میں بھی جوان لڑکی ہے۔ اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ اس روز کی مثال تمہارے سامنے ہے۔"

حسان کو تو جیسے موقع ملا تھا۔ دل کی بھڑاس نکالنے کا، آئمہ تو بات کر کے پھنسی تھی۔

"آئی تھنک یہ گھر پھپھو چچا جان اور معید کے بابا کو ان کے والد صاحب کی طرف سے ورثے میں ملا ہوگا۔"

تب بھی پھپھو ان لوگوں کا آدھا حصہ تو بنتا ہوگا جبکہ وہ لوگ بد حالی کا شکار ہیں۔ اور آپ۔" وہ خائف نہیں ہوئی تھی، اور ہوتی بھی کیوں؟ حق بات کے لیے تو اسے اگر اپنے باپ کے سامنے بھی ڈٹنا پڑتا تو وہ پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس نے محسوس کیا پھوپھا اس کی بات سن کر چونکے ہیں، اور بہت گہری، مگر پر ستائش نظروں سے اسے دیکھا ہے۔ اتنے سارے افراد میں صرف وہی تھے جو اس سارے قصے سے لاتعلق اور بے نیاز کھانے میں مصروف تھے۔ مگر اب وہ بھی جیسے بھول گئے تھے کہ ابھی کچھ دیر قبل انہوں نے ڈش سے بریانی نکال کر بہت رغبت سے کھانا شروع کی تھی۔

"ہاں تھا اس گھر میں ان لوگوں کا بھی آدھا حصہ مگر اب نہیں ہے۔ تمہیں کچھ پتا نہیں تو کیوں انوالو ہو رہی ہو اس معاملے میں۔ بڑی اماں نے اپنے بیٹے کا علاج شہر کے مہنگے ترین اسپتال سے کروایا۔ دو سال موصوف ان کی خواہش اور کوشش پہ پانی پھیرتے رہے اور لاکھوں کی رقم اس مد میں ضائع ہوتی گئی۔ بڑی اماں نے اپنا حصہ حتیٰ کہ اپنے شیئرز تک

ڈیڈ سے نکلوا لیے۔ اب ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس گھر میں رہ رہے ہیں اسے بھی ہماری مہربانی سمجھو۔"

حسان بول نہیں رہا تھا غرا رہا تھا۔ آئمہ نے مزید کچھ نہیں کہا۔ ویسے بھی جو کچھ جاننے کی متمنی تھی، وہ جان گئی تھی۔ اس نے شکر منایا تھا کہ مما کے کہنے پہ اس نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ وہ حسان کے متعلق سوچے، وہ اچھا لڑکا ہے۔ وہ کیسا تھا، وہ اچھی طرح جان گئی تھی۔ صرف اسے ہی نہیں ان سب کو۔

"کہاں گم ہو بچی، تمہیں ہی پکار رہی ہوں۔"

بڑی اماں نے اس کے ہاتھ تھام کر کہا تب وہ چونکی تھی۔

"جی جی۔" وہ قدرے خفیف ہوئی۔

"کچھ نہیں۔"

"بیٹا بس کرو، تھک گئی ہوگی۔" انہوں نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ کر کہا تو اس کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

☆☆☆

اس نے سرف میں بھگوئے کپڑے نل کے سامنے رکھ کر کھنگالے اور اچھی طرح نچوڑ کر جھٹکنے کے بعد تار پہ پھیلا دیے۔ اپنے کام میں وہ اس حد تک مگن تھی کہ دروازے سے نکل کر باہر آتے معید حسن کو نہیں دیکھ سکی۔ جبکہ وہ اسے روبرو پا کے ٹھٹک کے رکا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے نگاہ کا زاویہ بدل کر بڑی اماں کو تلاشا، ناکامی کی صورت میں جھنجلا سا گیا۔

"اماں۔" وہ لب بھینچ کر زور سے چلایا تھا۔ تب آئمہ بے اختیار اٹھی۔

"آ، آپ۔" وہ اسے روبرو پاتے ہی حواس باختہ نظر آنے لگی۔

بڑی اماں کو بہت تیز بخار میں کپڑے دھوتے دیکھ کر اس نے زبردستی ہٹا دیا، چھینکتے ہوئے ان کی آنکھوں سے پانی مسلسل بہہ رہا تھا، اس نے چائے کے ساتھ دوا کھلا کر سونے بھیج دیا اور خود ادھورا کام نپٹاتے اس کے وجود کو یکسر فراموش کر چکی تھی۔ ایسا کئی بار ہوا تھا، وہ کئی گھنٹے اماں کے ساتھ گزار کر چلی بھی جاتی۔ اس سے کبھی سامنا ہی نہیں ہوا تھا، وہ اپنے کمرے سے نکلتا ہی نہیں تھا، اس وقت بھی یقیناً کوئی ضرورت باہر کھینچ لائی تھی۔ مگر آئمہ کا دم الجھنے لگا تھا اسے دیکھ کر، اگر اس روز کی طرح آج بھی...... وہ اس سے آگے سوچ کر

ہی لرز اٹھی۔

"اماں۔" وہ ایک بار پھر چیخا، اب کی مرتبہ آواز پہلے کی نسبت غصیلی تھی۔

"آہستہ" اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں، دوا کھا کر سوئی ہیں۔" اس نے تنبیہی انداز میں کہا تھا کہ اسے قدرے نارمل دیکھ کر حواس بحال ہونے لگے تھے۔ معید نے سرخ آنکھوں سے اسے گھورا، اور اس کی بات پہ دھیان دیے بغیر اماں کے کمرے کی سمت قدم بڑھائے ہی تھے کہ آئمہ لپک کر اس کے راستے میں آ گئی۔

"میں کیا کہہ رہی ہوں، آپ نے سنا نہیں۔"

اس پل غصے کی زیادتی میں رہا سہا خوف بھی جانے کہاں جا چھپا تھا، کہ اسے گھور کر ڈانٹنے کے انداز میں بولی مگر جواب میں معید نے جن سرخ آنکھوں سے اجنبیت اور بے گانگی سے اسے دیکھا تھا اس کے حواسوں پہ یکلخت خوف نے غلبہ پا کر اعصاب کو مفلوج کر دیا۔

"م میرا مطلب ہے آپ کو جو چاہیے مجھے بتا دیں۔"

اندر ہی اندر دہل کر دو قدم پیچھے ہٹی وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ وہ تو تھا ہی جنونی کسی بھی پل بپھر کر وحشی پن پہ اتر آتا تو...... اس نے چور نگاہ اس کے پتھر اور فولاد سے بنے آہنی وجود پہ ڈالی اور سہم سی گئی۔

معید نے اب کی مرتبہ بھی جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ البتہ ہاتھ سے اسے راستے سے ہٹایا اور اندر گھس گیا۔ آئمہ اس لمس کو بازو پہ محسوس کرتی گویا لمحوں میں سن پڑ گئی۔

"اماں چائے بنا کے دیں مجھے۔"

اس نے وہیں کھڑے کھڑے اس کی بوجھل آواز سنی تھی۔ اگلے چند لمحوں میں وہ اماں کے ساتھ باہر آ گیا تھا۔ لہجہ بے حس سرد اور لٹھ مار قسم کا تھا۔ اسے اس پل اس پہ بے تحاشا تاؤ آیا تھا جبھی لب بھینچے سلگتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی جبکہ وہ اسے نظر انداز کیے اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔

☆☆☆

مما ایک شاک کی سی حالت میں اس کے سامنے موجود تھیں۔ ان کی پھٹی پھٹی سی عاری سا کن آنکھیں اس کے چہرے پہ جانے کیا تلاشنا چاہ رہی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے تم اس وقت حواسوں میں نہیں ہو، ابھی تو گھر چلو وہیں جا کے بات ہو گی۔" اس نے ان کی آواز سنی تھی۔ تب اس نے سر اونچا کر کے انہیں دیکھا۔

"میں اپنے حواسوں میں ہوں، مما پلیز فار گاڈ سیک ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ می پلیز۔" وہ ملتجی ہوئی تھی۔

"آئمہ میں کیا سمجھوں اسے، تمہارا دماغ چل گیا ہے، آئی کانٹ بلیو اٹ۔" انہوں نے اپنا سر ہاتھوں پہ گراتے ہوئے تاسف سے کہا۔

"ایسا کیا انہونا کر دیا ہے مما میں نے، کہ آپ اس قدر ڈس ہارٹ ہو رہی ہیں۔" وہ اٹھ کر ان کے قریب آ گئی تھی۔

"تم ......" انہوں نے دانت پیسے تھے۔

"شکر کرو، میں نے تمہارے بابا سے تمہاری یہ فضول بات چھپائی ہے۔" وہ تلخ ہو گئیں۔

"مما......" اس نے نظریں اٹھا کر شاکی انداز میں انہیں دیکھا۔

"آپ کو یہ فضول بات لگتی ہے میری ہی نہیں کسی اور کی بھی پوری زندگی کا معاملہ ہے۔"

"ہم نے پوری دنیا کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا۔" وہ اکھڑے انداز میں بولیں۔

"مما یہ آپ کہہ رہی ہیں۔" اسے دکھ ہوا تھا۔

"تمہیں اندازہ نہیں ہے آئمہ کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" انہوں نے جیسے سر پیٹا تھا۔

"اس قسم کے فیصلے یوں اچانک اور جذباتیت میں نہیں کیے جاتے، ابھی تم گھر چلنے کی تیاری کرو، کیا کرنا ہے، یہ بعد کی باتیں ہیں۔"

مما رعونت بھرے انداز میں کہہ کر اٹھ گئیں، تب آئمہ نے تھکے ہوئے سے انداز میں سر تکیے پہ ڈال کر آنکھیں موند لیں۔ اسے تو خود اندازہ نہیں تھا یہ فیصلہ یوں اچانک کیسے ہو گیا کہ وہ اب ایک انچ بھی سرکنے پہ آمادہ نہیں تھی۔

کل، ماما، بابا کو ائیر پورٹ ریسیو کرنے کی خوشی میں تیاری اس نے صبح سے ہی شروع کر رکھی تھی۔ بارہ بجے کی فلائٹ تھی۔ گیارہ بجے ہی وہ مکمل تیاری کے ساتھ اپنے کمرے سے نکل کر آئی۔ کلائی پہ بندھی رسٹ واچ پہ ٹائم دیکھا، ابھی چند منٹ تھے، اس نے

پھپھو کے کمرے میں بھجا تھا، ان کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ وہ ٹہلنے کے انداز میں لان میں چلی آئی تھی۔ جب بالائی منزل سے اٹھتے شور پہ اچھا خاصا چونکی تھی۔ سعید کی چیخیں اور کسی چیز کی زوردار آواز وہ قطعی نہ سمجھی البتہ کسی گڑبڑ کا احساس بہت شدت سے ہوا تو سرپٹ بھاگی اوپر آئی تھی، مگر سیڑھیوں کے اختتام پہ ہی اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔

حسان ہاتھ میں بیلٹ لیے بالکل جانوروں کے سے انداز میں انتہائی بے دردی سے سعید کو پیٹ رہا تھا۔ آئمہ حیرت و صدمے کی زیادتی سے قوت گویائی کھو بیٹھی۔

''کیا سمجھتے ہو تم، سویا کی طرح آئمہ کو بھی چھین لو گے مجھ سے، تو یہ تمہارا غلط خیال ہے۔ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ بہت خوبصورت ہے نا تمہارا یہ جسم، یہ چہرہ، اسے بگاڑ کے رکھ دوں گا۔ اتنا بھیانک کہ تم خود کو بھی پہچان نہ سکو گے۔''

زوردار ٹھوکر سے اس نے سعید کو نیچے گرانے کے بعد......اس کے سینے پہ اپنا پاؤں جوتے سمیت رکھ دیا۔

''رک جاؤ حسان۔'' اس کا یہ نعرہ حسان کے ہاتھ میں موجود اس بوتل کو دیکھ کر تو نا تھا جس میں شاید نہیں یقیناً تیزاب تھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی بھاگی آئی تھی اور حسان، اسے غیر متوقع طور پہ اوپر پا کے حیرت کے جھٹکے سے نکل کر گھبراہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔

''تم۔'' اس نے اتھل پتھل ہوتی سانسوں اور بے ترتیب ڈولتی دھڑکنوں کو سنبھالتے متاسف نظروں سے اسے دیکھا۔

''آئی ہیٹ یو، تم چاہتے تھے نا کہ میں تم سے محبت کروں مگر میں، میں تم سے نفرت کرتی ہوں، سنا تم نے، اسے پاگل ثابت کر کے مینٹل اسپتال چھوڑ کر آنا چاہتے ہو، حالانکہ وہاں اسے نہیں تمہیں جانا چاہیے۔''

''تم غلط بھی ہو میں۔'' وہ اس کے جارحانہ تیوروں کی تاب نہ لاتے ہوئے بوکھلا کر بھونڈا سا جواز ڈھونڈ نہ پاتا تھا، کہ آئمہ کا ضبط پارہ پارہ ہو کر چھلک گیا۔

''شٹ اپ۔'' اس کا یہ صاف جھوٹ اسے آتش فشاں بنا گیا تھا۔

''کہیں نہیں جائے گا یہ، یہیں رہے گا ہمیشہ، نا ڈ گیٹ لاسٹ فرام ہئیر۔''

وہ لفظ چبا کر بولی تو حسان تلخ و ترش نظروں سے اسے دیکھتا، جھٹکے سے مڑ کر چلا

گیا تھا۔ اور وہ، پھولی سانسوں کو سنبھالتی، بڑی اماں کی حیران مگر ممنون نظروں سے نگاہ چراتی، جھک کر لہولہان ہوئے سعید کو دھندلائی ہوئی نظروں سے تکتی، سہارے کو اپنا ہاتھ اس کی سمت بڑھا گئی، وہ جو بری طرح سے ہانپتا ہوا کچھ تحیر کچھ غیر یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا، لب بھینچے ہوئے نگاہ کا زاویہ بدل گیا۔ آئمہ کے اندر عجیب سی تھکن اتر آئی۔ بڑی اماں اسے اندر چھوڑ کر خاصی دیر بعد لوٹیں، جب بھی وہ دونوں ہاتھوں پہ سر گرائے وہیں چارپائی پہ بیٹھی تھی۔

''شکریہ میری بچی، تمہارے آج کے اس احسان نے مجھے بن مول خرید لیا، اگر تم نہ آتیں تو وہ ظالم، میرے بیٹے کو مار ڈالتا۔''

وہ سسک اٹھی تھیں۔ آئمہ نے اپنا ہاتھ ان کے کاندھے پہ رکھ دیا تھا۔ پھر اٹھتے ہوئے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

''اماں، میں سعید سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ آج بابا اور ماما آ رہے ہیں۔ آپ پلیز انہیں پرپوزل دے دیجیے گا۔''

انہیں ششدر چھوڑ کر وہ پلٹ کر دیکھے بنا چلی آئی تھی۔ اور اسے پورا یقین تھا اسکا فیصلہ ہرگز غلط نہیں تھا۔ اب اسے یہی یقین ماما کو بھی دلانا تھا۔

☆☆☆

ڈھلتا ہوا سورج دھیرے دھیرے مغرب کی جانب محو سفر تھا، پورے افق پہ نارنجی رنگ پھیلتا جا رہا تھا۔ آسمان پہ کہیں کہیں سیاہ بادل تھے، جو ہوا کے زور پہ اڑتے پھرتے بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ فضا میں چڑیوں کی چہچہاہٹ بہت واضح سنائی دے رہی تھی۔

جب آئمہ نے آخری سیڑھی سے دروازہ دھکیل کر صحن میں قدم رکھا۔ بڑی اماں آنگن کے کونے پہ موجود نل سے کپڑا بھگو بھگو کر صحن کے فرش کو صاف کر چکی تھیں۔ صاف ستھرے فرش پہ خفیف سی نمی تھی، جو پچھلے پہر کی ہوا سے بہت تیزی سے جذب ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے سب کچھ ماما کو کھول کر بتایا تھا، ساتھ ہی اپنا فیصلہ بھی، اس نے وہ انتہائی قدم اٹھا لیا تھا، جس کے بعد اس کا خیال تھا، اس کام میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔

اس نے ماما سے کہہ ڈالا تھا، ان کے نہ ماننے کی صورت میں بھی اسے شادی سعید سے ہی کرنی ہے۔ اس لیے نہیں، کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی، اس لیے کہ سعید کی زندگی کے لیے اس کا ہونا ضروری تھا۔ بعض فیصلے خوشی میں نہیں مجبوری میں کیے جاتے ہیں۔

مگر پھر بھی کوئی تسلی نہیں دیتے۔

وہ بھی مطمئن تھی، من مانی کر کے مما نے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا تھا، اور اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ انہوں نے بابا سے کیا بات کی، کس انداز میں کی، کہ وہ اس کی مرضی کا فیصلہ کر گئے تھے۔ مگر معید نے انکار کر دیا تھا۔

"اب بتاؤ کیا کرو گی تم۔" کتنا تمسخر تھا مما کی نظروں میں، ان کے لہجے میں، اور اب وہ یہاں تھی، معید حسن سے بات کرنے کے لیے، بڑی اماں نے اسے معید کے کمرے میں جاتے دیکھا، اور رنجیدگی سے سر جھکا لیا، وہ دستک دینے کے بعد اندر داخل ہو گئی۔ معید دیوار کی جانب منہ کیے جانے سو رہا تھا، یونہی لیٹا تھا، وہ ٹھٹکی نہیں اور چکر کاٹ کر عین اس کے سامنے دیوار سے ٹیک لگا لی۔

"تم۔" وہ اسے دیکھ کر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

"ہاں، انکار کی وجہ پوچھنے آئی ہوں۔"

"دس از مائی پرسنل میٹر۔" سرخ آنکھوں سے دانت پیس کر کہتا وہ اسے جانے کیا جتانا چاہتا تھا۔ آئمہ نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

"مگر اب یہ صرف آپ کی پرسنل نہیں رہ گئی، میری ذات اس میں انوالو ہو چکی۔" جوابا اسکا لہجہ ٹھنڈا تھا۔

"آئی تھنک یہ حق ہر کسی کے پاس ہوتا ہے۔ انکار اور اقرار کا حق۔"

وہ جوابا قہر بار نظروں سے اسے گھورنے لگا۔ آئمہ نے بہت گہری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ کیا اس وقت اس کے نارمل انداز دیکھکر کوئی کہہ سکتا تھا، وہ کبھی وحشی جنونی بھی ہوتا ہوگا۔

"اگر آپ حسان کو انکار کر سکتی ہیں۔ تو میں آپ کو کیوں نہیں کر سکتا۔"

"اوہ آئی سی۔" وہ جیسے لمحے کے ہزارویں حصے میں معاملے کی تہہ تک جا پہنچی۔

"تو اس کا مطلب، آپ حسان سے ڈرتے ہیں، چچ چچ، ایسا شیر جیسا اونچا پورا وجود اور دل چڑیا جتنا۔" وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر ہنسی گویا اس کا ضبط آزما رہی تھی۔

"شٹ اپ۔" وہ پوری قوت صرف کر کے دھاڑا تھا، پورے وجود کا خون جیسے اس پل اس کے چہرے اور آنکھوں میں سمٹ آیا، تیز ہوتے تنفس سمیت لب بھینچے وہ جیسے

ضبط کے کڑے مراحل طے کر رہا تھا وہ دھیرے دھیرے چلتی اس کے قدموں میں دو زانو ہو کر بیٹھ گئی، اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پہ رکھ دیے، وہ چونکا تھا۔ آئمہ نے محسوس کیا اس کی اس حرکت پہ وہ بری طرح سے جز بز ہوا ہے۔

"سویرا پہ آکے زندگی ختم نہیں ہوتی معید، اپنا نہیں تو اماں کا خیال کر لیں، پھر تھوڑا سا میرا، جو آپ سے محبت کرنے لگی ہے۔"

وہ اٹک اٹک کر کہہ گئی، معید جو اس درجہ قربت پہ ہق دق سا بیٹھا بالکل بے حس و حرکت تھا، یہ سنتے ہی طیش میں آتے ہوئے اس کے ہاتھ اپنے گھٹنوں سے جھٹک دیے تھے۔

"بہت ہو چکی فضول باتیں، اب جائیں یہاں سے۔"

بہت انسلٹنگ انداز تھا۔ آئمہ کو اپنی پیشانی سلگتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"نہیں جاؤں گی، اس کے باوجود کہ آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ میں نے مما سے کہہ دیا تھا، میں صرف آپ سے شادی کروں گی۔"

اس کے لہجے میں دھونس تھی، گھن گرج کے ساتھ بھرپور ہٹ دھرمی تھی۔

"جب میں آپ سے شادی نہیں کروں گا تو آپ کے والدین لازما آپ کی کہیں اور شادی کر دیں گے۔" دوسری طرف حد درجہ اطمینان کی کیفیت تھی جو آئمہ کو سلگا گئی۔

"آپ انسلٹ کر رہے ہیں میری، ٹھیک ہے، آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں، ضد پہ اڑے رہیں، میں بھی آئمہ ہوں، آپ مجھے جانتے نہیں، اس کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لوں گی، سویرا کو مرتے دیکھ کر تو آپ نے دو سالوں تک حواس گنوائے رکھے تھے، مجھے مار کر ہمیشہ سکون کو ترسیں گے۔"

بے تحاشا روتے ہوئے کہتی وہ خطرناک ارادے سے بالکونی کی سمت بھاگی تو معید جو ہونق سا اسکی بات سن رہا تھا، بے اختیار چیخا تھا۔

☆☆☆

"بابا کیا آپ مجھ سے خفا ہیں۔"

ڈیپ ریڈ نگے کام کے جدید تراش خراش کے سوٹ میں سر پہ دوپٹہ اوڑھے وہ روئی روئی آنکھیں لیے ان کے روبرو تھی، ابھی کچھ دیر قبل نکاح کی سنت ادا ہوئی تھی، سارا اہتمام پھوپھا جان نے کیا تھا، وہ ہر کام میں پیش پیش رہے تھے۔ آئمہ نے انہیں اتنا خوش

مطمئن اور آسودہ پہلی بار محسوس کیا تھا، جبکہ پھپھو اور ان کی اولاد کے منہ بنے ہوئے تھے۔ حسان تو سرے سے ہی غائب تھا۔

"ارے بابا کی جان، آپ کو یہ کیوں لگا کہ بابا آپ سے خفا ہیں، بابا تو اپنی بیٹی کی اعلا ظرفی اور بہترین فیصلے سے خوش ہوئے، اگر بھائی جان مجھے ساری حقیقت نہ بتاتے تو شاید میں غلط فہمی کا شکار رہتا، تمہاری مما کی طرح۔"

انہوں نے کچھ فاصلے پہ خاموش گم سم بیٹھی مما پہ شوخ نگاہ ڈالی تو آئمہ کے دل سے بہت بڑا بوجھ سرک گیا تھا۔ اس نے کھانا مما کے ساتھ ہی کھایا تھا۔ اس طرح وہ گویا ایک موقع چاہ رہی تھی اپنی صفائی کا۔

"آپ ابھی تک مجھے غلط سمجھ رہی ہیں مما۔"

اس نے آہستگی سے نظریں اٹھائی تھیں۔ ٹپ ٹپ، مما کی آنکھوں سے بہتے آنسو اسے شاکڈ کر گئے، وہ بے قرار سی ہوئی تھی۔

"ایک ہی اولاد تھیں تم میری، کیوں لیا یہ رسک، رسک ہی تو ہے، کتنا روکنا چاہا تمہیں ہر طرح، مگر تم آئمہ تمہاری دادو کو بھی اچھا تھا، محض ایک سال ہی تھیں۔ یہ تو پھر......"

"مما پلیز۔"

اس نے ٹوکا۔

"محبت الگ بات ہے مگر محض ہمدردی میں لیا گیا یہ بولڈ اسٹیپ تمہیں پچھتاوے میں مبتلا کر دے، تو بتاؤ کیا حل ہوگا۔" انہوں نے اس کی التجا پہ جیسے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

"میری زندگی کسی کے کام آجائے، مجھے اس سے بڑھ کر کوئی حاجت نہیں۔"

"مگر ہم، ہمارا کیا سوچا۔" وہ تڑپ گئیں۔

"مما، بابا بھی تو ہیں انہوں نے آپ کی طرح ری ایکٹ نہیں کیا۔"

"باپ اور ماں میں یہی فرق ہے۔" وہ سسکیں۔

"کیا کمی ہے معید میں، اچھا نا قابل علاج نہیں ہے مما، معید اپنا خیال نہیں رکھتے تھے۔ اب میں انہیں زندگی کی طرف لاؤں گی۔ انہیں زندگی سے محبت کرنا سکھاؤں گی مما، وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

وہ پر امید تھی، مما اسے دیکھ کر ٹھنڈا سانس کھینچ کر رہ گئیں۔

"ٹھیک ہے، اکلوتی اولاد کا جو ایڈوانٹیج ہوا کرتا ہے، وہ تم نے وصول کر لیا، اب کچھ ہماری بھی مان لو، معید کو لے کر ہمارے ساتھ چلو، یہاں تمہیں تنہا چھوڑنا مجھے بالکل مناسب نہیں لگ رہا ہے، ان لوگوں کے تیور مجھے اچھے نہیں لگتے، معید کی پہلی بیوی کے متعلق بھی بہت افواہیں سننے کو ملی ہیں، وہ حادثہ نہیں تھا، اس کے خلاف سازش کی گئی تھی، میں یونہی تو تمہیں نہیں روک رہی تھی۔" وہ ایک بار پھر خدشات کے حصار میں گھرنے لگیں۔

"مما پلیز۔" وہ مسکرائی تھی۔

"کسی کے خوف سے اپنا مقام چھوڑ دینا، بزدلوں کی عادت ہے، میں بزدل نہیں ہوں، ہم آئیں گے آپ سے ملنے، جلد۔"

"ہم کون۔" وہ بے خیالی میں بولیں۔

"میں اور معید۔" اس کی ستاروں کی مانند چمکتی آنکھوں میں جگنو جھلملائے، مما اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

☆☆☆

"مجھے اپنے بستر کے سوا کہیں نیند نہیں آتی، سو پلیز بیڈ سے اٹھ جاؤ۔"

پچھلے چند منٹ سے وہ کمرے میں موجود تھا، اور صوفے پہ بیٹھا کسی سوچ میں گم، بڑی اماں ابھی کچھ دیر پہلے اسے یہاں بٹھا کے گئی تھیں، کہ کچھ دیر بعد ہی وہ بھی آ گیا تھا۔

آئمہ اس کے کچھ کہنے کی منتظر تھی بے نظر اٹھا کر اسے دیکھ رہی تھی، کہ وہ لبوں پہ لگی مہر توڑ کر بولا بھی تھا تو کیا، اس کی جان جل کر رہ گئی۔ جی تو چاہا تھا۔ جواب میں کچھ کھری کھری سنا کر اکڑا ہوا دماغ ٹھکانے لے آئے مگر فطری حجاب اور جھجک آڑے آ گئی، لباس سمیٹ کر وہ نیچے اتری، تو کلائی میں تنگ چوڑیاں جلترنگ بجا اٹھیں، معید نے نظر اٹھا کر اس کی مرمریں کلائی میں تنگ سرخ اور سنہری چوڑیوں کو گھورا تھا۔

"براہ کرم انہیں اتار دیں، ان کی آواز سے ڈسٹربنس ہوتی ہے۔" خشک سے انداز میں کہتا وہ اٹھ کر بستر پہ براجمان ہو چکا تھا، جانے کیوں آئمہ کی آنکھیں یکلخت بھیگ گئی تھیں۔ اتنی بے قدری اسے لگا وہ پہلے ہی قدم پہ تھکنے لگی ہے۔ دوپٹہ اتار کر پھینکا اور ایک ایک کر کے تمام زیور نوچ ڈالے، چوڑیاں اتارتے ہوئے غصے و طیش کے عالم میں بے احتیاطی میں چوڑی ٹوٹ کر اس کی کلائی اور ہاتھ کو زخمی کر گئی، اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے

وہ دھیا ہاتھ پہ ابھرتی خون کی بوندوں کو دیکھا، اور لب بھینچ لیے، بیڈ سے تکیہ اٹھانے جھکی، وہ بہت گہری نظروں سے متوجہ تھا۔ آئمہ کے اندر خون کھول کر رہ گیا۔ تکیہ نیچے دری پہ پٹخ کر وہ گرنے کے انداز میں لیٹی تھی۔ آنکھوں پہ بازو رکھتے ہی آنسو بے آواز بہتے چلے گئے۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ کسی جھنجھوڑ کر جگانے پہ کھلی تھی، سرخ دکھتی آنکھوں کو اٹھا کر دیکھا، وہ بیڈ سے نیچے جھکا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"بھنک پی رکھی ہے، اماں کب سے دستک دے رہی ہیں، اٹھ کر کھولو۔" وہ جھنجھلا کر بولا۔

"خود کھول لیں، آپ کی ٹانگیں بھی سلامت ہیں اور ہاتھ بھی۔"

کروٹ بدل کر تکیے میں منہ دینے سے قبل اس نے ترو تھے پن سے کہا، تو معید صفاچٹ جواب پہ ہونق سا ہو گیا، مگر دوسرے ہی لمحے تلملائے ہوئے انداز میں ایک بار پھر اس کی بانہہ پکڑ کر مروڑتے ہوئے زبردستی توجہ حاصل کر لی تھی۔

"میرے ہاتھ پیر سلامت ہیں۔ کھول سکتا ہوں دروازہ، مگر تمہارے اس شاباش بستر کا اماں پہ کیا امیج پڑے گا اندازہ ہے، اٹھو یہاں سے۔"

اس کی آنکھوں سے برہمی مترشح تھی آئمہ سلگ کر رہ گئی۔

"جواز آپ کے پاس ہے تو سہی۔" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ اس نے دانت پیسے، اور ایک جھٹک سے ہاتھ چھوڑ دیا۔

"اٹھو گی، یا پھر میں اپنی ہاتھوں پیروں کا استعمال کرتے ہوئے اٹھا کر بیڈ پر منتقل کروں۔" وہ بھرپور غصیلے انداز میں گویا ہوا تھا۔ آئمہ نے گھبرا کر اٹھنے میں عافیت جانی، اس کے گال جانے کیوں تپ اٹھے تھے، وہ طنزیہ نظروں سے اسے دیکھتا دروازے کی طرف بڑھا، تب آئمہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے واش روم میں جا گھسی تھی۔

☆☆☆

"اماں ایک بات پوچھوں آپ سے۔" اماں نماز سے فراغت کے بعد بستر پہ آ کے بیٹھی ہی تھیں جب ان نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں پوچھو بیٹا، اس میں اجازت کی کیا ضرورت ہے۔"

تکیے کے نیچے تسبیح ٹٹولتے ان کے ہاتھ لحظہ بھر کو رکے۔

"اماں سویرا اور معید کی شادی سے قبل کیا حسان، سویرا کو جانتا تھا۔"

اس نے گھبرا کر وضاحت پیش کی کہ اماں کی خاموش نگاہوں کو خود پہ اٹھتے دیکھ کر وہ اپنا اعتماد متزلزل محسوس کرنے لگی تھی۔

"ہاں وہ حسان کی کلاس فیلو تھی، دونوں ساتھ پڑھتے تھے اور ہو سکتا ہے، ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہوں ان دنوں معید باہر سے پڑھ کر لوٹا تھا، اور اپنے باپ کا بزنس سنبھال رہا تھا۔ سچ بات ہے، کہ مجھے سویرا کے دل کی خبر نہیں کہ اس کے دل میں حسان کے لیے کیا تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ حسان سویرا کو پسند کرتا تھا۔ بے حد، صرف یہی نہیں وہ اس سے شادی کا بھی خواہاں تھا مگر سویرا معید کی ذات میں انوالو ہو گئی تھی۔ اسے معید کی خوبصورتی اور مردانہ وجاہت سے بڑھ کر اس کی ذات کا اعتماد اور بے نیازی زیادہ بھائی تھی۔"

وہ بالکل تمہاری طرح تھی، معصوم، بے ریا اور دلکش، معید تک پہنچنے کے لیے اس نے مجھے ذریعہ بنایا تھا، اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ معید سے محبت کرنے لگی ہے۔ پہلے پہل معید نے اس پر خاص توجہ نہیں دی تھی۔ مگر پھر وہ بھی اسے پسند کرنے لگا، وہ اس بات سے بے خبر تھا، کہ حسان سویرا کو پسند کرتا ہے۔ میرا بیٹا جتنا انا پرور تھا، اس سے بڑھ کر اصولوں کا پابند، مجھے پورا یقین تھا، کہ اگر اسے حسان کی سویرا میں انوالومنٹ کا ذرہ سا بھی شک ہوتا تو یقیناً وہ سویرا کی جانب کبھی نہ بڑھتا، یا پھر اس کی پیش رفت کو وہیں روک دیتا، اس پہ یہ انکشاف شادی کے بعد ہوا تھا۔ وہ بھی تب جب حسان دو ماہ کے بعد واپس آیا تھا۔

ان دنوں ایگزامز کے بعد چھٹیاں تھیں، اور حسان اپنے پاپا کے ساتھ لندن چلا گیا تھا۔ سویرا بھی یقیناً اس سے خائف تھی، جبھی اس نے شادی کے لیے ایسے دنوں کا انتخاب کیا تھا، جب وہ نہیں تھا، آنے کے بعد اس نے بہت شور مچایا تھا، مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے بھی چپ ہونا پڑا مگر اس کی یہ چپ کسی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو گی کسی کو بھی خبر نہیں تھی، میرے بیٹے کو اسی کی آہ لگ گئی تھی۔ دونوں چھ ماہ بھی ساتھ نہ رہ پائے تھے، کہ سویرا کو وہ حادثہ پیش آ گیا۔ سویرا کی موت اس قدر اچانک تھی، کہ اس حادثے نے مجھے ہفتوں، مہینوں حواس باختہ رکھا تھا۔ اس پہ معید کی تشویشناک حد تک بگڑتی ہوئی حالت نے میرے تو ہاتھ پیر پھولنے لگے تھے۔

انہوں نے اس وقت کا تصور کر کے ہی جھرجھری لی تھی۔اسے چونکانے کا باعث معید کی پکار تھی اس نے چونکتے ہوئے پلٹ کر دیکھا وہ دہلیز پہ ایسے تاثرات لیے کھڑا تھا کہ آمنہ کو اپنا دم الجھتا محسوس ہوا۔

''اماں، پلیز مجھے کھانے کو لادیں۔'' اس پہ تیز نگاہ ڈال کر کہتا، وہ جیسے بنا آہٹ کے آیا تھا ویسے ہی پلٹ کر چلا گیا۔

''آپ رہنے دیں اماں، میں جاتی ہوں۔'' ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتی وہ کہتے ہوئے اٹھ گئی تھی، اماں مسکرا کر پھر سے تسبیح کی سمت متوجہ ہو گئیں۔

☆☆☆

''آمنہ جاگ رہی ہو پتر۔'' وہ خالی ذہن لیے ستاروں کی جھرمٹ میں بڑی شان سے ایستادہ چاند کو تک رہی تھی، جب بڑی اماں کی آواز پہ چونکے بنا انہیں دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے، نیند نہیں آ رہی۔'' انہوں نے پائنتی سے کہتے ہوئے اس کے الجھے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''بس یونہی۔'' وہ آہستگی سے کہہ کر ان کی گود میں منہ چھپا گئی۔دل تو گھبرایا ہوا تھا ہی آنکھیں بھی برس پڑیں۔

گزشتہ رات معید کو ایک بار پھر دورہ پڑا تھا، اور یہ دورہ اس قدر شدید تھا، کہ اس کے ہاتھ پیر مڑ گئے تھے۔آمنہ کی تو جان نکل گئی تھی۔بڑی اماں نے ہی اسے سنبھالا۔مخصوص آیات پڑھ کر دم کیا تھا۔دم کیے ہوئے پانی کو اسے پلاتے وہ مسلسل رو بھی رہی تھیں۔مگر آمنہ کی تو حالت ہی غیر ہو گئی تھی۔

معید کی خطرناک حد تک سفید پڑتی رنگت، لہو رنگ آنکھیں، اس پہ اس کی ہذیانی چیخیں، اور بے قابو بکھرا ہوا انداز، وہ دیوار سے لگی تھر تھر کانپتی پھوٹ پھوٹ کر روتی، خود کو ملامت کرتی رہی تھی۔سارا قصور اس کا ہی تھا۔اگر وہ اسے ڈس ہارٹ نہ کرتی، تو شاید وہ بھی یوں ابنارمل نہ ہوتا۔

سارا دن بارش برستی رہی تھی۔آمنہ جو کھڑکی سے بارش کو تکتے چائے کا لطف اٹھا رہی تھی، جانے کیا دل میں سمائی اٹھ کر آنگن میں آ گئی۔اماں عشاء کی نماز میں مشغول تھیں۔ورنہ اسے یوں بدلتے خنک موسم کی بارش میں کبھی بھیگنے کی اجازت نہ دیتیں، من تن میں

جیسے کوئی آگ بھڑک رہی تھی، جیسے ٹھنڈا کرنے وہ خاصی دیر تک بارش میں بھیگتی رہی تھی۔اندر جانے کا خیال اس وقت آیا، جب لائٹ بند ہوئی تھی۔اندھوں کی طرح جو لباس ہاتھ لگا، پہن کر وہ بیڈ کے سرہانے آ کر تکیہ اٹھانے کو جھکی تھی، جب اس کا ہاتھ معید کے پُرحدت سینے سے ٹکرایا تھا، گھبرا کر ہاتھ کھینچ لینا چاہتی تھی، مگر معید نے اس سے قبل ہی صرف اس کی کلائی ہی نہیں پورے کے پورے وجود پہ گرفت سخت کرتے ہوئے اپنی پُرحدت پناہ میں سمیٹ لیا۔

''اٹس او کے ٹیک اٹ ایزی۔'' اس کے سرگوشیانہ لہجے کے خمار پہ وہ پوری جان سے سلگی، اس جسارت پہ آگ بگولہ ہی تو ہو گئی تھی۔

''کس کے دھوکے میں مجھے چھوا آپ نے، میں سویرا نہیں ہوں۔''

اسے ساری زندگی کا غصہ انہیں لمحوں میں آیا تھا، اتنی ہی ارزاں اور بے مایا تھی اس کی ذات، کہ اتنے دنوں کی نظر اندازی، اور بے نیازی، کے بعد آج محض چند لمحوں کے جذبات کی شوریدہ سری کی نذر ہو جاتی۔

''آئی نو، کہ تم آمنہ ہو۔'' وہ اس کے نم بال سہلا کر یقیناً مسکرایا تھا۔

''تو پھر چھوڑیں مجھے، آپ کی زندگی میں تو سویرا کے سوا اور کسی کی کوئی جگہ نہیں تھی نا، پھر مجھے کیا سمجھ رہے ہیں، وقتی تسکین کا سامان۔''

اس کی آنچ دیتی قربت میں وہ سلگ کر انگارے کی طرح چٹختی ہوئی چلائی، معید لمحے بھر کو ساکن ہوا تھا، اگلے ہی لمحے وہ اسے چھوڑ کر الگ ہو گیا تھا۔آمنہ جلتی کڑھتی، گہرے گہرے سانس کھینچتی، اپنے طیش پہ قابو پاتی رہی تھی۔بیڈ سے اترتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا، جس طرح لائٹ اچانک گئی تھی۔ویسے ہی آ بھی گئی تھی۔مگر اس کے دل کی دنیا اس مختصر دورانیے میں تہہ و بالا ہو چکی تھی۔وہ تکیے میں منہ دیے ساکت لیٹا تھا۔وہ لب بھینچتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔

اس نے کہا تھا وہ سویرا کی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتا۔مگر اس نے سویرا کی جگہ اسے دینا چاہی تھی وہ اپنی بات بھول رہا تھا یا پھر وہ اس زندگی سے تھک کر اب جینے کا صحیح معنوں میں خواہش مند تھا، مگر آمنہ کو اپنی انسلٹ یاد آ گئی تھی، اور اب پچھتاوے کے ناگ نے اسے ڈسا تھا، اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔اماں نے بتایا تھا، اس دورے کے بعد وہ کئی دنوں نارمل نہیں ہو پاتا، کبھی کبھار ہفتوں میں لگ جاتے، جبکہ وہ چند دنوں سے

بہت نارمل نظر آنے لگا تھا۔ ہر وقت اپنے کمرے میں گھسنے کی بجائے، آئمہ نے اسے بالکونی، آنگن میں چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ اب وہ کھانا اکیلے کھانے کی بجائے اماں کے ساتھ بھی کھا لیا کرتا تھا۔ اور پرسوں اماں کی اس وقت خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی، جب وہ نہا دھو کر دھلے ہوئے صاف کپڑے پہنے باہر آیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو۔" اماں نے اسے دروازے کی سمت جاتے دیکھ کر ٹوک لیا تھا۔

"ذرا مارکیٹ تک جا رہا ہوں، آپ کو کچھ منگوانا ہے۔"

کتنا ذمہ دارانہ انداز تھا، اور اس سے بڑھ کر نارمل۔

"نہیں کچھ نہیں، البتہ یہ اپنی مشین ساتھ لے جاؤ۔"

انہوں نے چار پائی کے سرہانے پڑا ان ہیلر اٹھا کر اسے تھما دیا۔ وہ ہلکا سا مسکرا کر ان ہیلر لیے چلا گیا تھا۔ اس کے بعد آئمہ شام کو جب کسی کام سے کمرے میں آئی تھی، تب اسے سانس اکھڑنے پر ان ہیلر کو یوز کرتے دیکھ کر، اس کا حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی سے بھی برا حال تھا، جب یہی بات اس نے اماں کو بتائی، تو انہوں نے شانت ہوتے ہوئے اسے گلے لگا کر چوم لیا تھا۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہے میری جان، صرف تمہاری وجہ سے۔"

اور وہ کیسے نئے انوکھے سے احساسات میں گھر گئی تھی، کتنے خوش آئند خیال تھے، جنہوں نے اسے مسکرانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ مگر اس نے اپنے ہاتھوں اپنی حماقت سے خود پہ کھلتے خوشی اور زندگی کے دروازوں کو ٹھوکر سے بند کرنا چاہا تھا۔ وہ اتنی احمق، اتنی بے وقوف کیوں ہو گئی تھی۔

آنکھوں سے نمکین پانی چھلکا تھا۔ اماں اسے چھوڑ کر تیزی سے اندر گئیں تو جانے کیوں یکایک اس کا جی بھی گھبرا سا گیا، گھبراہٹ میں دوپٹہ پاؤں سے الجھ کر راستے میں گر گیا۔ مگر اس نے پروا نہیں کی تھی۔ وہ اندر آئی، تو بڑی اماں کو پریشانی کے عالم میں مختلف چیزیں ہٹا کر کچھ ڈھونڈتے پایا، تکیہ، چادر، بستر، یہاں تک کہ انہوں نے الماری بھی کھول کر تمام کپڑے الٹ پلٹ کر دیے۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہیں۔" اماں کی گھبراہٹ و سراسیمگی میں بتدریج اضافہ ہوتے دیکھ کر اس نے الجھ کر پوچھا تھا۔

"معید کا ان ہیلر نہیں مل رہا، شام کو یہاں تھا، میں نے خود دیکھا تھا۔"

انہوں نے سائیڈ ٹیبل پہ پڑی دواؤں کی شیشیوں کی جانب اشارہ کیا، اس نے کچھ تشویش میں گھر کر گردن موڑتے ہوئے معید کو دیکھا، تو اسے کھانستے پا کر اس کی تشویش بڑھ گئی، کھانسی کے ساتھ ساتھ اس کے سینے سے خرخر کی وہ مخصوص آواز بھی سنائی دینے لگی تھی، جو اس دورے کے آغاز کے ساتھ ہی کھانسی کے ساتھ شروع ہو جاتی تھی۔

"آپ ٹیبل میں دیکھتی ہوں۔" ٹیبل کے اوپر نیچے اچھی طرح دیکھ کر تسلی کر لینے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر بڑی اماں کو بتایا تھا۔ مگر ان ہیلر نہ ملا، معید کا سانس اب رک رک کر چلنے لگا تھا، اور جسم کو لگنے والے جھٹکے بڑھتے جا رہے تھے۔ اس کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی۔

"اماں، ان ہیلر کہیں نہیں ہے۔" ہاتھ، پیروں میں ہوتی سنسناہٹ سمیت اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں اطلاع دی، اماں کا اب تک ضبط جواب دے گیا تھا، وہ پورا کمرہ تلپٹ کر چکی تھیں۔ معید کی رنگت خطرناک حد تک زرد پڑ چکی تھی، اور پھر یکلخت نیلی پڑنے لگی، اس کا ہاتھ اپنی گردن پہ گیا تھا۔ وہ بے قراری سے اپنے سینے کو مسل رہا تھا۔ بڑی اماں تو حوصلہ ہارتے ہوئے زور زور سے رونا شروع کر چکی تھیں۔ خود آئمہ کی بھی جان ہوا ہوتی جا رہی تھی۔ معید کے ناخنوں اور ہونٹوں کے بدلتے رنگ کو دیکھ کر وہ بے جان ہونے لگی۔

خوف کے شدید احساس نے اس کا رگوں میں خون منجمد کر ڈالا، اس کی پسلیوں کے درمیان سے جلد کھنچ رہی تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ موت کے نزدیک ہوا جا رہا تھا اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکی تھیں۔ رات کے بارہ بجے مارکیٹیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ بہادری کا مظاہرہ کرنا چاہتی بھی تو مارکیٹ سے ان ہیلر نہیں لا سکتی تھی۔ اسے ایک دم سے بہت شدید کھانسی شروع ہوئی تھی۔ یہ آخری نشانی تھی اب بھی اگر اسے ان ہیلر نہ ملا تو یقینا وہ مر جاتا۔

"اللہ جی۔" وہ منہ ہاتھ رکھے زور سے چیخی وہیں گھٹنوں کے بل گر سی گئی تھی۔ اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ معا اس کی نگاہ ساکت ہوئی تھی۔ بیڈ کے نیچے ان ہیلر پڑا اسے نظر آیا تھا اس کا دل پوری قوت سے اچھل کر سکڑا۔ اگلے ہی لمحے اس نے بجلی کی سی تیزی سے جھپٹ کے ان ہیلر اٹھا لیا تھا۔

"مل گیا اماں ان ہیلر مل گیا۔" وہ خوشی سے بے قابو ہو کر چلائی، اور یونہی گرتی

پڑا تھا۔ وہ گر کر بہت دقتوں سے سانس لیتے معید پہ جھک گئی۔ ڈھکن اتار کر پھینک دیا تھا۔

"سانس لیں معید۔" زندگی اس کی آنکھوں سے ہی نہیں لہجے سے بھی بری تھی، مگر اسے اس وقت ہزار وولٹیج کا کرنٹ لگا تھا جب معید نے اس غیر ہوتی حالت کے باوجود ہاتھ مار کر ان ہیلر کو اپنے لبوں سے ہٹا دیا تھا۔ ایک پل کو دونوں کی نگاہیں چار ہوئی تھیں۔ اس کی آنسوؤں سے جل تھل ہوتی آنکھوں میں معید کی بے بسی اور زندگی کے احساس سے مایوس نگاہیں ٹکرائیں۔ اگلے ہی لمحے وہ جیسے تھک کر آنکھیں موند چکا تھا۔

"معید۔" وہ پوری قوت صرف کر کے چلائی تھی، اس وحشت سے کہ، کہ اسے اپنی سماعتیں چٹختی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ بڑی اماں نے اس کے ہاتھ سے ان ہیلر لے لیا تھا۔ وہ منہ ہاتھ رکھے سسکیاں دباتی بے تحاشا روتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں بستر پہ وہ بے سدھ لیٹا تھا۔ ہموار سانسوں کا زیر و بم اس کی پرسکون اور گہری نیند کا غماز تھا۔ آئمہ صوفے پہ بیٹھی کب سے یونہی یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"اگر اس رات اسے کچھ ہو جاتا۔" اس نے اپنی سوچ پہ بے اختیار جھرجھری لی۔

"کیا میں کبھی خود کو معاف کر سکتی تھی۔" اس نے سہم کر سوچا۔

"اللہ نے مجھے ایک موقع دیا ہے۔" اس رات جب ہر طرف مایوسی تھی۔ تب اس نے دل کی گہرائیوں سے اللہ کو پکارا تھا۔ یہ رب کی ہی مدد تھی، کہ معید بچ گیا تھا۔ ورنہ اس نے تو خود کو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ جان کر کہ معید نے خود ان ہیلر بیڈ کے پیچھے پھینکا تھا۔ وہ کتنی دیر سن رہی تھی۔ اس کی اس حرکت پہ، وہ اتنا شدید ری ایکشن دے گا، وہ سوچ کر ہی لرز رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل اس نے عشاء کی نماز پڑھی تھی، اور بہت شدتوں سے اپنی اس آزمائش میں سرخروئی اس مالک حقیقی سے طلب کی تھی۔ اب اسے خود ہی پیش رفت کرنی تھی۔ اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے آہستگی سے اٹھی تھی، اور چلتی ہوئی معید کے داہنے پہلو میں آ کر اس کے برابر لیٹ گئی۔

"معید۔" سرگوشی سے ذرا بلند آواز میں پکارتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پہ رکھا، مگر وہاں بے خبری کا عالم تھا۔ وہ ذرا سا اونچا ہو کر سر اس کے شانے پر ٹکاتے

ہوئے زاویہ بدل گئی۔ اب اس کا یونانی دیوتاؤں کے سے مغرور اور دلکش نقوش سے سجا خوبرو چہرا براہ راست اس کی نگاہ کی زد پہ تھا۔

"مجھے پتا ہے، آپ سو نہیں رہے ہیں، پھر کیا حرج ہے، میری بات کا جواب دینے میں۔" اپنا ہاتھ اٹھا کر اب اس نے اس کے گال کو سہلایا تھا۔ اس کا تیر نشانے پر لگا تھا، وہ واقعی نا صرف آنکھیں کھول کر اسے گھورنے لگا۔ بلکہ اس کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"کیا بدتمیزی ہے، کیوں ڈسٹرب کر رہی ہو۔"

بھرپور تلخی سے کہتے اس نے...... درشتی کو چھپانے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی۔

آئمہ کا رنگ فق ہوا تھا، مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو کمپوز کر لیا تھا۔

"اٹھو یہاں سے، اپنی جگہ پہ جاؤ۔" اس کے لہجے میں قطعی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

"نہیں جاؤں گی، اس وقت تک، جب تک آپ مجھے معاف نہیں کرتے۔ دیکھیے صاحب، انا کے بت کو ہٹا کر دیکھیے، ایک حسین خوبصورت اور نازک پیاری سی لڑکی، ایکسکیوز کر رہی ہے آپ سے۔" اس نے کہتے ہوئے اس کے گھٹنوں کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے وہیں چہرہ ٹکا کر شوخ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اس کے شاید گمان میں بھی نہیں تھا اس سے اس حد تک پیش رفت کا، جبھی کچھ لمحوں کو حرکت تک کرنے کے قابل نہ رہا۔ جبکہ آئمہ کو اس کی اس خاموشی سے اچھا خاصا حوصلہ ہوا تھا، جبھی ہاتھ بڑھا کر اس کے بال بکھیرتے ہوئے گنگنانے کے انداز میں بولی تھی۔

"مان جائیں نا، مانا کہ غلطی میری تھی، مگر اب منا بھی تو رہی ہوں، چلیں میں کان پکڑتی ہوں۔"

اس نے جھٹ دونوں کان پکڑ لیے، معید نے ناگواری سے اس کی یہ شوخی و شرارت ملاحظہ کی تھی۔

"اف، کر بھی دیں معافی کا اشارہ، کب تک یونہی رہوں۔"

وہ بسوری، تب معید نے اندر کی تمام گھٹن بلا دریغ اس پہ الٹ دی تھی۔

"بند کرو یہ اوٹ پٹانگ فضول حرکتیں، تمہیں شرم آنی چاہیے، ایسی فضول باتیں کرتے ہوئے، اور یہ بے تکلفی، بالکل پسند نہیں ہے مجھے۔"

اس کا تحقیرانہ انداز آئمہ کی تمام تر شوخی لمحے بھر میں ہوا کر گیا، وہ ایسے رویوں کی

عادی نہیں تھی۔ فطرت اور مزاج کے خلاف شرم و حیا اور جھجک کو سائیڈ پہ رکھ کر ہر وہ کام کیا تھا، جو اس کے خیال میں اس جیسے زندگی کے احساس سے عاری انسان کو پھر سے جینے کی طرف مائل کر دیتا۔ مگر اب جب عزت نفس پہ چوٹ پڑی، تو برداشت نہ کرتے ہوئے بلبلا ہی گئی۔ اس کے چہرے پہ پہلے تحیر ابھرا تھا، پھر خفت، اور سب سے آخر میں شدید قسم کا رنج و ملال اور غصہ، وہ لب بھینچے امڈتی سسکیوں پر قابو پاتے تیزی سے چھلکنے کو بے قرار ہوتی آنکھیں لیے لمحے کے ہزارویں حصے میں بیڈ سے اتری تھی اور بھاگتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

رات کا مخصوص سناٹا ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ برآمدے کے پلر سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے آنسوؤں کو بہنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا، اسے مما کی تمام باتیں یاد آئی تھیں۔ وہ پچھتانا نہیں چاہتی تھی مگر وہ اپنے اس فیصلے پہ پہلی بار پچھتاوے اور مایوسی کا شکار ہو رہی تھی۔

☆☆☆

"اماں آپ کا بیٹا بہت مغرور ہے، مجھے تو لگتا ہے ان کے سینے میں دل کی جگہ کوئی پتھر پڑا ہے، تبھی تو کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔"

ان کی گود میں سر رکھے وہ بے اختیار ہو گئی تھی۔ اماں کچھ حیران پریشان سی اسے دیکھتیں کچھ سمجھنے سے قاصر تھیں۔

"اماں، سویرا کو بھی کیا انہوں نے یونہی رلا رلا کر مارا ہے۔" وہ اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہے بچی، کیا ہوا ہے۔" اماں اب باقاعدہ ہول سی گئی تھیں۔

"کچھ نہیں۔" وہ بے دلی سے کہتی سر جھکا کا ناخن چبانے لگی۔

"معید نے کچھ کہا۔" اماں اس کا چہرا کھوجنے لگیں، اس نے سرد آہ کھینچی۔

"کاش وہ کچھ نہ کہتے میری باتوں کا بہت غلط مطلب لے لیا ہے انہوں نے۔"

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"اماں۔" تبھی معید اندر سے چلایا۔

"جاؤ بات سنو اس کی۔"

اماں نے تجاہل برتتے ہوئے اسے اٹھایا، تب وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر اندر آ گئی۔

"میں نے اماں کو بلایا تھا۔" اسے دیکھتے ہی وہ چڑے ہوئے انداز میں جتا کر بولا۔

"جانتی ہوں، آپ کو تو میری صورت سے بھی بے زاری ہے، لیکن بے فکر رہیں، بہت جلد آپ کو اس پریشانی سے نجات ملنے والی ہے۔"

وہ کلس کر کہتی جھٹکے سے پلٹی تھی۔ جب بازو پہ ہوتی گرفت پہ نا چاہتے ہوئے بھی مڑی۔

"چھوڑیں۔" اسے متبسم نظروں سے اپنی سمت متوجہ پا کے اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔

"کبھی زبردستی ہاتھ تھامتی ہو تو کبھی......"

"میں اپنا عمل ضائع نہیں کرنا چاہتی۔"

"میری ہمدردی میں کیے گئے اقدام سے غلط مطلب اخذ مت کریں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سخت الفاظ استعمال کر گئی، احساس ہونے پہ کچھ خوف کے سے عالم میں اسے دیکھا، مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی کہ وہ مسکرا رہا تھا۔

"محترمہ! یہ ہمدردی محبت میں کب تک بدل جائے گی بتا سکتی ہیں۔"

وہ اٹھ کر اس کی راہ میں آ گیا تھا، وہ بھونچکی سی اسے تکنے لگی۔

"حیران ہوتے ہوئے، تم بہت اچھی تو نہیں لگتیں۔"

اس کی حیرت سے وا ہو جانے والی آنکھوں کو آہستگی سے چھوتا وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔ آئمہ جھینپ سی گئی۔

"راستہ چھوڑیں۔" اس نے فی الفور اپنا انداز بدلا۔

"تمہارے تمام راستے مجھ پہ آ کے ختم ہوتے ہیں۔"

اس کی آنچ دیتی ہوئی نظریں، آئمہ کے رخسار دہکانے لگیں۔

"آئمہ، رات میں نے تم سے اپنی اس انسلٹ کا بدلہ نہیں لیا تھا...... بس میں کچھ ڈسٹرب تھا۔ اتنا ہی ڈسٹرب، کہ جتنا پہلے اس حد تک مضطرب ہو کر میں ڈسٹرب ہو جایا کرتا تھا۔ مگر رات میں نے اپنی ول پاور کو استعمال کیا، اور خود کو کمپوزڈ رکھا جانتی ہو کیوں؟"

وہ رک کر اسے دیکھنے لگا، آئمہ نے لانبی پلکیں اٹھائیں۔

"تمہاری خاطر، اس لیے کہ تم یہ چاہتی ہو، میں واقعی جینا چاہتا ہوں آئمہ پہلے نہیں، مگر اب، اس لیے کہ کوئی ہے، جسے میری ضرورت ہے، ہے نا۔"

اس کے لہجے میں جو گھمبیرتا تھی اس نے آئمہ کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر ڈالا۔

"ہم، میرا خیال ہے اماں مجھے بلا رہی ہیں۔"

اس نے جیسے ہی اس کا ہاتھ تھاما تھا، وہ کچھ شرم کچھ گھبراہٹ میں سٹپٹا کر بولی۔

"کیسے یقین کروں، یہ وہی لڑکی ہے، جو کل رات مجھے مناتے ہوئے، کیا کیا جتن نہ کرتی ہوئی از خود قریب چلی آئی تھی۔"

وہ اس پہ جھک کر بوجھل آواز میں بولا، تو آئمہ نے عجوب سی مسکراہٹ سے اسے دیکھا تھا۔

"ویسے اصل رنگ کون سا ہے یہ یاد ہو۔" اس کی روشن آنکھوں سے شرارت چھلکنے لگی۔

"آپ بتائیں۔" اس کی پرشوق نگاہوں سے نظریں چراتی وہ مسکرا کر بولی تھی۔

"مجھے تو "وہ" والا اصل لگتا ہے۔" انداز صاف چھیڑنے والا تھا۔

"کیا۔" وہ زور سے چلائی اور ایک ہی جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"ارے سنو تو۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ رکے بغیر باہر بھاگ گئی تھی۔

☆☆☆

"اگر میری بیٹی کسی قابل ہوتی، تو میں اپنے مرحوم بھائی کی اس نشانی کو کبھی بھی اس اذیت میں مبتلا نہ رہنے دیتا، لیکن خیر دیر آید درست آید، آئمہ بیٹا، میں ساری رات نہیں سو پایا ہوں، مجھے یقین نہیں، البتہ شک تھا کہ سویرا کی موت حادثہ نہیں تھی، اسے مارا گیا تھا، مگر رات مجھے اس کا ثبوت بھی مل گیا۔

حسان کو تمہارے گھر کے گرد پیٹرول چھڑک کر آگ لگانے کا منصوبہ بناتے میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔ وہ اسے بھی حادثے کا روپ دینا چاہتا ہے۔ سویرا کے بعد تم یا معید...... میں مزید اس نقصان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ معید مجھے اپنی اولاد سے کم عزیز نہیں، جبکہ تم بھی مجھے بیٹیوں کی طرح ہی عزیز ہو، اولاد جب بڑی ہو جاتی ہے، تو والدین کی

حیثیت ایک بچے کی مانند ہو کر رہ جاتی ہے۔ بیٹا میں بھی تمہاری پھپھو اور اس کی اولاد کے آگے بے بس، لاچار ہوں، یہ گھر، بینک بیلنس، اور کاروبار، سب کچھ ہی معید کے بابا کا تھا، اس لحاظ سے اب معید کا ہے، مگر میں شاید اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا، سوائے تمہیں خبردار کرنے کے، پلیز بیٹا اگر اپنا سہاگ سلامت دیکھنا چاہتی ہو تو اسے لے کر یہاں سے چلی جاؤ۔"

پھوپھا جان اپنی بات کہہ کر رکے نہیں تھے۔ عجلت بھرے انداز میں مڑ کر چلے گئے، اور وہ انکشافات کی زد پہ خزاں رسیدہ پتے کی مانند لرزتی تنہا رہ گئی تھی۔

"تمہاری مما کا فون تھا۔" وہ خاصی دیر بعد خود کو سنبھال کر اندر آئی، تو معید نے اسے دیکھ کر اطلاع دی۔ "میری مما آپ کی بھی کچھ ہوتی ہیں۔"

اس نے مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹوکا۔

"اوہ یس، وہ میری لونگ وائف کی والدہ ماجدہ صاحبہ ہیں۔"

"بس۔" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"اور ہمارے ہونے والے بچے کی گرینڈ ما۔"

"معید۔" اس نے بے تحاشا سرخ پڑتے ہوئے خفگی سے گھورا۔

"آپ کی تو کچھ نہیں لگتیں نا۔" اس نے منہ پھلایا۔

"کیوں نہیں، ہماری وہ ساسو ماں ہیں، ہمارے سسر صاحب کی وہی، جو آپ ہماری ہوا کرتی ہیں، یعنی جند جان۔" وہ اس کے نزدیک آیا، اور کاندھوں پہ بازو پھیلا دیے۔

"کیا کہہ رہی تھیں مما۔" اس نے اس کے رومینٹک موڈ کو دیکھ کر دھیان بٹانا چاہا۔

"بلا رہی ہیں تمہیں، شکوہ کر رہی تھیں، کہ تم شادی کے بعد میاں کو ہی پیاری ہو گئیں۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ ان کی بیٹی کو میاں پیارا ہوا ہے۔"

وہ مسکراہٹ دبائے کہہ رہا تھا۔

"میں جانے کے متعلق خود ہی سوچ رہی تھی۔" اس نے الماری کھولی۔

"مجھے چھوڑ کر۔" وہ آنکھیں تحیر سے پھیلا کر بولا۔

"نہیں، میں ایک ایسے شخص کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی، جو بے چارا خود سے اب نوالہ بھی نہیں توڑ پاتا میرے بغیر۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"وہ شخص بے چارا۔" اس نے مصنوعی غصے سے کہہ کر اس کی چوٹی کھینچی۔

"مائنڈ اٹ، میں خفا بھی ہو سکتی ہوں۔" اس نے دھمکانا ضروری سمجھا۔

"پروا نہیں، جانتا ہوں، کہ جب میں الٹا خفا ہوتا ہوں، تو تمہاری کیسے جان پہ بنتی ہے۔" وہ شریر ہوا تھا آئمہ بری طرح سے جھینپ گئی۔

"شرم تو آتی نہیں اپنے کپڑے آپ خود رکھیں، میں اماں کی تیاری کر لوں۔" وہ اس سے ہاتھ چھڑاتی باہر آ گئی۔

ابھی مقصد یہاں سے نکلنا تھا۔ پھر معید اور بڑی ماں کو کیسے قائل کر کے یہاں آنے سے روکنا ہے۔ یہ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی، محبتوں کا مان دیر سے سہی، مگر وہ حاصل کر چکی تھی۔ اور اس پہ وہ اپنے رب کی جتنی بھی مشکور ہوتی کم ہی تھا۔



آباد شہر جاں رہے

دیوار گیر گھڑی نے با آواز بلند رات کے گیارہ بجنے کا اعلان کیا، تو خدیجہ بیگم بے قراری ہو کر نماز کے تخت سے نیچے اتر آئیں۔ جائے نماز کا کونہ موڑا اور تسبیح اٹھائے، پاؤں میں چپل پہن کر کمرے سے نکل آئیں۔ پورے گھر پہ خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔ آنگن پار کر کے انھوں نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا، اور آہستگی سے بیرونی دروازے کی چٹخنی گرا کے پٹ وا کیا۔ گلی میں تاحد نگاہ تاریکی تھی۔ دور کہیں سے پالتو کتے کی آواز فضا میں موجود خاموشی اور سناٹے کو چیر کر ان تک آئی، تو ان کا خدشات کی یلغار سے سہا دل کچھ اور بے کل ہونے لگا۔

بے دلی و مایوسی سے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ پلٹیں تو ضویا کو اپنے پیچھے کھڑے دیکھ کر ایک پل کو ڈر ہی گئیں۔

"ارے تم اس وقت؟" مسکراہٹ لبوں پہ تو آنکھوں سے محبت و شفقت چھلک رہی تھی۔

"جی میں......" وہ ذرا مسکرائی۔

"آج بھی لیٹ ہیں ہارون۔"

"ہوں، پتہ نہیں کیوں یہ لڑکا اتنی دیر کرنے لگا ہے۔"

"آ جائیں گے، دنیا کے معروف ترین انسان ہیں، پورا ملک ان ہی کے کندھوں پہ تو سوار ہو کر چل رہا ہے۔" انداز میں طنز کی آمیزش بھی تھی، جسے خدیجہ بیگم نے اپنی سادگی میں محسوس ہی نہیں کیا، اور ایک بار پھر کلاک پہ نظر ڈالتے ہوئے قدرے چونکیں۔

"تم بیٹا! اسی وقت، بہت رات ہو چکی ہے، جاؤ آرام کرو جا کے۔" ان کے دبے ہوئے انداز میں جو گریز اور احتیاط چھپی تھی اس سے ضویا اچھی طرح سے آگاہ تھی، جب ہی بے نیازی سے کاندھے اچکا کر بولی۔

"مما سو گئی ہیں۔" خدیجہ بیگم نے اب کے ذرا غور سے اس کی شکل دیکھی۔ صبیح چہرے کی جاذبیت، نکھار اور دلکشی اس کی کم عمری کی ہی عطا نہیں تھی۔ بلاشبہ قدرت نے اسے بہت فیاضی سے حسن کی دولت عطا کی تھی، مگر کچھ دنوں سے وہ اس کے بدلے ہوئے ڈھنگ محسوس کر کے عجیب سی بے چینی، اور اضطراب، میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ گو کہ ہارون کی طرف سے انہیں بھرپور قسم کی تسلی و اطمینان تھا۔ اپنی تربیت پہ بھروسہ بھی، مگر......

"آپ سو جائیں پھپھو! ہارون کے آنے تک میں یہیں ہوں۔ اچھا ہی ہے مجھے ان سے کچھ سوالات حل کرانے ہیں۔" انہیں بغور اپنی جانب تکتے پا کر وہ نظریں چرا کر مگر بہت اعتماد سے جھوٹ بول رہی تھی۔ وہ چپ سی رہ گئیں۔

"کیا سوچنے لگیں پھپھو؟" ضویا کچھ بڑبڑی ہوئی تھی۔

"بیٹا! میں ہارون کے انتظار میں بھوکی بیٹھی ہوں۔ وہ آئے تو اکٹھے کھانا کھائیں گے۔ تم ایسا کرو، جو بھی سوال کھنے ہیں، کل دن میں سمجھ لینا، اتنی رات کو ایک تو وہ تھکا ہوا ہوگا، دوسرے اگر بھائی صاحب یا بھابی کو پتہ چلا، تو بالکل مناسب بات نہیں۔"

ضویا نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

"دن میں وہ دستیاب کہاں ہوتے ہیں۔ چلیں، میں آپ کی موجودگی میں پڑھ لوں گی۔ اب تو آئیں، چائے بنا لاؤں۔ ایسے تو انتظار نہیں ہو سکتا، ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے۔"

ضویا چائے بنانے کی غرض سے کچن میں جا چکی تھی، وہ بہت تھکے ہوئے سے انداز میں صوفے پہ واپس آ کر بیٹھی ہی تھی کہ بیرونی دروازے کے باہر پہلے بائیک اور پھر کال بیل کی آواز سنتے ہی جیسے مطمئن ہو گئیں۔ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اٹھتے اٹھتے بھی ان کے منہ سے کراہیں نکل گئی تھیں۔ یہ جوڑوں کا درد سردیوں کے آغاز سے بھی پہلے ان کی جان کو آن چمٹا تھا۔

عجلت بھرے انداز میں کمرے سے نکل کر باہر آئیں تو ضویا کو دروازہ کھولتے پا کر وہیں کھڑی رہ گئیں۔ ہارون اسرار بائیک گھسیٹتا ہوا اندر لا رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ

بائیک کھڑی کر کے وہ ان کے پاس چلا آیا۔

"السلام علیکم اماں! آئی ایم ساری۔ آج پھر میں لیٹ ہو گیا۔" سر سے کیپ اتار کر ہاتھ کی مدد سے بال سنوارتا وہ خفیف سا ہو کر بولا۔ کچھ فاصلے پہ موجود ضویا کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! اب تم منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔ میں کھانا گرم کر دیتی ہوں۔" انہوں نے پیار لٹاتی نظروں سے اس کے اونچے پورے وردی میں سجے شاندار سراپے کو ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تو ہارون سر ہلاتا پلٹ کر اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔ ضویا وہیں سکھ چین کے پیڑ سے پشت لگائے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے بالکل خاموش کھڑی تھی۔

"چائے بن گئی بیٹا؟" انہوں نے اس سے پوچھا۔

"جی۔" وہ خفیف سی ہو کر نظریں جھکا گئی، پھر جانے کیا دل میں سمائی کہ سوچے سمجھے بنا اس کے پیچھے چلتی کمرے کے دروازے پہ آن ٹھہری۔ نہایت محتاط سی انگلی کی مدد سے دی گئی دستک کے بعد دروازہ وا کیا، اور اندر قدم رکھ دیا۔

ہارون اپنے دھیان میں تھا، شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے پلٹا، اور اسے روبرو پا کے ٹھٹکا۔

"تم......" اس کی آنکھوں میں حیرت جھلکی تھی۔ اوپری دونوں بٹن جو کھل چکے تھے، بند کرتے ہوئے وہ بغور استفہامیہ انداز میں اسے تک رہا تھا، اور ضویا جو دل کڑا کر کے یہاں تک آ تو گئی، اب جھجک کر خاموش کھڑی تھی۔

"وہ......وہ......پھپھو کھانے کا پوچھ رہی تھیں۔"

کچھ اور نہ سوجھا، تو اسے احمقانہ سی بات کہہ کر ڈرتے ڈرتے اسے دیکھا۔ سہیلیوں کے پڑھائے عشق و عاشقی کے تمام اسباق ذہن سے اڑنچھو ہو چکے تھے۔

"مگر میں انہیں گرم کرنے کا کہہ تو آیا ہوں۔" اس کی حیرت دو چند ہوئی تھی، تو ضویا کی خفت و خجالت۔

"جی......ہم......میں چلتی ہوں۔" اس نے گڑبڑا کر کہا اور اگلے ہی لمحے چھپاک سے باہر۔ "او مائی گاڈ!" دھک دھک کرتے دل پہ ہاتھ رکھ کر اس نے جانے کب کا سینے

میں پھانس کی طرح اٹکا سانس خارج کیا، اور کچن میں پھپھو کے پاس جانے کی بجائے دو کمروں کو باہم ملاتا دروازہ کھولتی سرعت سے بھاگ گئی۔

☆☆☆

کیسے کو رہتے ہو دل میں
پھر بھی کتنی دور لگتے ہو
کون سی بات ہے تم میں ایسی
اتنے اچھے کیوں لگتے ہو

حوریہ اپنی فرینڈز کے ساتھ، سرامحہ، جہاں زیب، کو اسائنمنٹ جمع کروانے کے بعد پیٹ پوجا کے خیال سے کینٹین کی طرف جا رہی تھی۔ جب اس نے اپنے آوارہ دوستوں کے جھرمٹ میں رعب انداز سے "ایزی" کو پہلے اسے دیکھ کر سیٹی بجاتے اور پھر لوفرانہ انداز میں با آواز بلند اشعار پڑھتے دیکھا، اس کے قدموں کی رفتار تیز ہوئی تھی۔

ہم چھین لیں گے تم سے یہ شانِ بے نیازی،

لمحہ بھر کی نگاہ چار ہونے پہ ہی ایزی نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اسے آنکھ ماردی تھی، اور اس کا دل چاہا، بڑھ کر اس آوارہ بدکردار لڑکے کا چہرہ تھپڑوں سے لال کر دے۔ مگر اندر امڈتا اشتعال دبائے، وہ تیز تیز چلتی کینٹین میں آئی اور گرنے کے سے انداز میں ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

اس نے بی اے بہت اچھے گریڈ سے پاس کیا تھا، انگلش میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بہت اچھی جاب اس کا برسوں پرانا خواب تھی، جسے وہ ہر صورت پورا کرنا چاہتی تھی۔ اماں کی ناراضی کے باوجود اس نے اپنے بابا سے بات کی تھی، جو گورنمنٹ ہائی اسکول کے ریٹائرڈ ماسٹر تھے، اور تعلیم کے حامی بھی، مگر جانے کیوں، اسے کو ایجوکیشن میں تعلیم دلوانے کے خیال سے، متذبذب تھے، اور یہ جھجک حوریہ نے ہی دور کی تھی۔

"مجھے پتا ہے بابا! مجھے اپنی اور آپ کی عزت کا پاس کیسے رکھنا ہے، مجھ پہ اعتماد کریں بابا! پلیز!" وہ اتنی لجاجت سے کہہ رہی تھی، کہ حنیف محمد سے انکار نہیں ہو سکا، اور حوریہ یہ عہد بھی کر چکی تھی کہ اسے ہرگز ہرگز بھی کسی لڑکے سے دوستی کرنی ہے، نہ ہی ان کی غلط امیدوں پہ پورا اترنا ہے۔ گو کہ اپنے غیر معمولی دلکش اور ساحرانہ نقوش کی بدولت کی

لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی تھی، مگر اس کا لیا دیا انداز اور صنفِ مخالف کے لیے نو لفٹ کا تاثر دیکھ کر سب پیچھے ہٹ گئے تھے۔ مگر کچھ دنوں سے یہ ایزی جانے کیوں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا۔

☆☆☆

فلاورز شاپ پر اس نے گاڑی روکی تھی، اور اتر کر رنگ برنگ اور خوشنما پھول دیکھنے لگی۔ ہر سو تیزی سے پھیلتی شام کی سیاہی اور تیز چلتی ہوائیں، بارش کی پیشگی آمد کا پتا دے رہی تھیں، جس وقت اس نے ریڈ و پنک روز کی کلیوں سے سجا بو کے سنبھال کر پے منٹ کی، جب بوجھل گھٹاؤں سے پہلی بوند نے ٹپک کر اسے چونکا دیا۔ بعد میں ایک تواتر سے گرنے لگی تھیں۔ اس کے لبوں پہ بہت دلفریب سی مسکراہٹ بکھرتی جا رہی تھی۔ کل سے آج تک کتنا کچھ بدل گیا تھا۔ وہ جو اجنبی تھا، کل تک جو اس کی فاسٹ ڈرائیو کی اندھی خواہش کی بھینٹ چڑھتے، گویا موت کے منہ میں جاتے بچا تھا، وہ اتنی رحم دل بھی کبھی نہیں رہی تھی، نہ ہی اس قدر احمق کہ کسی کو ٹکر مار کر زخمی کرے، اور پھر اسے اٹھا کر ہاسپٹل بھی لے کر جائے، مگر وہ بری پھنسی تھی۔ ٹریفک کا اژدھام تھا، تو آگے وہ درد کی شدتوں سے کراہتا انسانی وجود۔ آن واحد میں لوگ اکٹھے ہوئے تھے، اور اسے لعنت ملامت کرنے لگے، اب اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا، کہ اسے لے کر اسپتال جاتی مگر راستے میں ہی اس کا دل اسے بری طرح دغا دے گیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، کیسے لمحوں میں اس کی بن گئی، اور بے نیازی، اس کی ذات کو چھوڑ کے کہیں فضا میں تحلیل سی ہو گئی۔ اور وہ خود پہ بیت جانے والی اس انہونی پہ ششدر ایک مرتبہ پھر ایکسیڈنٹ کرتے کرتے رہ گئی تھی۔

ڈاکٹر مسرور کے کلینک پہ اسے ایڈمٹ کیا گیا تھا، چوٹیں معمولی تھیں مگر سر پہ لگنے والی چوٹ خطرناک تھی، جب ہی ڈاکٹر نے اسے ایڈمٹ کر لیا تھا، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گھر واپس ہوئی تھی کہ اس عرصے میں ماما کی لگا تار کئی مس کالز اس کے سیل پہ آ چکی تھیں، مگر آنے سے قبل وہ اس مغرور نقوش والے شخص سے اپنا تعارف ضرور کرا چکی تھی۔

"میں کل پھر آؤں گی۔ ڈاکٹر کی فیس اور ہاسپٹل کے چارجز کی آپ فکر نہ کریں، وہ میں بھروں گی۔ ڈونٹ وری۔"

اس کا تسلی دینے کا بھی اپنا ہی انداز تھا، مگر مقابل کے چہرے پہ عد درجہ درشتی

دیکھ کر اپنی بات کے غلط ہونے کا احساس خفت کا شکار کر گیا۔

"سو...... آئی ایم ساری۔ شاید آپ نے مائنڈ کیا، ایکچولی---" وہ خفیف ہوئی تھی۔

"وہ...آپ کا کوئی کانٹیکٹ نمبر تو ہوگا؟" وہ جانے کیوں اس سے بات کرنے کا بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ مگر چند لمحوں بعد جب اس نے اپنا سوال دُہرایا، اس وضاحت کے ساتھ کہ اس کے گھر والے پریشان ہوں گے، وہ انہیں اطلاع کرنا چاہتی ہے، اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔

"آپ کا کام ختم ہو چکا، بہت مہربانی کہ مجھے یہاں تک پہنچا دیا، ورنہ سڑک پہ تو مجھے تماشا بنا کر مرنے کو چھوڑنے کی کوئی کسر آپ نے رکھی نہیں تھی۔"

اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا، کہ کوئی اسے کچھ کہہ دے، اور وہ اسے بخش بھی دے، ناممکن۔ ابھی بھی وہ اس پر تفریں بھیج کر اپنی راہ ہو لیتی۔

"پلیز جائیں آپ یہاں سے۔ لیو می الون پلیز۔" وہ از حد تلخی سے کہہ رہا تھا۔

اسوہ یکلخت جھینپی تھی اور باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

کلینک کے باہر گاڑی روک کر وہ بارش کی بوچھاڑ کی پروا کیے بغیر باہر نکلی تھی اور بیگ اٹھائے، تیز قدموں سے چلتی کلینک کے داخلی گلاس ڈور کو دھکیلتی اندر داخل ہوگئی۔ پہلا دھچکا اسے خالی بیڈ کو دیکھ کر لگا تھا۔ کل وہ یہیں اسے چھوڑ گئی تھی، اور اسکی حالت ایسی ہرگز نہیں تھی کہ وہ خود سے کہیں جا سکتا۔ وہ جیسے کانٹوں پر چلتی ریسپشن پر آئی اور دوسرا دھچکا اسے اس وقت لگا، جب ریسپشنسٹ نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سمیت یہ کہتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا کہ وہ مریض آج صبح نو بجے ڈسچارج ہو کر چلا گیا ہے۔

☆☆☆

ضویا کی نگاہیں بظاہر کتاب پر تھیں، مگر ذہن ہارون اسرار کو سوچ رہا تھا، وہی ہارون اسرار، جو بچپن سے لے کر اب تک اس کے سامنے رہا تھا، اور اس نے اپنی ماں کی طرح اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے نزدیک ہارون اسرار کی حیثیت نچلے درجے کے انسان اور ایک معمولی ملازم سے زیادہ نہیں تھی۔ ہارون اسرار اس کا پھپھی زاد تھا جو بچپن میں باپ کے مرنے کے بعد ان کے در پہ آ کر بیٹھ گیا تھا، اور ایسا جم کر بیٹھا تھا کہ

پھر ہلنے کا نام نہیں لیا، وہ اور اس کی ماں کو کہ ان پر کبھی بھی بوجھ نہیں بنے تھے، کہ پھپھو اپنی سادگی اور فطری انکساری کی بدولت شاید ہی کسی کے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوں۔ جوانی میں بیوگی کی چادر اوڑھے جب وہ خود سے چند سال چھوٹے بھائی کی دہلیز پر آ گئیں، تو والد یہ صدمہ سہہ نہ سکے۔ دل کا جان لیوا دورہ بیٹی کے غم میں مزید اضافہ کر گیا۔ باپ کی وفات کے بعد مراد حسن (ضویا کے والد) اور اماں کو بیٹی کے لیے کچھ اور بھی حساس کر دیا۔ کچھ کھانے کی بات ہوتی یا لباس کی اولیت انہیں دی جانے لگی۔ یہ بھی ایک انداز تھا غم بانٹنے کا، اپنائیت و محبت کا، تاکہ انہیں شوہر کی کمی کا احساس نہ ہو۔ یہی بات ثانیہ (ضویا کی والدہ) کے دل میں تند اور اس کے معصوم بچگی نفرت کے بیج کو تناور درخت بنا گئی۔ اماں تو ایک دو سال کے عرصے میں راہی عدم سدھار گئیں۔ اب ثانیہ بیگم کو کھل کر کھیلنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ شوہر سارا دن کاروبار کے سلسلے میں گھر سے باہر ہوتے۔ خدیجہ کو انہوں نے بہت آسانی اور سہولت سے ایک ملازمہ کا درجہ دے دیا۔ ہارون کم آمیز اور انتہائی ذہین بچہ تھا۔ گھر کا سودا سلف سے لے کر ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے، اس کی پڑھائی کا خیال کیے بغیر دوڑا دیا جاتا۔ خواہشات کو مارنا اور سلگ سلگ کر جینا، وہ بہت کم عمری میں سیکھ گیا تھا۔ یہ تو ماموں کا دم غنیمت تھا، کہ وہ پڑھائی چھوڑ کر نہیں بیٹھا تھا۔ ضویا میٹرک کے بعد کالج میں گئی تھی۔ نئی نئی دوستیاں ہوئی تھیں۔ جو پڑھائی سے زیادہ دوسری باتوں میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ انڈین موویز، انڈین ڈرامے اور انڈین سانگز ہالی ووڈ اینڈ بالی ووڈ کے ہیروز ان کی پسندیدگی کے گراف پر بہت اوپر تک پہنچے ہوئے تھے۔ انہیں فلمی دنیا کی تمام باتوں کی آگاہی رہا کرتی تھی۔ یہی باتیں وہ آپس میں ڈسکس کیا کرتی تھیں۔ ضویا کے لیے یہ سب کچھ نیا اور بہت دلچسپ تھا۔

اس کی برتھ ڈے سیلیبریٹ کرنے کے لیے اس کی بھی فرینڈز اس کے گھر آئی تھیں، اور انہوں نے اس کے گھر میں ہارون اسرار کو دیکھا تھا، وہ ان دنوں سی ایس ایس کر رہا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی، وہ پولیس میں بھرتی ہو کر اپنے ملک کے لیے کچھ کر سکے۔

وہ معمول کے مطابق صبح کے ناشتے کے لیے فریش جوس کے پیکٹ بریڈ اور جیم وغیرہ لایا تھا، اور کچن میں رکھ کر پلٹ رہا تھا، جب لائبہ نے اسے بالکل اچانک دیکھ لیا۔ وہ تو دل تھام کر رہ گئی۔

''یہ...... یہ پرنس کون تھا، اتنا گڈ لکنگ اور ڈیشنگ ہے تمہارا کزن، اور تم نے آج تک ملوایا نہیں؟'' وہ سب اس کے سر ہوئی تھیں، اور ضویا حق دق سی آنکھیں پھاڑے انہیں جانے کون سے القاب سے نوازتے اور اس کے لیے آہیں بھرتے اور خود کو صرف اس وجہ سے کلی ہونے کی نوید سنتی رہی تھی۔

''سنو، کیا تمہارا اس کے ساتھ کچھ چل رہا ہے۔'' زہرا نے اس کا بازو ہلایا تھا، اور وہ اپنی حیرانی پر قابو پانے کی کوشش میں کچھ اور ہونق ہوگئی۔

''کیا مطلب، کیا چل رہا ہے؟'' اسے یہ انداز ناگوار محسوس ہوا تھا۔

''مطلب، عشق وشق، افیئر۔'' زہرا نے ایک بار پھر آہ بھری اور یکا یک ہی ضویا کو جانے کیوں ایک بار پھر شرمندگی نے آن لیا، ویسی ہی شرمندگی جو اس نے اس وقت محسوس کی تھی کہ جب اس نے کہا تھا، اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے۔ ''ہیں!''

''نہیں۔'' وہ چیخی تھی۔ ''یعنی وہ اتنا ڈیشنگ، اس قدر شاندار شخص تمہارے سامنے ہے اور تمہیں نظر نہیں آتا۔''

''کیا تمہاری آئی سائیڈ ویک ہے؟'' نائلہ کے سنجیدگی سے سوال کرنے پر وہ گڑبڑا گئی تھی۔

''یہ ایا تو تمہیں کیوں نظر نہیں آیا، ایسا کرو، اگر تم نہیں تو میری بات چلوا دو۔'' نائلہ نے آنکھ میچ کر جذب سے کہا، اور ضویا گھبرا کر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

اسی رات وہ جب ان باتوں کو لے کر اچھی خاصی ڈسٹرب ہوگئی تھی، اور بے چینی سے باہر ٹہل رہی تھی وہ اچانک ہی سامنے آگیا تھا۔ وہ یقیناً پاپا کے کمرے سے باہر آیا تھا۔

''سنو۔'' وہ اپنے دھیان میں دروازہ بند کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔ اس پکار پر چونکا۔ سرخ اور نیلے خوبصورت پرنٹ کے شلوار سوٹ میں دوپٹہ شانوں پہ پھیلائے وہ اسے بہت توجہ، بہت دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ دیکھ کہاں رہی تھی، جانچ رہی تھی، اور وہ تو ان تعریفوں سے بھی کہیں بڑھ کر اٹریکٹو اور دلربا شخصیت کا مالک تھا، وہ حیران حیران سی دیکھ کر سوچتی رہی۔ ہارون کو اس کی دماغی حالت پہ شبہ سا ہوا۔

''کچھ کام ہے؟'' جز بز ہونے سے پہلے کی کیفیت حیرانی کی تھی۔

''ہاں کام تو ہے، لیکن کل بتاؤں گی۔'' وہ جانے کیوں مسکرائی اور ایک بار پھر اس

کا سر تا پا جائزہ لیا۔ ہارون کو عجیب سا احساس ہوا، وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

پھر مزید تین سال گزر گئے، وہ اپنی فرینڈز کی تمام عادات اپنا لینے کے باوجود بھی، کبھی کھل کر ہارون سے اظہار نہ کر سکی۔ البتہ دل میں جھنجلاتی ضرور رہتی۔ جانے کیسا دبدبہ اور رعب تھا اس کی شخصیت میں، کہ وہ اس کے سامنے جاتے ہی سب کچھ بھولنے لگتی۔ کیا وہ کچھ بھی محسوس نہیں کرتا، کتنا بدل گئی ہوں میں اس کی وجہ سے۔ اس کے آس پاس منڈلاتی ہوں میں، اس کے کہنے ہی کام کرتی ہوں، وہ کیوں خود سے نہیں سمجھ جاتا۔ کتاب پٹختے ہوئے وہ چڑ سی گئی۔

باہر بارش کا شور تھا، وہ اٹھی اور چلتی ہوئی کھڑکی میں آن رکی۔ گلاس ونڈو کے پار قدرت کے خوبصورت رنگ بکھرے تھے، وسیع و عریض لان میں بہار دکھاتے گل بوٹے بارش میں دھل کر نکھر سے گئے تھے۔ تب ہی وہ چونکی تھی۔ نگاہ اٹھی اور ساکن رہ گئی۔ ثانیہ بیگم کسی پہ برہم ہو رہی تھیں۔ وہ ہارون اسرار تھا جو ہمیشہ کی طرح، ان کی لعنت ملامت کو بغیر کسی تاثر کے سن رہا تھا۔ ضویا کے اندر ناگواری بکھری تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑی، اور تیز تیز چلتی باہر آگئی۔

''کیا ہوا؟ کیوں چلا رہی ہیں مما؟'' بدلحاظ اور گستاخ لہجہ۔ ثانیہ بیگم کے ساتھ ہارون اسرار نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔ ہارون اسرار نے ایک کے بعد دوسری نظر بھی اس پر نہیں ڈالی تھی اور پلٹ کر لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟''

ثانیہ بیگم، ہارون اسرار کی چوڑی پشت کو گھورتے ہوئے اس پر غرائیں۔

''اب کیا قصور کیا تھا اس نے، کہ آپ اس پہ اس طرح برس رہی تھیں۔ مما! آخری بار یہ بات بتاؤں، کہ وہ آپ کا ملازم نہیں ہے۔ پولیس میں اعلیٰ گریڈ کا آفیسر ہے۔''

''اونہہ...... ہوا کرے، ہمارے ٹکڑوں پہ ہی تو ہے''

''مما......'' ضویا کے لہجے میں بادلوں کی سی گھن گرج تھی۔ ''وہ اس گھر کا ہونے والا داماد بھی ہے، یہ بات آپ کو پتا ہے پھر بھی آپ اسے......''

''شٹ اپ......'' اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی، اس سے پہلے وہ حلق کے بل دھاڑی تھیں اور ایک زناٹے دار تھپڑ اسے رسید کر دیا تھا۔ ضویا گال پہ ہاتھ رکھے جھلکتی

آنکھوں میں تحیر سموئے انھیں دیکھتی رہ گئی۔

''کس نے یہ فضول بکواس تم سے، اس کی ماں نے؟'' ان کی آنکھیں لہو رنگ ہو چلی تھیں۔

''نہیں، پاپا نے، اور پاپا اپنے ابا اماں کی خواہش کو ہرگز نہیں بھلائیں گے۔ مما! چاہے آپ کچھ بھی کر لیں، اس لیے بھی کہ میں ایسا چاہتی ہوں۔''

حواس بحال ہوئے تو ضویا ان کے وجود پر بجلیاں گراتی، ایک جھٹکے سے پلٹ کر اندر بھاگ گئی۔ وہ ششدر کھڑی رہ گئیں۔

☆☆☆

''پھر تم نے کیا سوچا؟'' خدیجہ بیگم نے اپنے سامنے بیٹھے تھکے تھکے سے ہارون اسرار کے چہرے پر گہری نگاہ ڈالی، وہ ابھی کچھ دیر قبل ہی گھر آیا تھا۔

''کس بارے میں؟'' وہ چونکا تھا، اور حیرت سے انھیں دیکھا۔ ان کا انداز خاص تھا یا اسے محسوس ہوا۔

''ضویا کے متعلق؟'' انھوں نے مسکرا کر دلچسپی سے اسے دیکھا تو ہارون کو جھٹکا لگا تھا۔

''کیا مطلب'' ضویا کے متعلق میں کیوں سوچنے لگا۔'' یہ نام سن کر اس کا لہجہ تخت ہوا تھا۔

''بھول گئے بیٹا! حالانکہ یہ بھولنے والی بات تو نہیں تھی۔ اماں، ابا کی شدید خواہش تھی یہ اور اب بھائی جان، اماں۔'' نانا جان اور نانو اب اس دنیا میں نہیں رہے، ان کے ساتھ بیان کی خواہش بھی منوں مٹی تلے جا چھپی۔ آپ پلیز! اس تذکرے کو رہنے دیں، ہم آل ریڈی ماموں کے زیر احسان ہیں۔ کیا آپ اپنے بیٹے کو ساری عمر ان کا زیر بار رکھنا چاہتی ہیں۔'' اس کا لہجہ از حد تلخ اور کڑواہٹ لیے تھا۔ انھوں نے اس کی خفگی کو محسوس کیا اور گہرا سانس کھینچا۔

''کیا تم ضویا کو پسند نہیں کرتے؟'' ان کے لہجے میں انجانا سا خوف در آیا تھا۔ ہارون کے چہرے سے بے بسی کا اظہار چھلکا۔

''وہ اماں! میں...... آئی ایم سوری۔ میں نے کبھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا۔ لائف پارٹنر کے لیے میرے ذہن میں جو امیج ہے وہ کم از کم ضویا جیسی لڑکی کا نہیں ہے۔'' وہ

جھنجلاتے ہوئے کہتا چلا گیا۔

''تو پھر کیسی لڑکی کا ہے؟'' خدیجہ بیگم کا لہجہ کانپا اور چہرہ متغیر ہونے لگا۔

''سائرہ خان، اماں! وہ بہت اچھی ہے، میرے دوست کی بہن ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سلجھی ہوئی۔'' اس کے لہجے میں ہی نہیں، آنکھوں میں بھی نرمی اتر آئی۔ خدیجہ بیگم یک ٹک اسے دیکھ رہی تھیں۔

''یعنی تم — تم — ضویا سے شادی نہیں کرو گے؟''

ان کے حلق سے سرسراتی آواز برآمد ہوئی۔ ہارون چونکا، اور بہت تھکے ہوئے انداز میں ماں کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔

''کیا ممانی جان، ضویا کی شادی مجھ سے کر دیں گی؟''

اس کی آواز سپاٹ تھی۔

''پتا نہیں، لیکن بھائی جان ضرور ایسا چاہتے ہیں۔ ابھی پرسوں ہی انھوں نے مجھ سے بات کی ہے۔''

''اور کل شام ضویا کو دیکھنے ایک بہت ایڈوانس قسم کی فیملی آئی ہوئی تھی، جو اپر کلاس کے لگتے تھے۔''

ہارون نے بھرپور مسکراہٹ سے کہتے ہوئے خدیجہ بیگم کو حیران کر ڈالا۔

''آپ ابھی خاموش رہیں اور دیکھیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ مجھے جلدی نہیں ہے اماں بہتر ہوگا کہ ضویا اس گھر میں آنے کے بجائے کہیں اور کھپ جائے۔''

''ہاں! تا کہ تم اپنی پسند کی لڑکی لا سکو۔'' انھیں اس کی بے نیازی کھلی تھی۔ ہارون نے مسکراہٹ ضبط کر لی، اور وہاں سے اٹھ گیا۔

اسے چند روز قبل کی وہ بدلتی شام بہت اچھی طرح سے یاد تھی۔ جب اپنے کمرے میں واش روم سے نکلتے ہوئے اس نے ضویا کو اپنی استڈی ٹیبل پر جھکے دیکھا تھا۔ آہٹ پر وہ پلٹی تھی اور اسے روبرو پا کر، گھبرانے یا بوکھلانے کے بجائے، وہ بہت اعتماد سے مسکرائی تھی۔ اتنے اعتماد سے کہ وہ جو اپنے کمرے میں بے تکلفانہ انداز میں بنیان پر تولیہ ہی پہن کر باہر آ گیا تھا۔ خود کو اس نے سامنے اس حلیے میں پا کر شرمندہ سا ہو گیا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' شرٹ پہننے کے چکر میں وہ اس کی کارگزاری پڑھیاں

نہیں دے سکا تھا۔

"خود دیکھ لونا؟" وہ فسق اور سرد ہوتی ہوئی نظروں سے اسے تکنے لگی۔ ہارون اس کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کرتا جز بز ہوا تھا، اور تیزی سے شرٹ کے بٹن بند کرنے لگا۔

"او کے، اس وقت تو تم جاؤ۔ یقیناً تمہیں کوئی سمری یاد کرنا ہوگی۔ ٹرانسلیشن کروانا ہوگی یا پھر......"

"یا پھر کچھ نہیں...... ہارون اسرار ان سب فضولیات کے علاوہ بھی تو دنیا میں بہت کچھ ہے۔ مثلاً یہ، کہ تمہارا نام بہت یونیک ہے، مگر تم سے زیادہ نہیں۔ سچ بتاؤ۔ ہر روز کتنی لڑکیاں مرتی ہیں تم پر۔" اس کے نزدیک آ کر آخری بٹن جو رہ گیا تھا اس کے ہاتھ ہٹا کر خود بند کرتے ہوئے، وہ اس درجہ اعتماد سے بولی تھی، کہ ہارون اسرار اس کی اس جرأت کے مظاہرے یا دوسرے لفظوں میں بے شرمی پر دنگ رہ گیا۔

☆☆☆

طوفانی ہواؤں کے جھکڑ دروازوں اور کھڑکیوں سے سر پٹخ رہے تھے۔ بادلوں کے گڑگڑاہٹ اور بجلی کی خوفناک چمک ماحول میں پراسرار ہیبت پیدا کر رہی تھی۔ جب بجلی چمکتی تو گلاس وال کا شیشہ جیسے تڑختا ہوا سا محسوس ہوتا اور یہ نیم تاریک سا کمرہ چکاچوند روشنی سے بھر جاتا۔ آف وائٹ پردے، چھت سے لٹکا قیمتی فانوس، بلیو مخملیں صوفے، ہر شے پر ایک وحشت بھری خاموشی تھی۔ اس خاموشی کا حصہ اس کا وجود بھی تھا، جو کسی پتھر کی مانند ہی ساکت تھا۔ ایزی چیئر پر نیم دراز، سینے پر اوندھے کھلے فیشن میگزین کو اوندھائے وہ جانے کیا سوچ رہی تھی، تب ہی وہ دروازہ کھلنے کی آواز پر چونکی، جو کہ پاؤں کی ٹھوکر سے کھولا گیا تھا۔ کیچڑ سے بھرے جوگرز نے قیمتی کارپٹ پر نقش و نگار بنائے تھے۔ وہ جیسے تڑپ کر سیدھی ہوئی۔

"اسٹاپ اِٹ! ایزی شیم آن یو۔" اس نے انگشت شہادت کی مدد سے کارپٹ پر کیچڑ سے بن جانے والے جوتوں کے نشانوں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ملامتی نظروں سے اسے گھورا۔

"یہ کارپٹ تمہارے باپ نے نہیں بچھوایا، یہاں پر۔" اس کا لہجہ اس کے چہرے کے نقوش کی طرح ہی تھا۔

"او ویل! میرے باپ نے نہیں بچھوایا، تو تمہارے باپ نے بھی نہیں بچھوایا۔ یہ

تو ہماری مشترکہ ممی نے بچھوایا ہے۔ جو اتنی امیر کبیر ہے، کہ اتنے ہی دس کارپٹ بھی تمہیں لا کر دے سکتی ہے۔ کر لو میرے لال اور انہیں بے دریغ گندا کر دو" اس نے چڑ کر کہا۔ ایزی نے جیسے اس کی کسی بات پر توجہ نہیں دی۔ بڑا سا مخملیں فلور کشن گھسیٹا اور اسے سر کے نیچے رکھ کر لمبا لمبا لیٹ گیا۔

"خیریت! تم اتنی رات تک جاگ رہی ہو؟"

جیب کی جیبیں ٹٹول کر گولڈ لیف کا سگریٹ کیس اور لائٹر نکالنے کے بعد وہ سگریٹ نکال کر لبوں میں دبا تا اب شعلہ دکھا رہا تھا۔ اسوہ نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ہاں۔"

ایزی جو نیا سگریٹ سلگانے کو ڈبیا اٹھا رہا تھا سرعت سے ہاتھ پشت کے پیچھے لے گیا۔ سامنے موجود عورت نائٹ گاؤن میں ملبوس تھی۔ ان کے ریشمی لانبے گھنیرے بال ان کی پوری پشت کو چھپائے ہوئے تھے۔ وہ اس عمر میں بھی اتنی جاذب نظر، اتنی پرکشش شخصیت کی مالک تھی کہ ایک کے بعد دوسری نگاہ اس پر خود بخود اٹھتی تھی۔

"بس، بس یونہی جاگ رہے تھے سونے۔"

جواب اسوہ نے دیا تھا جبکہ ایزی میکانکی انداز میں اٹھ کر اپنے بیڈ روم کی سمت بڑھ چکا تھا۔ جب ممی کی ٹھہری ہوئی آواز پر ٹھٹکا۔

"جی۔" وہ اچانک مڑا۔

"بیٹے اگر جوتے خراب ہوں تو انہیں اتار دیا کرتے ہیں۔" ایزی نے ٹھٹک کر اسوہ کو دیکھا، جو مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ ہو رہی تھی۔ وہ پیر پٹختا ہوا اپنے بیڈ روم میں چلا گیا جبکہ اسوہ اپنے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں موند کر سوچنے لگی۔

وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، کہ جس کی تلاش میں در در کی خاک چھانتی پھری ہے، وہ اسے مایوسی کے کناروں پہ تھکن کی انتہاؤں پر یوں اچانک مل جائے گا۔ فضا میں حبس تھا۔ آسمان کا رنگ سیاہی مائل سرخ ہو چکا تھا۔ بارش کے آثار تھے، جب وہ گھر سے نکلی اور اسٹیڈیم روڈ سے ٹرن لے کر چرچ روڈ کی سمت آ گئی تھی اور تب ہی اسے لگا تھا جیسے برقی بوندوں نے سرتال الاپا ہے اور فضائیں مہک اٹھی ہیں۔

سرتا پا بارش میں بھیگا، وہ ایک شخص جسے اس کی نگاہ کی خواہش نے کہاں کہاں اور

کس کس جتن سے نہیں کھوجا تھا۔ سڑک کنارے چلتا ہوا کتنا بے نیاز دکھ رہا تھا۔ اس نے تو جیسے خوشی سے بے قابو ہوتے گاڑی بیچ سڑک پر روکی۔ ایک افراتفری کے سے عالم میں اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ یوں اس طرح، کہ اسے پھر سے کھو دینے کا خوف، اسے ہراساں کر رہا تھا۔

''سنیں..... سنیں..... پلیز.....'' وہ بارش کیچڑ اور گاڑیوں کی پرواہ کیے بغیر بھیگتی ہوئی اس تک آئی تھی۔ وہ اچانک رکا تھا اور حیران سا ہو کر پلٹا۔ اس کی بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں نہ کوئی، شناسائی کی رمق تھی، نہ ہی کوئی پہچان، بلکہ وہ کیسی حیرانی اور بیگانگی سمیت اسے تک رہا تھا۔

''اوہ گاڈ..... !اگر اب بھی تم نہ ملتے نہ تو مجھے لگنے لگا تھا میں تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے مر جاؤں گی۔'' اس کا لہجہ خوشی کے احساس سمیت بے ربط ہو چلا تھا۔

اس نے اب کے ذرا دھیان سے مگر کڑی نگاہ سے اسے دیکھا مگر ان آنکھوں میں پہچان کا رنگ پھر بھی نہیں اترا تھا۔

''واٹ نان سینس۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ ہیں کون اور یہ جذباتی تقریر کس سلسلے میں فرما رہی ہیں؟'' اس کا لہجہ بہت سخت اور تلخ تھا۔

اسوہ کے اندر یکلخت چھنا کا ہوا وہ ایک دھچکے سی ہوئی تھی۔ اس نے بہت ٹوٹی ہوئی آس سمیت اسے دیکھا۔ یوں جیسے وہ یقین نہ کر پائی ہو، کہ وہ واقعی اسے فراموش کر چکا ہے۔

''آ..... آپ کو واقعی یاد نہیں، کچھ بھی۔'' اس کے مدھم لہجے پر آنسوؤں کی نمی غلبہ پانے لگی۔

''مگر کیا؟'' وہ جھنجلانے لگا۔ بیچ راہ یوں راستہ روک کر کھڑا کرنے والی یہ لڑکی اسے کھسکی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''وہی..... وہی حادثہ..... جب آپ میری گاڑی سے ٹکرا گئے تھے اور میں.....''

''اوہ.....'' اسے جھٹکا لگا۔

''تو وہ تم تھیں۔'' وہ آنکھیں نکال کر چنگھاڑا، کچھ اس طرح کہ اسوہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بارش اسی تواتر سے دونوں کو بھگو رہی تھی۔ اس نے مجرمانہ سے انداز میں سر جھکا لیا۔

''میں آئی تھی اگلے روز ادائیگی کرنے اور آپ کی عیادت.....''

''آپ کو بھی مجھے بتانا تھا۔'' اس نے طنزیہ سوال کیا۔ اسوہ لاجواب سی ہو گئی اور بے بس سی ہو کر ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگی۔ وہ کبھی بھی اسے ایک بار پھر نہ کھوتی، اگر وہ ایک رکشہ روک کر اس میں بیٹھ کر نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جاتا۔

''اگر یہ محبت ہے تو کاش مجھے یہ محبت نہ ہوئی ہوتی۔''

ایک تارہ اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر چپکے سے تکیے میں جذب ہو گیا۔

☆☆☆

ہارون نے جھنجلا کر فائل بند کر دی۔ اس کا ذہن منتشر تھا، وہ یکسوئی سے کوئی بھی نتیجہ نہیں پا رہا تھا۔

اپنے دو سالہ کیریئر میں اس نے بہت سے مشکل کیس خوش اسلوبی سے ہینڈل کیے تھے، اور کامیاب بھی رہا تھا۔ سینئرز آفیسر اس کی ذہانت کے قائل، اور ان تھک محنت کو پسند کرتے تھے۔ مگر زندگی میں اس مقام پر وہ جیسے اندر سے کمزور پڑنے لگا تھا۔ اماں کی ناراضی اس کے اعصاب کے تناؤ میں اضافہ کر رہی تھی۔ ایک ہی ضد اور وہ بھی بے جا، کیا ضوبیا سے شادی کرنے کے بعد اسے وہ مقام دے پائے گا، جو سائرہ کو اس کا دل کب کا دے بھی چکا ہے۔ کیا وہ اسے محض اس لیے اپنی زندگی کا حصہ بنا لے، کہ اس کی ماں اپنے بھائی کے احسانوں کا بار اتارنا چاہتی ہے۔ احسان فراموش تو وہ بھی نہیں تھا مگر احسان کا بدلہ اس طرح چکانے پر بھی ہرگز آمادہ نہیں تھا، کہ ساری عمر کا روگ پال لے۔ اس نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ تخیل کے پردے پر سائرہ کا دلنشیں سراپا لہرانے لگا تو ایک آسودہ مسکراہٹ آپ ہی آپ اس کے لبوں پر آن ٹھہری۔

ضوبیا کی عادات و اطوار کیا تھیں، اس نے کبھی ان پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ پہلی مرتبہ وہ تب چونکا تھا، جب ضوبیا اپنی فرینڈز کے ساتھ اس کے سامنے آئی تھی۔ وہ سب کی سب جن نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں، وہ ان سراہتی اور ستائشی نگاہوں کا اب عادی ہو چکا تھا۔ صنف نازک کا اپنی طرف جھکاؤ، اب اسے حیران نہیں کرتا تھا، مگر ضوبیا کی فرینڈز کی حرکات اور اشارے بازیوں پر وہ تشویش کا شکار ہوا تھا۔ ضوبیا کا میل جول اتنی غلط لڑکیوں سے ہوگا، اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔

مگر جھٹکا اسے اس وقت لگا جب اس نے ضویا کا جھکاؤ اپنی طرف محسوس کیا۔ کیا سوچا جارہا ہے یوں مسکرا کرا کر۔ ہارون نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کم از کم تمہیں نہیں۔ بائی دا وے، تمہیں کسی نے اتنا بھی نہیں بتایا کہ رات کو اس پہر، کسی غیر محرم مرد کے کمرے میں آنا کتنی آکورڈ حرکت ہے۔"

اس کا لہجہ بلا کا سرد اور تلخ تھا، اور یہی تلخی بے کلی ضویا کو آگ لگاتی تھی۔ وہ ہارون کو اب بھی خود سے کمتر سمجھتی تھی۔

"اپنے گھر کے کسی حصہ میں بھی آتے جاتے، مجھے قطعی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں یہ بات بھولنا نہیں چاہیے کہ تم ہمارے گھر کے ہی ایک کمرے میں موجود ہو۔"

وہ بات کرتے ہوئے اس کی کرسی، جس پر وہ بیٹھا تھا، بالکل ہتھے پر آ کر ٹک گئی۔ فل فلنگ کی جدید تراش خراش کی شرٹ کا گلا انتہائی گہرا تھا وہ بہکا دینے کی حد تک حسین تھی۔ وہ بہت مضبوط اعصاب رکھتا تھا، مگر اس طرح سے آزمائش میں پڑتا، وہ جھلا اٹھا۔ ناگواری اور برہمی کے ساتھ اسے دھکا دے کر دور ہٹایا۔

"کیا کہوں تم کو، مجھے اس بات پر افسوس ہے کہ تمہاری جیسی سطحی سوچ کی معمولی لڑکی، میرے ماموں کی اولاد ہے، جسے نہ ان کی عزت کی پرواہ ہے نہ ـــــ"

"شٹ اپ...... جسٹ شٹ اپ ـــــ" اس کی غضب سے بھری دھاڑ ہارون کی سرد و سفاک آواز پر غالب آ گئی۔

"میں یہاں تمہارا درس سننے نہیں آئی۔ تم یہ بتاؤ، انکار کیوں کر رہے ہو؟" وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کڑے تیور لیے سوال کر رہی تھی۔

"خود سے پوچھو، کیا کمی ہے تم میں، جو میرے انکار کی وجہ بنی۔" وہ جواباً لحاظ کیے بنا تند لہجے میں بولا۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی تھی، پھر ایک وحشت کے سے عالم میں اسے پیچھے کی جانب دھکا دیتے ہوئے غرائی۔

"ایک بات یاد رکھنا ہارون! مجھے ہر قیمت پر تمہیں حاصل کرنا ہے۔" وہ گویا اسے دھکا کر وہاں سے چلی گئی۔ ہارون لب بھینچے کھڑا تھا۔

☆☆☆

نماز فجر کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر سے بستر میں گھس گئی تھی۔ سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان کے گھر میں تو یوں بھی موسم اپنی پوری شدت کا احساس بخشتے تھے۔ گرمیاں ہوتیں تو دھوپ کی پہلی کرن جیسے ان ہی کے آنگن میں آتی اور آخر شعاع تک کی راتی تھی۔ سردی میں دھوپ اسی قدر بے اعتنائی برتا کرتی۔ چھوٹا سا آنگن اور برآمدہ دو کمرے، کچن، باتھ روم۔ یہ تھی اس کی جنت جس میں وہ بہت مطمئن اور خوش باش بھی تھی۔ خرابی تو اس ایزی کے بچے نے پیدا کر کے رکھ دی تھی۔ جب سے یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا تھا، پریشانیوں اور تفکرات نے جیسے، اس کے دل و ذہن کو جکڑ کر لیا تھا۔ اتنی نازیبا حرکت کی تھی، کہ وہ غصے میں اسے تھپڑ مار بیٹھی تھی۔ وہ ڈر کر گھر بیٹھنا بھی نہیں چاہتی تھی، جب ہی رابعہ کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ یونیورسٹی چلی آئی تھی۔

"میں نے کہا تھا چند دن مت آؤ معاملے کو ٹھنڈا ہونے دیتیں۔"

"رابی! اس نے ٹوک دیا۔" میں نہ بزدل ہوں اور نہ ہی ڈرپوک...... پلیز ایسا سبق مت پڑھاؤ مجھے۔"

اسے جانے کیوں رابعہ پر بھی غصہ آ گیا تھا، اور رابعہ مزید کچھ کہے بنا کتاب پر جھک گئی تھی۔ سارا دن خیریت سے گزرا تھا، وہ کہیں نظر نہیں آیا، اور جب وہ چھٹی کے بعد گیٹ سے نکل کر اپنے پوائنٹ کے انتظار میں کھڑی تھی، وہ اچانک جانے کہاں سے آن دھمکا تھا۔

"ہائے مجھ سے دوستی کر لو۔ فائدے میں رہو گی لڑکی، ورنہ نقصان کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔"

اس نے بہت عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ حورِیہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا، اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔

"ٹھیک ہے، تمہیں آسان بات سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ دھپ دھپ کرتا گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی تھی۔

"میں نے کہا تھا نا کہ......"

"کیا کرے گا یہ؟" وہ رابعہ کی بات کاٹ کر چیخی۔

رابعہ نے جواباً سنجیدہ نگاہ اس کے سرخ ہوتے چہرے پر ڈالی، اور دوسری تماشا

دیکھنے والوں پر۔

''عورت کے پاس اس کی سب سے قیمتی چیز اسکی عزت ہوا کرتی ہے، وہ جس حد تک گھٹیا ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ...''

اور حوریہ پوری جان سے کانپ گئی تھی۔ غم و غصے کی زیادتی نے اسے یہ کیوں بھلا دیا تھا کہ وہ ایک لڑکی ہے۔ کمزور، بے بس اور......

☆☆☆

''پلیز! یہ بل کلیئر کر لیں۔'' اس نے اپنے دھیان میں مطلوبہ اشیاء جو اس نے یہاں سے خریدی تھیں، کاؤنٹر پر ڈھیر کر کے جیسے ہی سر اونچا کیا، اس کا دل جیسے پوری قوت سے سکڑ کر پھیلا، اور بے تحاشا دھڑکتا چلا گیا۔ وہی تھا جو پہلی ملاقات میں ہی اسکا چین سکون چھین کر لے گیا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، کہ وہ اسے یہاں ایک سیلز مین کی حیثیت سے مل جائے گا۔

''آ، آپ یہاں ہوتے ہیں، بہت اچھا لگا، آپ کو یہاں دیکھ کر۔'' اس نے خوشی سے چھلکتی آواز میں بہت جذب سے کہا تھا۔ اس نے کچھ چونک کر جذبات کی شدتوں سے گلنار ہوتا چہرا لیے کھڑی، اسوہ کو کچھ تحیر سے دیکھا۔ اس نگاہ کی اجنبیت اور تحیر اسوہ کے جوش و خروش اور خوشی پہ اوس ڈال گئی۔ وہ ایک پل کو بالکل چپ سی ہو گئی تھی۔

''یہ آپ کا بل ہے۔ پے منٹ، وہاں کر دیں۔'' اس نے دائیں جانب کاؤنٹر پر اشارہ کر کے گویا رہنمائی کی۔ اسوہ سلگ کر رہ گئی۔

''اونہہ! ایک معمولی سیلز مین ہو کر یہ نخرہ۔'' اس نے ناک چڑھائی، اور اشیاء کا شاپر اور بل اٹھا کر پلٹی۔

معاً کچھ خیال آنے پر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

''سنو، صرف اچھی صورت پر اتنی بے نیازی کچھ جچتی نہیں، اور کچھ نہیں تو کم از کم کوئی عزت والا کام تو کرتے۔ یہاں تو ذرا سی لغزش پر تمہیں دو منٹ میں بے عزت کر کے رکھ دیا ہوگا۔'' وہ اپنی انا کو طنز کے پردے میں لپیٹ کر نظر انداز ہونے کا بدلہ چکا رہی تھی، مگر اس نے دیکھا۔ اسکی اتنی بات کے باوجود بھی اس کے وجیہ مردانہ چہرے پر نہ تو کوئی خجالت بکھری ہے، نہ ہی کسی قسم کی کوئی شکن، بلکہ وہ بہت مطمئن انداز میں اگلے کسٹمر کی سمت

متوجہ ہو گیا تھا۔ اسوہ پیر پٹختی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔

☆☆☆

ہارون کی اضطرابی کیفیت میں ہجانے کی آنے کے اضافہ ہی ہوا تھا۔ اماں سے کل اس کی حتمی بات ہوئی تھی، کیونکہ کل ہی ماموں نے ان سے ضوبا کی شادی کی تاریخ پکی کرنے کی بات کی تھی۔ وہ جانے کیوں شادی کی اتنی جلدی مچا رہے تھے۔ ہارون کو تو ایسا ہی لگنے لگا، جیسے انہیں ضوبا کی غلط کمپنی کا علم ہو گیا ہے۔ ساتھ ساتھ اس کی بے باکی کا بھی، جب ہی تو وہ اپنی ذمہ داری اس کے سر ڈال کر خود بری الذمہ ہونا چاہتے تھے، اور یہی بات ہارون کو تاؤ دلا رہی تھی، اور اسی تاؤ میں جب اس نے اماں سے حتمی انکار کیا، تو اماں ایک حد تک اسے سمجھانے کے بعد اب روٹھ کر اپنی نند کے ہاں چلی گئی تھیں۔ دو دن ہو گئے تھے انہیں گئے، اور اس ذہنی الجھن نے اسے بخار میں مبتلا کر دیا تھا۔ بھوک کی وجہ سے چڑچڑاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ نقاہت سی طاری ہو چکی تھی، جب ہی وہ بستر پر لیٹتے ہی غافل سا ہو گیا۔

اسے یونہی بے سدھ پڑے جانے کتنی دیر گزر چکی تھی، جب ہلکی سی آہٹ کے ساتھ ضوبا بہت محتاط سے انداز میں اندر داخل ہوئی۔ ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چائے کے ساتھ کچھ اسنیکس بھی تھے، اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

وہ ذرا سا آگے بڑھی اور اس پر جھک کر کاندھے کو پکڑ کر ہلکا سا جھنجھوڑا۔

''ہارون——!'' وہ خاموش رہا۔ ''ہارون!'' اس نے اب کی مرتبہ اس کی صبیح کشادہ پیشانی پر بکھرے بالوں کو سمیٹا۔ ہارون نے نقاہت زدہ سے انداز میں بوجھل پلکیں اٹھائی تھیں۔ جلتی ہوئی سرخ انگارہ آنکھوں میں اس وقت کیا تھا، ضوبا قطعی نہ سمجھی۔

''کچھ کھا لو ہارون! مجھے پتہ ہے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' اس کے لہجے میں ملائمت، نرمی اور محبت، سب کچھ تھا۔ ہارون نے جواب نہیں دیا۔ اس کا سلگتا ہوا ذہن دھویں سے بھرنے لگا۔ یہ وہی وجود تھا، جس سے اسے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ چہرا تھا جس نے بہت سے مقامات پر اس کی توہین کے بعد خوشی محسوس کی تھی، اور اب اس کی سب سے قیمتی متاع اس کی ماں تک چھین لی تھی۔ وہ اپنے بیٹے پر اسے ترجیح دے کر اسے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔

"ہارون۔ اٹھو نا۔" وہ ایک بار پھر پکار رہی تھی۔

ہارون کی پیشانی پر دیکھتے ہی دیکھتے سلوٹیں نمایاں ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے بھی بلا کی وحشت جھلکنے لگی تھی۔

ضویا نے اس کی نگاہوں کی وحشت سے خوف زدہ سا ہو کر پیچھے ہٹنا چاہا مگر اس نے تیزی سے بازو دبوچتے ہی ایک جھٹکے سمیت اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ ضویا اس اچانک حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔ اس قدر بدحواس ہوئی کہ حلق سے آواز بھی نہ نکل سکی۔

"بہت پسند ہوں میں تمہیں؟" اس کے حلق سے غراہٹ نما آواز نکلی تھی۔ ضویا کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ ہارون کے چہرے اور آنکھوں میں ایسی وحشت اُمڈ آئی تھی، جو کسی بھی انسان کو حیوان بنانے میں ایک پل نہیں لگاتی۔ ضویا بھی اس پل اس کی حیوانیت کی ہی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

کالج میں الوداعی پارٹی تھی۔ وہ سب جوش و خروش سے پروگرام بنا رہی تھیں۔ حوریہ بھی رابعہ کے ساتھ اس دن پہنے جانے والے لباس کو ڈسکس کرتی اس وقت بہت خوشگوار موڈ میں نظر آ رہی تھی، جب اس بھاری بھرکم گونج دار آواز پر اپنی جگہ سے اچھل گئی۔ پلٹ کر دیکھنے کی نوبت نہیں آئی، وہ خود سامنے آ گیا تھا۔ لبوں پر کھوکھلا ہوتی اور مخالف کو زچ کرتی ہوئی مسکراہٹ تو آنکھوں سے ٹپکتی وہی، جنوں خیزی جو حوریہ کو خوفزدہ کر دیا کرتی تھی۔

حوریہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اٹھنے کے لئے رابعہ کو اشارہ کیا۔

وہ جیسے ہی آگے بڑھی، ایزی نے لپک کر اس کا راستہ روک لیا۔

"تمہاری عزت کی پرواہ ہے جان من! جب ہی اپنے دوستوں کے بغیر آیا ہوں۔ بتاؤ کیا فیصلہ کیا؟" وہ لوفرانہ سے انداز میں بالوں میں ہاتھ پھیرتا اپنی آنکھوں سے گویا اس کے وجود کا پوسٹ مارٹم کر رہا تھا۔

"مم... میں لڑکوں سے دوستی کی قائل نہیں ہوں، تمہیں آخر مجھ میں ہی کیوں نظر آتی ہوں۔" اس کے خوف پر غصہ، اور جھنجلاہٹ غلبہ پانے لگی۔

"اوہ آئی سی۔" ایزی نے ہونٹ سکوڑ کر تمسخرانہ نظر اس پر ڈالی پھر بڑی ادا سے اس کی جانب جھک کر بولا۔

"ٹھیک کہتی ہو۔ حسین لڑکیوں کی تو مجھے واقعی کمی نہیں، البتہ یہ تمہارے مجھ سے پنگا لینے کی سزا ہے۔"

سگریٹ نکال کر سلگانے کے بعد اس نے گہرا کش لیا تھا۔ حوریہ کترا کر نکلنے لگی تھی، کہ ایزی نے اب کی مرتبہ اس کی کلائی اپنے فولادی ہاتھ میں جکڑ لی تھی، اور خفیف سا جھٹکا دے کر اسے اپنے مقابل کھینچ لیا۔ حوریہ کی کلائی پر جیسے الاؤ دہک اٹھے۔ نفرت، بے بسی اور شدید اشتعال نے، اس کی آنکھوں میں دھندی بھر دی۔

"تم.... میں تھوکتی ہوں تم پر، سمجھے۔" بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے وہ غرائی۔

"سنو احمق لڑکی! تم مجھ سے کبھی بھی اپنا آپ نہیں چھڑا سکتیں۔ یاد رکھنا اس بات کو۔" اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے وہ عادت کے مطابق دھمکی دے کر پلٹ گیا۔ حوریہ کی آنکھوں میں ٹھہری دھند نے پانی کی شکل اختیار کر لی، اور ٹپ ٹپ بے بسی کے آنسو بہنے لگے۔ رابعہ نے ٹھنڈی سانس بھری، پھر سر جھٹک کر تاسف سے اسے تکنے لگی۔

"سنو، کب تک اسے یہ تماشا کرنے دو گی۔ کسی سے اس کی شکایت کرو۔"

"وہ بہت غلط آدمی ہے رابی! میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔" اسے اپنی کمزوری کا احساس رلا رہا تھا۔ رابعہ بس اسے خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

روشن دان سے چھن چھن کر آتی سورج کی تیز شعاعیں براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں، وہ آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہا تھا۔ ایسا کیا تھا ان لمحوں میں کہ وہ اس حد تک گر گیا۔ احساس گناہ اسے رات سے اب تک جانے کتنی بار اذیت انگیز موت مار چکا تھا۔ انتقام تھا، نفرت تھی، یا پھر وحشت کی انتہا کہ وہ حواس کھو گیا تھا اور اب ایسی ندامت تھی، ایسی پشیمانی تھی، کہ وہ اندر ہی اندر کٹ رہا تھا۔ تب ہی کمرے کے باہر خدیجہ بیگم کے قدموں کی مخصوص آہٹ ابھری، اور اگلے لمحے وہ اندر چلی آئیں۔

"ہارون!" انہوں نے اسے ساکت اور گم صم پا کر بے اختیار پکارا۔

"ہارون! کیا ہو گیا بچے؟" خدیجہ بیگم اس کی اداسی کو پا کے تڑپ سی گئیں۔

"ہارون!" انہوں نے بڑھ کر اس کا سر سہلایا۔

خطرناک حد تک زرد پڑتی رنگت اور آنکھوں کے نیچے موجود حلقے۔ وہ تو اس کی

حالت دیکھ کر بے قرار سی ہو گئیں۔

"خفا ہو ماں سے۔" وہ ذرا سا مسکرائیں۔ ہارون نے اسی پل انہیں دیکھا تھا۔

"اف۔" ان کا دل کانپ سا گیا۔

"ہارون — میرے بچے...... کیوں رو دیا تو۔ ہاں ماں صدقے...... کوئی خفا ہوتا ہے تو ہوتا رہے، مجھے نہیں پروا۔ میں تو تیری پسند کی ہی لڑکی کو اپنی بہو بناؤں گی۔"

وہ اس کا ماتھا چومتے ہوئے بے اختیار ہو گئیں، تو ہارون نے بے اختیار سختی سے لب بھینچے تھے، اتنی سختی سے، کہ لہو کا ذائقہ اس کے منہ میں گھلنے لگا۔ وہ بے اختیار چیخا۔

"مت کچھ کہیں اماں! چپ ہو جائیں۔ مجھے کچھ نہیں سننا۔"

"کیوں...... کیوں نہیں سننا تو نے ...... ارے میں کہہ دوں گی بھائی سے، مجھے اپنے بیٹے سے بڑھ کر کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔"

"جب مجھ سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا اماں! تو پھر" مجھے چھوڑ کیوں چلی گئی تھیں۔ کیوں مجھے اکیلا چھوڑ دیا تھا!"

وہ کسی ننھے بچے کی طرح ہی ان کی آغوش میں منہ چھپا کر رو دیا تھا۔ اس وحشت سے کہ اماں کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔

"ک...... کیا — ہوا؟ کسی انہونی کا احساس انہیں ستانے لگا۔"

"سب کچھ ہی غلط ہو گیا اماں! کچھ بھی ٹھیک نہیں رہا۔" وہ یونہی گھٹ گھٹ کر روتا بے ربط بولتا رہا۔ خاصی دیر بعد وہ خود ہی سنبھلا تھا، اور تکیے میں منہ چھپا کر ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

"کتنی خوبصورت ہیں یہ...... ہے نا؟" حوریہ نے بے انتہا دلچسپی اور شوق کے عالم میں سامنے موجود وی آئی پی مہمان کی حیثیت سے براجمان ملک کی مشہور و معروف ناول نگار مسز ایف ایم چوہدری کو دیکھتے ہوئے رابعہ کی رائے لینا چاہی۔

"ہاں بلاشبہ۔" رابعہ نے پوری شدت سے سر ہلا کر تائید کی۔ وہ خود بھی لکھتی تھی اور ایک ماہنامہ میں اس کی تحریریں شائع بھی ہوتی تھیں۔

سالانہ تقریبات میں جہاں اور بہت سے اہتمام ہوتے تھے، وہاں شعری مقابلے کا

بھی انعقاد ہوا تھا جج کی حیثیت سے شاعرہ اور افسانہ نگار مسز ایف ایم چوہدری کو بلوایا گیا تھا، جو نہ صرف نوجوان نسل کی بلکہ ہر عمر کے لوگوں کی پسندیدہ ترین ادیبہ تھی۔ یونیورسٹی کے طالبات کا جوش و خروش دیکھنے کے لائق تھا۔ رابعہ اور حوریہ بھی بے حد مشتاق تھیں، اور انہیں رو برو پا کے تو گویا وہ مبہوت رہ گئی تھیں۔ فیروزی ساڑھی جس کے بارڈر پر شیشل کا انتہائی دیدہ زیب کام جھلملا رہا تھا۔ بالوں کا سادہ جوڑا اور فریش خوب صورت چہرا۔ انہیں اس عمر میں بھی باوقار جاذب نظر اور بے انتہا دلکش دکھلا رہا تھا۔

تقریب کے اختتام پر، رابعہ اسے زبردستی کھینچ کر ساتھ لے گئی تھی۔

"ہائے میم...... ہاؤ آر یو۔"

رابعہ کا اعتماد قابل دید تھا۔ مسز چوہدری جو لڑکیوں کو آٹوگراف دے رہی تھیں، ذرا کی ذرا متوجہ ہوئیں اور ایک حوصلہ افزا مسکراہٹ سے نوازا۔

"آپ کو آٹوگراف لینا ہے؟" لڑکیوں سے نپٹ کر وہ ان کی سمت متوجہ ہوئی تھیں۔

"نو میم...... مجھے تو آپ سے اصلاح لینی ہے اکچولی میں رائٹر ہوں، نوآموز رائٹر۔ کیا آپ میری —"

"وائے ناٹ، آپ آئیں۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

انہوں نے اس کی بات کاٹ کر اپنا وزیٹنگ کارڈ بیگ سے نکال کر رابعہ کی سمت بڑھایا اور چیئرمین کی طرف بڑھ گئیں۔

"ہائے کتنی یونیک سی ہیں؟" حوریہ نے اشتیاق سے کہا۔

"ہوں مگر ان کا بیٹا تو بالکل یونیک نہیں ہے، ہر لحاظ سے الٹ۔ جانے کس پر پڑا ہے۔" رابعہ نے منہ بنایا۔

"تم ان کے بیٹے کو کیسے جانتی ہو؟" حوریہ ابھی تک کارڈ کو دیکھ رہی تھی۔

"پہلے نہیں جانتی تھی، آج پتا چلا ہے۔ ایزی ان کا ہی بیٹا ہے۔"

"واٹ۔" حوریہ کو گویا کرنٹ لگا تھا۔ کارڈ اس کی انگلیوں کی گرفت سے پھسل کر زمین پر جا گرا۔

☆☆☆

بہت دنوں کے بعد دھوپ نکلی تھی اور بہت دنوں کے بعد ہی وہ اپنے کمرے سے باہر آیا تھا۔ خدیجہ بیگم صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ کر عینک لگائے سبزی بنانے میں مشغول تھیں۔ اسے دیکھا تو مسکرائیں۔

''یہاں آجاؤ دھوپ میں۔'' خدیجہ بیگم نے اس کے لیے اپنے برابر جگہ بنائی۔
ہارون کے چہرے پر کھنڈی زردی اور اضمحلال کچھ اور گہرا ہو گیا۔ یہ ان کی توجہ، ان کی محبت اور شفقت سب اس کے لیے ہے۔ اگر انہیں پتہ چل جائے میں کیا کر چکا ہوں، تب بھی یہ ''اف۔''

اس نے بے ساختہ جھرجھری لی اور آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ انہیں نہ بھی پتہ چلے، تب بھی خدا تو جانتا ہے، کہ میں کتنا لتھڑ چکا ہوں گندگی میں۔
''مائی گاڈ نیس، یہ کیا کر دیا میں نے۔''
اس نے مٹھی میں پیشانی کے بال جکڑ کر جھٹکا دیا
''ہارون! کیا ہوا بیٹے، کیا سر میں بہت درد ہے؟''
خدیجہ بیگم سے اس کی یہ حرکت چھپی نہ رہی تھی۔ سو تشویش فطری تھی۔ ہارون کے جبڑے بھنچ گئے۔

''اماں!'' وہ کراہا تھا۔
''ہاں! اماں کے چاند! مجھے بتاؤ ایسا کیا ہوا میرے بچے، کہ تجھے چپ سی لگ گئی۔ نہ ڈیوٹی پہ جاتے ہو، وہ تو خیر ٹھیک ہو کر چلے جاؤ گے مگر یوں گم صم کیوں ہو گئے ہو؟''
انہوں نے دہائی دینے کے انداز میں کہنا شروع کیا، جبکہ ہارون ایک بار پھر پل صراط پر آ گیا تھا۔

''مجھے اس لڑکی کا پتہ دو، میں رشتہ ڈال آتی ہوں۔''
انہوں نے پیار سے کہتے ہوئے اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔
ہارون کا دل اداسی میں ڈوب گیا۔ ''اماں! اس لڑکی کی شادی ہو گئی ہے، اب وہ مجھے نہیں مل سکتی۔''
''اف... ایک جھوٹ کو چھپانے کیلئے، کتنے جھوٹ بولوں گا میں۔'' اس کے ضمیر نے ملامت کی تھی۔ اماں اداس سی ہو کر اسے دیکھنے لگیں، پھر گہرا سانس کھینچا۔

''اوہ تو اس لیے تو اداس ہو رہا ہے۔'' وہ معصوم سادہ عورت اسی نتیجے پر پہنچیں۔
ہارون نے جھکا سر نہیں اٹھایا۔
''اماں!'' وہ خاصی دیر بعد بولا۔ ''آپ ضوبیا کے لیے ماموں کو ہاں کہہ دیں، اور تاریخ کوئی نزدیکی رکھیے گا۔'' وہ اٹھا اور قدم گھسیٹتا ہوا باہر نکل گیا۔ خدیجہ بیگم حیران سی اس کے الجھے رویے کو سوچنے لگیں۔

☆☆☆

ونڈ اسکرین پر شفاف بوندوں کا رقص جاری تھا۔ وہ بہت مگن انداز میں گاڑی ڈرائیو کرتے زیر لب گنگنا رہی تھی، جب کوئی شخص اس کی گاڑی کے نیچے آتے آتے بچا۔ اگر وہ بروقت بریک نہ لگا دیتی تو جانے کیا ہو جاتا۔ دروازہ کھول کر وہ تیزی سے باہر نکلی، اور لپک کر اس شخص کے پاس آئی، وہ خود بھی اسی کی طرح اس دھچکے سے بمشکل سنبھلا۔ ابھی اسی تشکر و ممنونیت کی کیفیت سے باہر نہیں نکلا تھا۔
''آہم...... مے آئی ہیلپ یو؟'' تیزی سے برستی بارش کی بوچھاڑ میں بھیگتا وہ پچاس سے پچپن سال انتہائی گریس فل شخص تھا، جسے دیکھ کر بندہ خواہ مخواہ مرعوب ہو جائے۔
اس آواز پر وہ چونکا تھا، اور کچھ تحیر آمیز حیرانی سے اسے دیکھا۔
''تو تھینکس۔'' اور قدم بڑھا دیے۔
اسوہ کچھ خفیف سی ہو گئی۔
''آئی ایم سوری سر! غلطی میری ہی تھی، لیکن میں......''
وہ بھاگ کر اس کے مقابل آئی تھی، اور ساتھ چلتے ہوئے وضاحتی انداز میں بولی۔
''اٹس آل رائٹ۔ ڈونٹ مائنڈ......'' وہ ذرا سا مسکرایا۔
نہ جانے کیوں اسوہ کو اس سے کچھ عجیب سی اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔
''سر! اگر آپ مائنڈ نہ کریں، تو میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔ آئی مین، بارش ہو رہی ہے اور آپ پیدل۔
پتہ نہیں کتنی دور گھر ہے آپ کا۔''
اسوہ نے کھسیا کر کہا۔
''لگتا ہے آپ کچھ زیادہ ہی حساس ہیں بیٹا! آئی ایم آل رائٹ اور میں چل سکتا

ہوں۔ بارش کیا کہتی ہے یہ تو خدا کی رحمت ہے۔" اس نے مسکرا کر اس کی خجالت کم کرنا چاہی۔

"مگر مجھے خوشی ہوگی آپ کی مدد کر کے، پلیز!" وہ اب رک گئی تھی اور بہت مودب ہو کر کہہ رہی تھی۔ اس شخص نے چند ثانیے کچھ سوچا، پھر کاندھے اچکا کر گویا ہامی بھر لی۔ راستے بھر وہ اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتا رہا تھا اور وہ بہت باادب بی بی بچی کی سنجیدگی سے جواب دیتی رہی۔

"بس یہیں روک دو بیٹی! ہمارا گھر تنگ گلی میں ہے، آپ کو دقت ہوگی۔" اس نے کہا تو اسوہ نے کچھ کہے بغیر گاڑی روک دی۔

"میں آپ کو گھر تک چھوڑ دیتی ہوں۔" وہ ان کے ساتھ ہی اتری تھی۔ دو منزلہ چھوٹا سا گھر، جس کا سال خوردہ رنگ اڑا دروازہ اپنے مکینوں کی بدحالی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ شخص اس کے اخلاق سے اچھا خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔

"او کے سر! اب میں چلتی ہوں۔" دستک وہ دے چکا تھا جب اسوہ نے ان سے اجازت چاہی۔

"اندر آؤ، چائے تو پیو بیٹا۔"

اس سے پہلے کہ وہ انکار کرتی، دروازہ کھل گیا، اور دہلیز کے پار جو صورت تھی، اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اس پر منکشف کیا، کہ وہ کیوں کشاں کشاں وہاں تک چلی آئی ہے۔ جسم و جاں میں خوشگوار، پر حدت سی سنسنی کا احساس پھیلتا چلا گیا۔

"اتنی دیر بابا! میں کب سے پریشان ہو رہا تھا۔ آپ نے سیل بھی آف کر رکھا تھا۔"

اس نے جیسے اسے دیکھا ہی نہیں تھا اور وہ جیسے ان لمحوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے چکر میں تھی۔

"دم تو لو بابا کی جان! بتاتے ہیں۔ پہلے ان سے ملو، مس اسوہ خان! ابھی مجھے یہاں تک ڈراپ کرنے آئی ہیں۔"

وہ شخص مسکراتے ہوئے بولا تھا، تب ہی وہ اس کی سمت متوجہ ہوا اور اگلے ہی لمحے اس کی پیشانی پر بل سے پڑ گئے تھے۔

"تم.....؟" اس نے دانت بھینچے تھے۔

"ہم..... میں..... "

"جی، جانتا ہوں میں آپ کو۔ سڑکیں تو گویا آپ کی جاگیریں ہیں، اور ہم جیسے لوگ، آپ کی نظروں میں کیڑے مکوڑوں سے بھی حقیر ہیں۔" وہ بولا نہیں غرایا تھا۔ آن کی آن میں اس کا چہرا غصے کی زیادتی سے دہک کر انگارہ ہوا تھا، تو لہجہ شدید قسم کی حقارت و نفرت سے بوجھل۔ اسوہ کی سمجھ میں نہیں آیا، کہ وہ اس عزت افزائی پر دکھی ہو، یا پھر اس کے پہلی مرتبہ بغیر تعارف کے پہچان لینے پر خوش، جبکہ وہ شخص ارے ارے، ہائیں کرتا ٹوکتا رہ گیا اور اسوہ سر جھکائے سرخ چہرا لیے کھڑی رہ گئی۔

"اگر میرے بابا کو ذرا سا بھی نقصان پہنچتا، تو میں اسی وقت تمہارا گلا گھونٹ کر تمہیں جان سے مار ڈالتا۔" وہ اسی پرجلال لہجے اور کٹیلے انداز میں بولتا کچھ خیال آنے پر یکلخت پلٹا۔

"اور ہاں بابا! آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟" وہ باقاعدہ انہیں چھو کر دیکھتے ہوئے فکرمندی سے بولا تھا، کہ وہ شخص جو اس کی اسوہ کے ساتھ اس درجہ بدسلوکی پر بے حد خفا سا اسے دیکھ رہا تھا۔ بمشکل مسکراہٹ ضبط کر پایا۔

"بندۂ خدا! تمہارے سامنے صحیح سالم اپنے پیروں پر کھڑا ہوں اور مجھے بتاؤ، کیا بدتمیزی ہے؟" انہوں نے آنکھیں نکالیں، جبکہ اسوہ آنکھیں جھپک جھپک کر تیزی سے امڈتے آنسو اندر اتارنے کی کوشش میں ہلکان تھی۔

"بابا! یہ..... آپ اسے نہیں جانتے۔ اسی کی وجہ سے میرا ایکسیڈنٹ بھی ہوا تھا۔" اس نے بھرپور شکایتی انداز میں کہہ کر گویا ان کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔"

"وہ تو میں تمہاری پٹی سے اندازہ کر چکا ہوں، پھر بھی بیٹے پلیز بی ہیو یور سیلف۔ اب سوری کرو۔ کتنی بری بات ہے، وہ ہماری مہمان ہے اور تم....."

"میں چلتی ہوں۔" وہ بہت مشکلوں سے ضبط کیے ہوئے تھی، بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ آنسو روکتے روکتے بھی بہہ نکلے تھے، اور اسے اتنی خفت ہو رہی تھی کہ حد نہیں۔

"ارے ارے..... ایسا نہ کرو بیٹا! بس، یہ میرا بیٹا بہت جذباتی ہے میرے لیے۔ ابھی دیکھنا کان پکڑ کر تم سے معافی مانگے گا۔ چلو ذرا معاذ! پہلے ہم باپ بیٹی کے لیے چائے بنا کر لاؤ۔"

انہوں نے ہڑبڑ سے ہوتے معاذ کو کام سے لگایا، اور اسوہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر

نرمی و ملائمت سے کہا۔

''اس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں بیٹا!''

''اٹس او کے۔'' وہ یہی کہہ سکی، اور ایک بار پھر قدم واپسی کی سمت موڑے، مگر وہ شخص جہاں خوب صورت شخصیت رکھتا تھا، وہاں بات منوانے کے گر بھی جانتا تھا۔ اس نے اتنی نرمی، اتنی محبت اور اصرار سے روکا، کہ وہ انکار کر ہی نہ پائی پھر دل بھی تو آڑے آ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے ملول سی بیٹھی تھی، جب وہ چائے لے کر آ گیا، مگر اس نے دل کی مچلتی خواہش سے نظریں چرا لیں اور نظریں نہیں اٹھائی۔

''معاذ! ہماری بچی سے سوری کرو۔'' وہ شخص بہت شائستہ اطوار رکھتا تھا۔

''سوری۔'' وہ تڑخ کر بولا۔

اسوہ نے پلکیں اٹھائیں، وہ ماتھے پر ہزار شکن لیے مارے باندھے بیٹھا تھا۔ اس کا دل اتنا بوجھل ہوا کہ وہ ایکدم سے اٹھ گئی، پھر ان کے روکنے کے باوجود بھی وہ رکی نہیں تھی۔

''جاؤ معاذ! بیٹے! اسوہ کو اس کی گاڑی تک چھوڑ آؤ۔''

وہ طوعاً و کرہاً اٹھا، اور اس کے ساتھ چلتا بیرونی دروازے تک آ گیا۔

''رہنے دیں، میں چلی جاؤں گی۔'' اسوہ کو اس کی یہ ناگواری بہت تکلیف دے رہی تھی۔ اپنے جذبوں کی ناقدری پر دل خون ہوا جا رہا تھا۔

''اچھے بابا کی ہر بات میں عبادت سمجھ کر پوری کرتا ہوں۔'' وہ نروٹھے پن سے بولا۔

بارش اب رک چکی تھی۔ ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ فضا میں بے انتہا ٹھنڈک تھی۔ اس من چاہی رفاقت کا ایک ایک پل خوشگواری اور کیف لیے تھا۔

''تھینکس۔'' وہ گاڑی تک پہنچی تو دروازہ کھولتے ہوئے، اسے مڑتے دیکھ کر بولی۔

''میں بہت اچھی چائے نہیں بناتا، کہ اس کے لیے تھینکس کہا جائے۔''

''ہاں، چائے تو واقعی بالکل اچھی نہیں تھی۔ اب پوچھو، تھینکس کس بات کا، تو وہ اس لیے کہ تم نے پہلی بار بغیر انٹروڈکشن کے مجھے پہچان لیا۔'' وہ ہنس دی، معاذ گنگ کھڑا تھا۔ سجا وہ پلٹا، اور تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔ اسوہ نے تب تک اسے دیکھا جب تک وہ نظر آیا تھا پھر اس نے گنگناتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

☆☆☆

ویسے تو اسی کے انکار کے باعث تھی۔ وہ ماما تو سارے کام منٹوں میں نپٹا لے گئے۔ ممانی اور ماموں تک غالباً اماں نے اس کے انکار اور ضد کی بھنک بھی نہ لگنے دی تھی، ورنہ ماموں تو شاید بھانجے کی محبت میں خاموش ہی رہتے، مگر ممانی ضرور اسے انا کا مسئلہ بنا کر بیٹھ جاتیں۔ وہ تو اب بھی خفا خفا سی ہی تھیں۔ ہارون کا روشن مستقبل اور اونچی پوسٹ بھی ان کے دل سے اس کی نفرت کو نکال سکی تھی، نہ ہی اسے اس نئے رشتے سمیت قبول کروا سکی تھی۔ البتہ ماموں بہت خوش تھے۔ وہ یونہی تو اس پر اتنا وقت اور پیسہ برباد نہیں کرتے رہے تھے۔ یہ بات ذہن میں رکھ کر ہی انہوں نے اسے منزل پر پہنچایا تھا۔

''تمہیں تو خوشی سے بھنگڑا ڈالنا چاہیے تھا آخر من چاہی مراد پائی ہے۔''

ممانی جان نے دلہن بنی، سپاٹ چہرا لیے بیٹھی ضویا کو دیکھ کر اپنی بھڑاس نکالنا چاہی تھی۔ ضویا نے ایک خاموش نظر ان پر ڈالی تھی، اور سر جھکا لیا تھا۔ اس طرح گم صم و ویران اور بجھی ہوئی تو وہ پچھلے ڈیڑھ مہینے سے تھی۔ وہ ماں ہو کر بھی اس تبدیلی کو محسوس نہ کر سکی تھیں، تو پھر، اس نے لب بھینچ کر آنکھوں کی نمی کو باہر آنے سے روکا۔ نکاح ہوا، ایجاب و قبول کے مراحل طے ہوئے۔ وہ اپنے وجود کو کسی شکنجے میں ڈھلتے محسوس کر رہی تھی۔ وہ محبت، وہ چاہت، وہ خوشی جانے کہاں کھو گئی تھی، وہ نہیں جانتی تھی۔ رخصتی ہوئی، اور وہ اس گھر کے ان مکینوں میں آ گئی جن سے کبھی وہ بالکل لاتعلق رہی تھی، اور نفرت رکھتی تھی ان سے، اور پھر دل کے موسموں میں تغیر آیا، اور یہی مکین اسے خود سے بھی عزیز ہو گئے، اور اب اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اسے ان مکینوں سے نفرت، بغض اور کینہ محسوس ہوا کرتا تھا۔ ہارون کا اضطراب بھی بڑھ گیا۔

☆☆☆

رات نصف سے زیادہ بیت چلی تھی، اور آخر نومبر کی یہ قدرے خنک رات تھی۔ چاند کا سفر کب سے جاری تھا۔ جاڑے کا چاند کہر میں لپٹا کسی قدر تھکا ماندہ اور ملول نظر آ رہا تھا، مگر ہارون اسرار کے اضمحلال اور تھکان سے زیادہ ہرگز نہیں، جو خود سے بھی غافل کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کی سحر طراز بولتی آنکھیں کسی قبرستان کی مانند ویران خاموش اور سربستہ راز کی طرح تھیں۔ خود سے لاتعلقی کا یہ عالم تھا، کہ ہونٹوں کے درمیان دبا سگریٹ سلگ سلگ کر لبوں کے کنارے کو جھلسانے لگا۔ تپش کا احساس پا کر ہی وہ قدرے چونکا اور

سگریٹ لبوں سے نکال کر پھینکتے ہوئے جوتے سے مسل دیا اور ہاتھ میں پکڑے، اس مخملیں کیس کو دیکھا، جو کچھ دیر قبل ہی اماں اسے دے گئی تھیں۔

''اب جاؤ اپنے کمرے میں، بچی کو کیوں انتظار میں بٹھایا ہوا ہے۔''

انہوں نے جاتے جاتے تاکید کی تھی، اور وہ گہرا سانس کھینچ کر سوچنے لگا تھا کیا واقعی وہ اب بھی اس کی منتظر ہوگی، اور دل تسخرانہ ہنسی ہنسنے لگا تھا۔ اپنے کمرے کی جانب جاتے اس کے قدم من من بھر کے ہونے لگے۔ جی چاہا نہیں سے پلٹ کر ایسی جگہ بھاگ جائے، جہاں ضویا ہو نہ اس سے وابستہ احساس گناہ، مگر اب دل کی ماننے کا وقت گزر چکا تھا۔

دروازہ کھول کر وہ جس پل اندر داخل ہوا، اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ نہ انداز میں کوئی سرمستی، نہ نگاہ میں بے قراری۔ اس کا ہر انداز بہت بجھا ہوا تھا، وہ یونہی چلتا ہوا آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

ضویا دلہن کے تمام لوازمات سے عاری، بالکل سادہ لباس میں دھلے دھلائے چہرے سمیت بیڈ پر بیٹھی تھی۔ کھلے ہوئے بالوں نے پوری پشت کو ڈھانپ رکھا تھا۔ صبح کی باحیت اور بے کل کا اب نام و نشان بھی نہیں تھا۔

''یہ اماں نے دیا تھا۔'' ہارون نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالے بغیر کیس اس کے پہلو میں رکھنا چاہا، جب وہ رکھائی سے کہتے اسے ٹوک گئی تھی۔

''مجھے اس کی ضرورت نہیں، بلکہ مجھے کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔''

ہارون نے ٹھنڈا سانس بھرا، اور ایک خجالت سے بھرپور نگاہ اس کے سجے ہوئے نقوش پر ڈالتے ہوئے، کیس اس کی گود میں رکھنا چاہا تھا، جب وہ بدک کر اچھل کر دور ہوئی تھی۔

''ڈونٹ ٹچ می، انڈر اسٹینڈ۔'' اہانت آمیز لہجہ حقارت لیے ہوئے تھا۔ ہارون کا سرخ و سفید چہرا آن کی آن میں متغیر ہوا تھا۔ بے بسی کا اظہار اس کے ہر نقش سے چھلکا تھا۔ کچھ دیر وہ لب بھینچے خود پر ضبط کرتا رہا، اس کے باوجود جب کچھ دیر بعد بولا، تو آواز میں لرزش کے ساتھ ہی بھی واضح محسوس ہوئی تھی۔

''مجرم ہوں تمہارا، جو غلطی ہوئی ہے، اس کی تلافی کو ممکن نہیں مگر ضویا! میں تمہیں خوش رکھوں گا۔ بس تم بھول جاؤ اس بات کو اور مجھے معاف.....''

''معاف کر دوں تمہیں اور بھول جاؤں، یہ اتنا آسان نہیں ہے مسٹر!'' وہ چیختی

ہوئی نظروں سے اسے گھورتی حلق کے بل غرائی، تو ہارن اس کی آواز کے بلند والیوم سے گھبرا کر اسے دیکھنے لگا۔

''آہستہ پلیز! اماں نے سن لیا تو.....؟''

''ہاں تم تو چھپاؤ گے ہی اپنے اس گناہ کو، مگر یاد رکھو، میں تمہیں سکون سے نہیں رہنے دوں گی۔ جو زخم تم نے مجھے دیا ہے، وہ کبھی بھرنے والا نہیں، مگر میں تم سے دن رات کا خراج وصول کروں گی۔ یاد رکھنا۔'' وہ انگلی اٹھا کر چنگھاڑی۔ ہارون ٹھٹک سا گیا، اور کچھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا یہ روپ دیکھنے لگا۔

''ضویا! پلیز..... دیکھو، میں شرمندہ ہوں۔ اس شب کے بعد سے آئینے میں نگاہ ملا کر خود کو نہیں دیکھ سکا۔

م..... مجھے.....''

''آئی ہیٹ یو۔ تم سسک سسک کر بھی مر جاؤ، میرے سامنے تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی سنا تم نے۔''

وہ ہسٹریک ہو کر چلائی۔ ہارون اس کا یہ تحقیر آمیز انداز دیکھتا رہا، جبکہ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

حوریہ نے لب بھینچ کر خود پر ضبط کے کڑے پہرے بٹھائے تھے، اور جھکا سر کچھ مزید جھکا کے آگے بڑھنا چاہا، تو ایڑی جو ہیڑھیوں میں ناگیں پیارے بہت ریلیکس انداز میں بیٹھا نظروں کو اس پر فوکس کیے ہوئے تھا۔ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کے مقابل آتے ہوئے راستہ روک لیا۔

''سنو! تم اس قدر مغرور اور بدتمیز، خود سر، کیوں ہو؟'' اس کی پیشانی پر موجود سلوٹوں کو محظوظ مسکراہٹ سے تکتے ہوئے وہ بہت دوستانہ سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''یہ خود سری، بدتمیزی اور نخوت تم جیسے ایڈیٹ اور اوباش لڑکوں کو ان کے مقام پر رکھنے کے لیے ہے۔''

اس کا ضبط چھلکا، اور وہ پھٹ پڑی تھی۔

''یہ رکھ لو، نیا ناول ہے۔ رات کو بات کیا کروں گا تم سے۔'' اس نے ننی ان سنی

کرتے ہوئے سلور کرے چھپاتا ہوا موبائل فون اس کی سمت بڑھایا۔ جو دیہ اس کی اس درجہ ڈھٹائی پر آگ بگولہ ہو گئی۔ اس نے وہ سیل فون اس سے تقریباً جھپٹا، اور طیش کے عالم میں اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ "میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر، اور اس موبائل فون پر بھی۔ چھوڑ دو میری جان! ورنہ میں اب تمہاری ماں سے تمہیں سیدھا کراؤں گی۔"

ماں کا نام سن کر ایزی آتش فشاں بن گیا۔ "سنو۔ یہ خیر سگالی کی آخری کوشش تھی، جو تم نے ٹھکرائی ہے۔ اب ذرا سنبھل کر رہنا، اس لیے کہ ایزی معاف کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں ہے۔"

بھاگنے کے انداز میں وہاں سے آگے بڑھی تھی، جب ایزی نے للکار کر بہت سرد لہجے میں وارننگ دی تھی۔

☆☆☆

قل یو نیفارم میں، وہ پولیس اسٹیشن جانے کو بالکل تیار تھا۔ بائیک کی چابی اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے اس کے انداز سے تھکن اور چہرے سے اضطراب جھلک رہا تھا۔ ضویا نے ایک نظر اسے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ وہ آج بھی اتنا ہی امپریسو، اور گریس فل تھا، بس اس کے دل نے دھڑکنوں کے انداز بدل لیے تھے۔

نگاہوں میں وہ رنگ نہیں رہے تھے۔

"ضویا! آج شام میں تیار رہنا۔ اماں کہہ رہی تھی تمہیں کہیں گھمانے کو لے جاؤں۔" بہت محتاط سے لہجے میں کسی قدر جھجک تھی یا انجانا سا خوف۔ ضویا نے تلخی سے اسے دیکھا اور تڑخ کر بولی۔

"مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"مگر اماں..."

"تم ان سے بھی یہی کہہ دینا۔" وہ گستاخانہ انداز میں چیخی، تو ہارون خاموش سا ہو گیا۔

"میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتا۔ وہ پریشان ہوں گی، وجہ پوچھیں گی۔" وہ بیچارہ لاچار سا ہو رہا تھا۔

"تو وجہ بتا دینا۔" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا، اور سر تک کمبل تان لیا۔ ہارون

لب بھینچے کھڑا رہا، پھر تھکے ہوئے انداز میں باہر نکل گیا۔ اسے ضویا کی کسی بات پر غصہ نہیں آیا تھا۔ اسے غصہ آ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اسے اس رویے میں حق بجانب سمجھ رہا تھا۔ وہ بے خوف ہو گئی تھی اس لیے کہ سارا خوف اس نے اپنے اندر بھر لیا تھا۔ وہ اسے طعنے دیتی تھی۔ بلند آواز سے چیخ کر وہی بات کرتی تھی، جسے وہ سرگوشی میں بھی سننا نہیں چاہتا تھا، اور پھر اس کے چہرے پہ بکھری اذیت کو دیکھ کر طنزیہ ہنسی ہنستی تھی۔

"ڈرتے ہو، اپنی ماں سے، اپنا گناہ چھپانا چاہتے ہو، حالانکہ ڈرنا تو تمہیں رب سے چاہیے تھا۔"

اور تب اس نے بے تحاشا سرخ رت جگوں کی مظہر آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اللہ سے ہی تو ڈرتا ہوں، تب ہی احساس ندامت اور گناہ کا احساس، مجھے پل پل کچوکے لگا رہا ہے۔

ضویا!"

اس کے لہجے میں اتنی یاسیت، اتنی بے چارگی اور تھکن چھلکی تھی، کہ ایک پل کو ضویا کا پتھر دل بھی موم ہونے لگا تھا۔

"میں تمہارے سامنے صفائی دینا نہیں چاہتا، کہ میں ایسا نہیں ہوں۔ یہ ایک لمحے کی لغزش تھی۔ ایک ایسی بھول، جو عمر بھر کے روگ کی صورت میں، میرے گلے کا طوق بن چکی ہے۔ میری سانس، میرے سینے میں اسی روز سے اٹکی ہے۔ میری روح میں اضمحلال در آیا ہے۔ ضویا! یہ گناہ کا احساس ہے، جو مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا۔ مجھے لگتا ہے ضویا! اگر تم مجھے معاف نہیں کرو گی تو میں یونہی گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گا۔"

وہ دھیمے لہجے میں کہتا مضطربانہ انداز میں دونوں ہاتھوں کو مسل رہا تھا۔ ضویا نے ایک نظر اس کی شکستگی اور درماندگی کو دیکھا، اور عجیب سے انداز میں ہنس پڑی۔

"تم اسی طرح جلتے رہو۔ میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔" وہ ہونٹ سکوڑ کر بولی تھی۔

ہارون نے بری طرح سے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم محبت کرتی تھیں مجھ سے، ایسی بھیانک سزا مت دو مجھے۔"

"میں تمہیں معاف کرتا تو دور کی بات ہارون! میں تمہیں یہ بھولنے بھی نہیں دوں گی۔"

ہارون نے اس کی سفاکی کو محسوس کیا تھا، اور یکایک اس کی مضطرب بے چین بھیگی آنکھوں میں وحشت سی در آئی تھی۔ اس نے جاتی ہوئی ضوبیا کا بازو دبوچا تھا، اور ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی جانب پھیر کر منہ پر ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کر دیا تھا۔

"کیوں نہیں بھولے وہ گی تم مجھے کیوں معاف نہیں کرو گی، جبکہ تم اس گناہ میں میرے ساتھ شریک تھیں، اس کا انداز وحشت بھرا تھا۔ ضوبیا کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنا آپ چھڑانا چاہا، مگر وہ تو جیسے اس پل حواسوں میں ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا چہرا اپنے فولادی ہاتھ میں جکڑ کر بھینچتا ہوا سرد غراہٹ زدہ لہجے میں پھنکنے لگا تھا۔"

"کیا اس رات تم جان بوجھ کر میرے کمرے میں نہیں آئی تھیں، اور اس سے پہلے متعدد بار رات کی تنہائی میں ایک اکیلے جوان مرد کے پاس، جو رشتے میں تمہارا محرم نہیں تھا مرد اور عورت کی تنہائی میں شیطان ان کے درمیان آ جاتا ہے، پھر وہی ہوتا ہے جو اس رات ہوا، پھر، پھر یہ واویلا کیوں؟ بولو میں اگر احساس جرم میں مبتلا ہو کر تم سے معافی مانگتا ہوں تو تم کس بنا پہ اکڑتی ہو؟"

وہ ہذیانی انداز میں چلاتا، اس کے منہ پہ تھپڑوں کی برسات کر رہا تھا۔

"میں تو اس رات حواسوں میں نہیں تھا۔ تم تو نارمل تھیں، روک سکتی تھیں مجھے۔ کیوں نہیں روکا، بولو، بولو، جواب دو۔" اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور ضوبیا اتھل پتھل ہوتی سانسوں کو سنبھالنے لگی، مگر تب اس کی بے ترتیب سانسیں جیسے تھمنے لگی تھیں، جب اس نے دہلیز پہ پتھرائی ہوئی آنکھیں لیے کھڑی خدیجہ بیگم کو تیورا کر گرتے دیکھا۔ بے اختیار ہی اس کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔

☆☆☆

اس نے جھجکتے ہوئے دروازے پر دستک دی تھی۔ پھر اجازت ملنے پر اندر داخل ہو گئی۔

"السلام علیکم مام!" اس نے استڈی ٹیبل پر جھکی مام کو سلام کیا۔

"ہوں، وعلیکم السلام کیسے آنا ہوا؟" اس نے سر اٹھائے بغیر اسی محویت کے عالم میں پوچھا۔

"وہ مام! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" ہاتھ مسلتے ہوئے وہ خود میں ان کی متوقع ناراضی کو سہنے کا حوصلہ پیدا کرنے لگی۔

"ہوں بولو۔" وہ اب قلم رکھ کر اس کی سمت متوجہ ہو گئی۔

"مام چتر کار والے ڈانس کلاسز کا آغاز کر رہے ہیں۔ مجھے ڈانس سیکھنے کا بہت شوق ہے۔ مام پلیز۔"

"کالج میں تمہاری پوزیشن مزید ڈی گریڈ ہوئی ہے، اور تمہیں ڈانس سیکھنے کی سوجھ رہی ہے، شیم فار یو۔"

"صرف پچاس ہزار روپے کی تو بات ہے مام!" اس نے ضد کی۔

"اوکے فائن سیکھ لو یہ ڈانس بھی، مگر اسٹڈی کا حرج نہیں ہو۔ یہ فورتھ ایئر ہے۔ اس کے بعد میں تمہاری شادی کر دوں گی۔"

مام نے چیک کاٹ کر اسے تھماتے ہوئے اپنے فیصلے سے بھی آگاہ کیا۔

یہ اس سے اگلی شام کی بات تھی، جب وہ چتر کار اکیڈمی میں اسی سلسلے میں آئی تھی، جب پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کر کے مین گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے وہ اسے اچانک ہی راستے میں مل گیا تھا، اسے دیکھ کر چونکا، پھر ایک نظر چتر کار کے بورڈ پہ ڈال کر کچھ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ اسوہ جو اسے یوں غیر متوقع طور پر سامنے پا کر خوشگوار حیرت میں مبتلا تھی۔ اس کا یہ انداز نوٹ نہ کر سکی۔

"میں یہاں ڈانس کلاسز لینے آئی ہوں۔" اس نے بتایا۔

"اوہ آئی سی۔" معاذ نے لب بھینچ کر سرد نظروں سے اسے دیکھا، پھر چند ثانیوں کے توقف کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ آپ وہاں چند لمحے رک کر میری بات سن سکتی ہیں۔

اس نے انگشت شہادت سے سامنے ریسٹورنٹ کی جانب اشارہ کیا تو اسوہ حیرت کی زیادتی سے مرنے والی ہو گئی۔

"سر کے بل جناب، مگر سوچ لیں، اسکنڈل نہ بن جائے آپ کا۔" پھر حیرت پہ قابو پا کر وہ شریر سے انداز میں بولی تو معاذ نے بہت سرد نظروں سے اسے دیکھا، اور کچھ کہے بغیر قدم بڑھا دیے۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے وہاں تک آئی تھی۔

"چائے نہیں پلائیں گے؟" بالوں میں جکڑا کلپ نکال کر پھر سے لگاتے ہوئے اس نے بڑی سرشاری سے کہا۔

"اگر میں کہوں، آپ یہ ڈانس کلاسز نہیں لیں گی تو؟"

"تو نہیں لوں گی۔" اس کی ادھوری بات کو اس نے بہت سرعت سے مکمل کر دیا۔ اسے یہ سوچ ہی آسمان کی بلندیوں پہ اڑا رہی تھی کہ وہ ماؤنٹ ایورسٹ جیسا شخص اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اور کوئی بات منوا رہا تھا۔

"تو ٹھیک ہے مت لو، اوکے۔ میں چلتا ہوں۔"

اس کا چہرہ بے تاثر اور سنجیدہ تھا۔

اسوہ کا دل بجھ کر رہ گیا۔ "ارے رے! یہ کیا بات ہوئی آپ کو مجھے کم از کم یہ تو بتانا چاہیے کہ آپ نے مجھے یہ حکم کیوں دیا ہے؟" وہ ذرا سا جھنجلائی۔ وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔

"آپ کے اطمینان کے لیے اتنا کافی ہونا چاہیے کہ یہ ایک اچھی نصیحت تھی، جو میں نے آپ کو کی۔ یہ میرے بابا نے مجھے کی تھی۔"

"آپ بھی اس کلاسز لے رہے تھے۔" اس نے معصومیت کا تاثر دیتے چوٹ کی۔ معاذ نے اس کی آنکھوں میں مچلتی شرارت کو سنجیدگی سے دیکھا اور جواب دیے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔"

"سنیں معاذ!" وہ بھاگ کر اس کے پیچھے آئی اور راستہ روک لیا۔

"آپ ہر بات مانتے ہیں اپنے بابا کی؟" عجیب سا سوال تھا۔ معاذ نے کچھ بغیر اثبات میں گردن ہلا دی۔

"اگر آپ کے بابا کہیں، اس لڑکی، یعنی مجھ سے شادی کر لو، تو کر لو گے؟" اس نے نچلے لب کا کونہ دانتوں تلے دبایا، معاذ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"میرے بابا میرے مزاج سے آگاہ ہیں۔ وہ ایک ایسی لڑکی سے مجھے ہرگز شادی کرنے کا نہیں کہیں گے جو مجھے پسند نہ ہو۔"

وہ اپنی بات کہہ کے رکا نہیں تھا، جبکہ اسوہ کو لگا تھا۔ ریسٹورنٹ کی عمارت اس کے وجود کو اپنے ملبے تلے دبا چکی ہے۔

☆☆☆

خدیجہ بیگم اس حقیقت کی سفاکی کو سہہ نہیں پائی تھیں۔ انہیں دل کا اتنا شدید دورہ پڑا تھا، کہ وہ اسپتال جاتے راستے میں ہی دم توڑ گئی تھیں۔ ایک سال کے اندر دوسری

قیامت ہارون اسرار کے سر پہ ٹوٹی تھی۔ ایک کے بعد وہ دوسرے گناہ کا مرتکب ہوا تھا۔ ایک مرتبہ پہلے اس نے ضبط اور حواس کھوئے تھے، تب بھی ناقابل تلافی نقصان حصے میں آیا تھا، اور دوسری مرتبہ بھی وہ آپے سے باہر ہوا تھا، تو جیسے طوفان سب کچھ ساتھ بہا کے لے گیا تھا۔ اضطراب اور وحشت کی کوئی حد نہیں تھی۔

سگریٹ پھونک کر، آنسو بہا کر، اور مسلسل ٹہل کر وہ تھک گیا، تو وضو کر کے کلام پاک پڑھنے لگا۔ تہجد پڑھی اور سجدے میں گر کر ضبط کو پارہ پارہ ہوتے دیکھنے لگا۔

"یا رب العالمین، رحم فرما! مجھے معاف فرما دے۔ میرے مالک! مجھے معاف فرما دے، میرے رب تو گواہ ہے، تو جانتا ہے، میں نے ایسا نہیں چاہا تھا۔ اس گناہ کا تو تصور بھی میرے آس پاس نہیں تھا۔"

آہیں، سسکیاں اور گریہ وزاری ضویا کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے ذرا سا اونچا ہو کر جائے نماز پہ سجدہ ریز وجود کو دیکھا، اور کمبل ہٹا کر بیڈ سے اتر آئی۔ اس ایک واقعے کے ایسے گہرے اثرات، اور یہ پشیمانی، ضمیر کے زندہ ہونے کی علامت تھی۔

وہ بھی شریک گناہ تھی۔ پھر ایسی ندامت، ایسی بے قراری اسے کیوں نہیں تھی۔ اس نے اس پر غور ہی نہیں کیا۔ یہ سچ ہے، کہ جب تک خوف خدا دل میں نہ جاگے، تب تک کوئی احساس پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی بے احساس تھی۔

وہ بے حد آواز قدموں سے چلتی اس کے نزدیک آئی، اور اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ہارون کا سسکیوں سے لرزتا وجود یکلخت ساکن ہوا تھا، اگلے ہی لمحے اس نے سر اٹھایا تھا۔ ان کشادہ حسین آنکھوں میں پھیلا ہراس ان کی خوبصورتی کو بڑھا گیا تھا۔

"کیوں رو رہے ہو؟" کچھ دیر اس کی سرخ بھیگی آنکھوں، اور آنسوؤں سے تر متورم چہرے کو یونہی تکتے رہنے کے بعد، اس نے تو ت زدہ انداز میں استفسار کیا تھا۔

"تم جاتی ہو۔"

ہارون کا گلا رندھ گیا، اور اسے جانے کیا ہوا، منہ پہ ہاتھ رکھے وہ قل قل کر کے ہنستی چلی گئی۔ ہارون کی نگاہ سے پہلے استعجاب چھلکا، پھر بتدریج شرمندگی اور دکھ۔ وہ سر جھکا کر دھندلائی ہوئی نظروں سے اپنے ہاتھوں کو تکنے لگا، جو دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔

"کیا سمجھتے ہو تم، اس طرح رونے، گڑگڑانے سے، رب تمہیں معاف کر دے

گا؟'' تب ہارون نے غم ناک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''نہیں ہارون اسرار! رب بھی اس وقت تک گناہ معاف نہیں کرتا جب تک وہ بندہ نہ کر دے، جس کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ تمہیں تو اسلام اور مذہب کی بہت معلومات ہیں، کیا تم یہ بات بھول گئے؟''

ہارون کے چہرے پہ زلزلے کے آثار نمودار ہوئے تھے، اور تاریک سائے چہرے پر لرزنے لگے۔

☆☆☆

وہ تحت حواس سی، لرزتا دل لیے اسے لحہ بہ لحہ اپنی جانب بڑھتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی دھمکی پہ عمل کر ڈالا تھا۔ اس کے لیے حوریہ کو اغوا کرنا کسی چڑیا کے شکار سے بھی زیادہ سہل ثابت ہوا تھا۔

یونیورسٹی سے واپسی پہ اس نے رابعہ کی موجودگی میں بہت دھڑلے سے قدرے سنسان روڈ پہ اسے کسی گڑیا کی طرح اٹھا کر گاڑی میں ڈالا تھا، اور اب وہ یہاں تھا اپنی مانی کو تیار۔

بیئر کاٹن کھول کر دو تین بڑے گھونٹ لینے کے بعد، وہ کچھ مزید اس کے نزدیک آیا تھا، اور ایک ہاتھ بڑھا کر اس کے گرد لپٹا چادر نما دوپٹہ ایک ہی جھٹکے میں اتار کر کمرے کے دوسرے کونے میں پھینک دیا تھا، اور وہ بغیر دوپٹے کے اس کے سامنے کھڑی تھر تھر کانپتی بے اختیار زور زور سے رونے لگی۔

''کیوں روتی ہو جان من! تمہیں ہماری قدر و قیمت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔'' وہ اس کے نزدیک آکر اس کے بالوں کی چوٹی کیبل کھولنے لگا۔

اس نے غم و غصے کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے اسے پیچھے کی جانب دھکا دیا تھا اور یہیں ایزی کے غضب کو آواز دی تھی۔ اسٹیلن دور اچھالا، اور اگلے ہی لمحے تڑپتی مچلتی حوریہ کو شکنجے میں کس لیا۔ وہ بھرپور مزاحمت کرتی اس کی گستاخ جسارتوں پہ تڑپ کر مچلتی ہوئی جھکی اور اس کے بازو پہ دانت گاڑ دیے۔ ایزی کی گرفت ایک پل کے لیے ڈھیلی پڑی، حوریہ اس ایک پل سے فائدہ اٹھا کر اس کا حلقہ توڑنے میں کامیاب ہوئی تھی، اور بھاگ کر اس سے کئی فٹ دور چلی گئی۔ ''یا اللہ میری مدد فرما!'' تیزی سے ڈوبتے دل سمیت اس نے زور، زور سے روتے ہوئے دعا مانگی تھی۔ اور اس کی دعا قبول ہوگئی تھی۔

دروازہ اچانک بہت زور سے بجا تھا۔ بہت جارحانہ انداز میں۔ حوریہ کے تن مردہ میں جیسے جان سی پڑی، تو ایزی کا موڈ بگڑ گیا تھا۔

''کون ہے؟'' وہ چیخا تھا۔

''میں ہوں تمہاری ماما، دروازہ کھولو۔'' باہر سے چیخ کر کہا گیا تھا۔ اسے جیسے ہزار وولٹ کا کرنٹ لگا تھا۔

''ایزی، میں کہتی ہوں دروازہ کھولو۔'' اب کے آواز میں سرد غراہٹ در آئی تھی۔

حوریہ نے آنسو بھری نظروں سے ایزی کے پتھر بنے وجود کو دیکھا، اور دوڑ کر خود دروازہ کھول دیا۔ باہر مسز ایف ایم چوہدری ہی تھیں، وہ یقیناً بہت عجلت میں آئی تھیں۔ جب ہی ان کا لباس شکن آلود اور بال کھلے ہوئے تھے، وہ ان سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ مسز چوہدری نے بہت خاموش اور سرد نظروں سے اسے دیکھا، اور پھر آہستگی سے اسے خود سے الگ کرتیں، آگے بڑھ کر ایزی کے سامنے آن رکی تھیں۔

''واٹ از دِس؟'' انہوں نے اس کے قدموں میں پڑے خالی ٹن کو ٹھوکر ماری اور چیخ کر ایزی کو مخاطب کیا، جس کا سر جھک کر کاندھوں پر گر گیا۔

''اور یہ کیا ہے؟'' انہوں نے پلٹ کر تھر تھر کانپتی آنسو بہاتی، حوریہ کی سمت اشارہ کیا۔ ''تم تو کہتے تھے لوگ تمہارے بارے میں بکواس کرتے ہیں۔ الزام تراشی کرتے ہیں۔ اب بتاؤ اب بھی مکر جاؤ۔''

انہوں نے ایک زنانے کا طمانچہ ایزی کے چہرے پہ دے مارا تھا پھر دوسرا، پھر تیسرا، اور پھر تو جیسے وہ پاگل سی ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے منٹوں میں اس کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا تھا اور وہ چپ چاپ پٹ بھی رہا تھا۔ حوریہ آنکھیں پھاڑے یہ ناقابل یقین منظر دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

یہ کیسا احساس رگ و پے میں اترا تھا، آگاہی کا، وہ سوچتے سوچتے حواس کھونے لگا۔ جہاں اور زیاں ہوا تھا وہاں یہ بھی کہ اسے اس عہدے کے لیے نااہل قرار دے کر برطرف کر دیا تھا۔

ثمرہ کی دلبری نزدیک تھی، معافی اسے لینے آئی تھیں، وہ کیا کہہ سکتا تھا۔ ان ہی

دلوں سوہا کے رشتے کی بات بھی چل رہی تھی اور عثمان کے سعودیہ جا کر کام کرنے کی بھی، مگر وہ ہر معاملے سے لاتعلق تھا۔ ماموں اس سے خفا تھے تو ممانی کی نفرت کچھ اور بڑھ چکی تھی۔ انہیں اپنی بات ثابت کرنے کا موقع ہاتھ آیا تھا، اور وہ خوب کھلکھلا رہی تھیں۔

ضوبیا کی ڈلیوری کے بعد سوہا کی شادی طے پائی، عثمان نے البتہ انتظار فضول جانا تھا، سو وہ سعودیہ فلائی کر گیا۔ دو ماہ بعد ضوبیا نے ایک صحت مند اور خوبصورت بچے کو جنم دیا تھا۔ ماموں نے ہی طلاقی انداز میں اسے اطلاع پہنچائی تھی۔

"اب کچھ کام بھی ڈھونڈ ہی لو۔ بیوی، بچے کو بھیک مانگ کر کھلاؤ گے؟" انہوں نے طنزاً کہا تھا۔

تب وہ اپنا ہر احساس جھٹک کر بہت شوق سے بچے کو دیکھنے گیا تھا، جو کاٹ میں لیٹا چلا چلا کر رو رہا تھا، جبکہ ضوبیا بے نیازی سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے سیب کی قاشیں مزے لے لے کر کھا رہی تھی۔

ہارون نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا تھا، اور خود بڑھ کر ہاتھ پیر مار کر روتے ہوئے اس ننھے فرشتے کو اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا، مگر وہ معصوم جان تو ماں کی نرم آغوش کی متلاشی تھی، اس کا لمس پا کر کچھ اور بھی شدتوں سے رونے لگا۔

"ضوبیا! اسے بھوک لگی ہے۔ پلیز اسے فیڈ کرواؤ۔" اس کی بے نیازی اور لاتعلقی کے باوجود بچے کو اس کی سمت بڑھاتے ہوئے وہ بہت لجاجت سے بولا تھا۔

"اسے اپنے ہی پاس رکھو۔ تمہیں نظر نہیں آ رہا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ پھنکار کر بولی۔

ہارون کس قدر جھنجلایا، مگر بے۔

"لینے گئی تو ہیں ماما! اس کا فیڈر آ جائیں گی، کیوں اتاولے ہو جاتے ہو ہر کام میں۔" ماتھے پر تیوریاں لیے وہ رکھائی سے بولی۔

"کیا مطلب، اب ممانی جان فیڈر سے اسے دودھ پلائیں گی۔" اس کے تیکھے انداز ہارون کو تاؤ دلانے لگے۔

"تو اور کیا میں کرواؤں گی۔ سنو مسٹر ہارون! کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو تو اس کو دل سے ابھی نکال دو۔ مجھ سے اس کے لیے کسی قسم کی نرمی کی توقع مت رکھنا اس لیے کہ یہ

تمہاری اولاد ہے اور مجھے تم سے گھن آتی ہے۔"

بچے کی سمت اشارہ کرتی وہ اس قدر بے لچک لہجے میں غرا کر بولی تھی کہ اس کا یہ بیگانہ انداز ہارون کو انگشت بدنداں کر گیا۔

"یعنی تم؟" صدمے کی زیادتی سے وہ بات بھی پوری نہ کر سکا۔

"بالکل صحیح سمجھے ہو۔" وہ آنکھیں نکال کر بولی اور اس کی غصے کی زیادتی سے بے انتہا سرخ آنکھوں میں اپنی آنکھیں گاڑھ کر مزید گویا ہوئی۔

"سو بہتر یہی ہے کہ تم اس کے لیے گورنس کا انتظام کر لو، میری ماں خواہ مخواہ کی ملازمہ نہیں ہے، کہ تمہارے ہوتے سوتے کی آیا گیری کرتی پھرے۔"

ہارون نے جواب نہیں دیا، وہ جواب دینے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

"تم مجھے بتاؤ میری تربیت یا محبت میں کہاں کمی رہی تھی، جو تم اس حد تک پستیوں میں جا گرے، اور مجھے پتا تک نہیں چل سکا۔" وہ ان کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا، کپڑے تبدیل ہو چکے تھے، حلیہ سنورا ہوا تھا، مگر وہ اسی لباس میں تھیں، چہرے پہ تاریک سائے لرزاں تھے۔

"تمہیں وہ لڑکی پسند تھی۔ تم مجھ سے کہتے میں کسی چیز کو ترجیح نہ دیتی، ماسوائے تمہاری پسند کے۔ ایزی! تم نے بہت ہرٹ کیا۔ مجھے" وہ آگے بڑھی تھیں اور بھرائے ہوئے گلے سے بولیں۔ وہ ہنوز خاموش تھا، البتہ چہرے پہ کسی پشیمانی یا تاسف و گھبراہٹ کا شائبہ تک نہیں تھا اور یہی چیز انہیں ہولا رہی تھی۔

"کیا یہ پہلی لڑکی تھی، جس میں تم اس حد تک گھٹیا انداز میں انوالو ہوئے، یا اس سے پہلے بھی کسی کی عزت کا جنازہ نکال چکے ہو؟"

اچانک خیال آنے پہ انہوں نے کچھ سہم کر استفسار کیا تھا، ایزی نے ایک نظر ان کے ہراساں چہرے کو دیکھا اور پھر سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"بتاؤ ایزی! بولو، پلیز تسلی دی اور وائز آئی ول کل یو۔"

اب کی مرتبہ انہوں نے اس کا گریبان پکڑ کر ہیجان زدہ انداز میں جھنجوڑا تھا۔

ایزی نے ان کی کیفیت کو دیکھا اور کچھ خائف ہوا تھا۔

"یہ پہلی لڑکی ہی تھی۔ اس سے پہلے کسی لڑکی نے مجھے کبھی کا ناچ نہیں نچایا تھا۔ میں اسے سبق سکھانا چاہتا تھا۔" وہ نروٹھے پن سے بول پڑا اور ان کے پیچھے سر جھکی تیوڑوں میں اُلجھی تھی۔

"تم یہ کیوں بھول گئے، کہ تمہارے گھر میں ماں اور بہن بھی ہیں کل انھیں ان کی عزت کی حفاظت کی کوشش میں کوئی ایسا ہی سبق سکھانے لگے تو؟" انہوں نے ہسٹریک ہوتے ہوئے اسے کتنے ہی گھونسے رسید کر دیے تھے۔ ایزی نے ناگواری سے انھیں دیکھا اور سر جھٹک کر ہنکارا اُبھرا۔

"کم آن مام کام ڈاؤن، یہ سب اس لڑکی کی بدتمیزی کی وجہ سے ہوا۔"

اس ڈھٹائی اور بدلحاظی نے انھیں شدید مشتعل کر دیا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے، کہ تمہاری شادی بہت جلد اسی لڑکی سے ہوگی۔" انہوں نے بہت قطعی اور فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

"واٹ؟" ایزی کو تو جیسے بچھو نے ڈنک مارا تھا۔

"میں ہرگز بھی اس لڑکی کو اس قابل نہیں سمجھتا، کہ اس سے شادی ہی رچانے بیٹھ جاؤں۔" اس کا بدلحاظ لہجہ گستاخی لیے تھا۔

وہ اسی سکون سے گویا ہوئی تھیں۔ "حالانکہ تم جیسا لوفر، اور عیاش بندہ، ہرگز ہرگز اس کے قابل نہیں ہے، مگر کیا، کیا جائے کہ اتنے گھنٹے تمہاری حراست میں رہ کر، وہ اپنے پیرنٹس کی نگاہوں میں بھی مشکوک ہو گئی ہے۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں کہ تمہارے ہی نام کی چادر اوڑھا کر معاشرے میں اسے ایک مقام دیا جائے۔"

"مام!" اس نے بیر پٹخے تھے۔ "میں گھر سے بھاگ جاؤں گا، اگر آپ نے زبردستی کی۔" اس نے اپنا آزمودہ حربہ اپنایا۔

"بھاگ جاؤ، مگر یاد رکھنا میں تمہیں اپنی جائیداد سے عاق کر دوں گی۔ ایک دھیلا نہیں ملے گا تمہیں، اور تم کیا کر سکتے ہو، یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

انہوں نے گہرے طنز سے کہا اور باہر نکل گئیں، ایزی کی جھنجلاہٹ پہ غصہ غالب آ گیا، اس نے میز کو لات رسید کی تھی اور جھنجلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ ایک حبس زدہ شام تھی آسمان پہ کہیں کہیں بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا ہوا کے دوش پہ اڑا پھر رہا تھا دور کہیں سے مینا کی آواز اداس فضا میں مزید اداسی گھول رہی تھی ماں کی گود میں سویا بچہ کسمسا کر رویا، تب وہ چونکا تھا اور ویران آنگن سے ساکت نگاہ ہٹا کر بلکتے ہوئے بچے کو دیکھا۔ معاً اسے اس کی بھوک کا خیال آیا تھا، بچے کو کاندھے سے لگا کر وہ کچن کی سمت بھاگا، جہاں وہ دودھ چولہے پہ ابلنے کے لیے چھوڑ کر بھول گیا تھا۔ دودھ کیتلی کے کناروں سے نکل نکل کر برنر پہ گرنے کے بعد اب سوکھ کر جل چکا تھا۔ بالائی کی پھولی ہوئی تہہ کیتلی کے کناروں پہ اب بھی جمی تھی، اور ماحول میں جلنے کی بو پھیل چکی تھی، وہ کچھ لمحوں کو شدید قسم کے رنج میں مبتلا اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا۔

بچے کے ایک بار پھر رونے سے وہ اس کیفیت سے نکلا تھا اور آگے بڑھ کر پہلے چولہا بند کیا، پھر صافی سے کیتلی پکڑ کر اتاری، پھر سرخ گاڑھا دودھ سنک پہ موجود تھا، اس نے سنک کی ٹونٹی کھول کر کچھ پانی اس میں پھینکا اور فیڈر میں ڈال کر اچھی طرح ہلانے کے بعد فیڈر، بچے کے منہ سے لگا دیا۔ بچہ رو، رو کر نڈھال تھا یا پھر بھوک سے، کہ بے صبری سے دودھ پیتے ہی سو گیا۔

ہارون نے جھک کر اس کے معصوم چہرے پہ بکھرے بکھرے آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں سے چنا تھا، اور یاسیت آمیز گہری سانس کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ سات سے آٹھ ماہ کا بچہ نیند میں ہچکیاں بھرتا اس کا کلیجہ شق کرنے لگا۔

عثمان نے سعودیہ جانے کے بعد وافر روپیہ بھجوانا شروع کر دیا تھا۔ سوہا کی شادی ہو گئی، وہ بیاہ کر یوگنڈا چلی گئی۔ چھ ماہ بعد ماموں، ممانی بھی عمرے کے لیے طلاق کر گئے۔ پیچھے وہ رہ گئی تھی، اپنی مسن مانی کے لیے، اور اس کا فیصلہ اتنا سفاکانہ اور سنگدلانہ تھا، کہ ہارون کا ضبط پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ "کچھ تو گنجائش رکھو ضوبیا! میرے لیے نہیں تو اس معصوم بچے کے لیے، یہ اولاد ہے تمہاری۔ غور کرو، اس کا کیا قصور۔"

"مجھے سبق مت پڑھاؤ، جب کہہ دیا، کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تم دونوں کے لیے تو بار بار وہی سوال دراز کر کے خود کو ذلیل نہ کرو۔"

وہ اتنی نفرت سے بولی تھی، کہ اس روز ہی شام کو وہ اپنا مختصر سامان سمیٹ کر بچے کے ہمراہ وہ گھر چھوڑ آیا تھا، جسے ضوبیا نے یہ کہہ کر اسے جانے کو کہا تھا، کہ اس گھر پہ

اس کا کوئی حق نہیں ہے اور چونکہ وہ ان کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں، سو وہ وہاں سے کہیں اور ٹھکانہ کر لے۔

وہ اتنا ہرٹ تھا، اس قدر رنجیدہ، مضطرب اور مایوس تھا، کہ ممکن تھا خودکشی کر لیتا، مگر اللہ کو اسے ابھی زندہ رکھنا تھا، جب ہی اسے زندہ رہنے کیلئے سہارا فراہم کر دیا تھا، ایسے مشکل وقت میں سائرہ اس کے کام آئی تھی۔ اس کی داستان غم نے اسے اتنا ملول کیا تھا کہ آنکھوں میں نمی آ ٹھہری تھی۔

اور ہارون جس نے کبھی اس سے اپنی محبت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا، اس کی اس درجہ ہمدردی و توجہ پہ بکھرتے بکھرتے بھی سنبھل گیا، اب یہاں اس گھر میں تنہائی اور آزمائش میں گھرا وہ جینے کے نئے ڈھنگ سیکھ رہا تھا، اس لیے بھی کہ اسے اس ننھی جان کی خاطر اپنا خیال رکھنا تھا، جسے ماں کی بے اعتنائی سہنا پڑی تھی۔

☆☆☆

باہر ہواؤں کی سرسراہٹ کے ساتھ بارش کا شور تھا۔ کتنی مدھر آواز تھی بارش کی، وہ اٹھی اور اپنے ہینڈ بیگ سے خاکی لفافہ نکال کر باہر آ گئی۔

''مام میں آ جاؤں۔'' اس نے دروازے پہ دستک دے کر اجازت چاہی۔

''یس'' اندر سے تھکی ہوئی آواز ابھری تھی، اسوہ نے دروازہ پش کیا اور اندر قدم رکھ دیا انہیں اسٹڈی ٹیبل کے سامنے نہ پا کر نظر گھمائی۔ وہ بیڈ پر دراز تھیں، کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا، وہ اندازہ نہیں کر پائی کہ یوں بے وقت کیوں لیٹی ہیں۔

''آر یو آل رائٹ مام؟'' اس نے لائٹ آن کرتے ہوئے تشویش سے کہا۔

''آپ ایزی اسٹوپڈ کی وجہ سے ڈس ہارٹ کیوں ہوتی ہیں۔ مام! اس کی تو عادت ہے۔'' معاً ان کے چہرے پہ بکھری زردی کو دیکھتے ہوئے وہ لب بھینچ گئی۔

''یہ لے لیں مام!''

''واٹ از دس۔'' ان کی نگاہوں سے استعجاب چھلکا۔

''وہ پیسے، جو میں نے آپ سے لیے تھے۔'' اس نے لفافہ ان کی سمت بڑھا دیا۔

''کیوں ڈانس نہیں سیکھنا؟''

اسوہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کوئی خاص وجہ؟'' ان کی نگاہیں اسکے چہرے پہ کھلتی شرمگیں مسکان میں اٹکیں۔

''وہ نہیں چاہتا۔'' وہ سر جھکا کر اب کھل کر مسکرائی۔ وہ کون۔ وہ متعجب تھیں۔

''وہی جسے بھلانے کے لیے میں خود کو اس رقص میں گم کر دینا چاہتی تھی۔'' وہ ہاتھ کی انگلی کا ناخن چبا کر ذرا سا ہنسی۔

''وہ پسند نہیں کرتا اور تم نے اپنی خواہش چھوڑ دی۔'' انہوں نے بغور اس کا چہرہ جانچا۔

''جی مام! اس کے لیے تو میں سب کچھ......'' معاً وہ جھجک کر چپ ہوئی۔

''کیا وہ بہت اچھا لگتا ہے؟'' وہ سوال پہ سوال کرنے لگیں۔ اسوہ بوکھلا سی گئی۔

''جی مام! بہت، بے حد، خود سے ہر کسی سے بڑھ کر، اس لیے مام کہ وہ ہے ہی چاہے جانے کے قابل۔''

اس نے آنکھیں میچ کر بہت جذب سے کہا، پھر بے اختیاری ہو کر اپنی جگہ سے اٹھی اور ان کے گھٹنوں پہ دونوں ہاتھ رکھ کے لجاجت سے بولی۔

''مام پلیز! آپ اس سے ملیں تو سہی۔ وہ آپ کو پسند آئے گا۔ میں ایزی کی طرح غلط راستہ نہیں اپنانا چاہتی۔''

''ہوں۔'' وہ جیسے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

''تم اس سے کہنا۔ وہ آ کر مجھ سے ملے۔ بیٹی کی ماں ہو کر میں پہل کرتی اچھی نہیں لگوں گی۔'' انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''مام! وہ نہیں آئے گا اس لیے کہ جو کچھ آپ کی بیٹی اس کے لیے محسوس کرتی ہے۔ وہ ایسا کچھ محسوس نہیں کرتا۔ مجھے ہی ایسا لگتا ہے کہ اگر وہ مجھے نہ ملا تو میں مر جاؤں گی۔''

اس کا گلا رندھ سا گیا، ان کا دل تو جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

موسم اپنے اندر بے حد خوبصورتی سموئے ہوئے تھا، ہلکے ہلکے چلتی ہوا اور گہرے سیاہ بادلوں نے پورے ماحول کو شام سے پہلے ہی شام کا رنگ دے دیا تھا۔ ہلکی ہلکی پڑتی پھوار، اور قریبی مسجد سے آتی نعت کی آواز، سب کچھ ہی بہت اچھا تھا، مگر وہ کمرے کی کھڑکی میں کھڑی اپنے ہی خیالوں میں دور پہنچی ہوئی تھی۔ ایک ماہ ہو گیا، اس پہ یہ سانحہ بیتے اور ایک ماہ سے ہی زندگی کا انداز بدل گیا تھا۔ وہ عزت بچا کر بھی گویا ہر نگاہ میں معتوب ہوگئی تھی۔ کتنا

بے بایا کر دیا تھا۔ ایزدی کی اس انتقامی کارروائی نے، اسے، اپنوں کی نظروں میں وہ تو بس ششندر سی بدلتے ہوئے رویوں کو دیکھ رہی تھی۔ کتنا برے تھے بابا اس پر اور ان کی بد گمانی، اف وہ یاد کر کے ہی لرز جاتی تھی۔

"سچ کہتے ہیں لوگ، اولاد پہ اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے، اور بیٹیوں کے معاملے میں تو یہ اعتماد ہمیشہ ڈبوتا ہی ہے۔ برا کیا تھا میں نے، کہ برادری کی مخالفت مول لے کر اس کو پڑھنے بھیج دیا، ارے رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے نا، کچھ نہ کچھ تو اس نے بھی حوصلہ افزائی کی ہوگی، تب ہی معاملہ اتنا خراب ہوا۔"

حوریہ کا تو دم نکل گیا۔ وہ تو پہلے ہی خود پر اعتماد کھو چکی تھی، اس درجہ الزام تراشی اور غلط بیانی پہ اسے لگا تھا جیسے وہ تیورا کر ایسا کرے گی کہ پھر اٹھ نہ سکے گی، مگر ایسا ہی تو نہیں ہوا تھا، کتنی سخت جان تھی وہ۔

"پوچھو، اس سے کہ، کون تھا وہ؟ اس کے اگلے پچھلوں کو بلائے اور اپنی صورت لے کر دفعان ہو۔"

وہ چنگھاڑے تھے اور نیم جان ہوتی حوریہ کے قریب ہی جیسے بم پھٹا تھا۔ چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"بتایا تو ہے اس نے وہ ایک بدقماش لڑکا تھا۔"

"چپ زبان کھینچ لوں گا تمہاری، اگر تم نے جا حمایت کی تو۔" قہر بھرے انداز میں وہ امی کو جان سے مار دینے کے ارادے سے آگے بڑھے۔

"یہ اس حد تک گر جائے گی، باپ کی عزت کا جنازہ نکال کر اس لونڈے کے ساتھ گل چھرے اڑائے گی، ارے مجھے ذرا سا بھی گمان ہوتا تو اپنے ہاتھ سے اس کا گلا گھونٹتا۔"

تب ڈری سہمی لرزتی کانپتی حوریہ میں جانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی کہ وہ کمرے سے نکل کر ان کے سامنے آگئی۔

"دفع دور، اس سے کہو یہاں سے چلی جائے، میں اس کی صورت۔"

"یہی پوچھنے آئی ہوں بابا! کیوں صورت نہیں دیکھنا چاہتے۔ جبکہ میں بالکل بے قصور ہوں۔"

ایک طمانچہ پڑا، اور اس کی زبان گنگ ہوگئی، اس کے ہونٹوں سے سرخ سرخ

خون نکل کر پھیل رہا تھا۔

"اسے لے جاؤ یہاں سے اور جہنم میں جھونک دو جتنی جلدی ہو سکے۔ اس کا رشتہ تلاش کرو، چاہے اپاہج ہی ہو یا پھر سڑکوں پہ بھیک مانگتا فقیر مگر اسے یہاں سے دفعان کرو، ورنہ یہ میرے ہاتھ سے ضائع ہو جائے گی۔"

وہ کف اڑاتے پھنکارتے گھر سے نکل گئے۔

☆☆☆

"السلام علیکم؟ میم! میں رابعہ ہوں، وہی جس نے آپ کو حوریہ کے کڈنیپ ہونے کی اطلاع دی تھی۔"

"ہاں بیٹا بولو۔" وہ جو بہت مگن انداز میں اپنے ناول کی آخری قسط کا کلائمکس لکھ رہی تھیں۔ سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"میم آئی ایم سوری! کہ آپ نے اپنا کردار اس انداز میں نہیں نبھایا، جیسے کہ نبھانا چاہیے تھا۔" لہجہ ترش اور تلخ تھا۔

"بیٹا وہ حوریہ نے تو اس روز بھی مجھے گھر کے اندر آنے ہی نہیں دیا تھا، وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی، حالانکہ میں چاہتی تھی کہ اس کی پوزیشن کلیئر کر دوں مگر۔۔۔" وضاحت دیتے بھی وہ خجل سی رہیں۔

"خیر جو ہوا اسے جانے دیں، ایک ریکویسٹ کروں آپ سے۔" دوسری جانب رابعہ نے بھی فوراً مفاہمت اختیار کی تھی۔

"ہاں بیٹا کہو۔" "میم! آپ اپنے بیٹے کی غلطی کا ازالہ کریں۔ حوریہ سے اس کی شادی کرا دیں، میم پلیز۔ وہ اس وقت سخت آزمائش میں ہے، چونکہ وہ اس آزمائش میں اس کی وجہ سے دوچار ہوئی ہے۔"

"آں ہاں، بالکل کیوں نہیں۔" وہ چونکیں اور گڑبڑا گئیں۔

"تھینکس میم! میں منتظر رہوں گی۔ اللہ حافظ۔" انہوں نے بے دلی سے فون رکھ دیا، تبھی دروازہ تھپتھپا کر ایزدی اندر آیا۔

"مجھے دس ہزار کی ارجنٹ ضرورت ہے۔ مام پلیز دے دیں۔" بلیک جینز پہ شرٹ پہنے وہ رف سے حلیے میں تھا۔

"کیوں اب کون سا گل کھلانا ہے؟" ان کی تیوری چڑھی۔

"میری ہی غلطی تھی، جو تم اس حد تک بے لحاظ ہو گئے ہو۔" انہوں نے پیپرز سمیٹ کر رکھتے ہوئے تلخی سے کہا۔

"اسوہ کو تو آپ نے پچاس ہزار بھی ایک منٹ میں نکال کر دے دیے تھے، بغیر کسی حیل و حجت کے۔ ڈانس سیکھنا کب سے اچھا کام ہو گیا۔"

"ایزی میں اس لڑکی کے ساتھ تمہارا رشتہ طے کر رہی ہوں۔ شادی بھی جلدی ہو گی۔ اب تم یہ فضولیات چھوڑ دو۔ اب بھی اگر تم میری بات سے انکار کرو گے تو یاد رکھنا میں اس مرتبہ خود تمہیں گھر سے نکالوں گی۔"

ان کی آنکھوں سے بے بسی چھلک رہی تھی۔ ایزی نے تختی سے لب بھینچ کر انہیں دیکھا۔

"آپ میری کمزوری سے آگاہ ہیں ماما! اور اس سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہیں۔ اوکے فائن۔ کر لیں اپنی مرضی ابھی تو مجھے رقم دے دیں، شادی کے وقت نہیں بھاگوں گا مام! میری دکھتی رگ آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

بات بات کر تلخی سے کہتا وہ ان کے بڑھائے دس ہزار کے چیک کو اچک کر چلتا بنا۔ وہ کچھ پریشان سی کھڑی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

خوش ہونے کی بجائے عجیب سی یاسیت اور رنج نے انہیں گھیر لیا تھا۔ حوریہ کے باپ کے جاہلانہ رویے پہ انہیں بہت تاسف ہوا تھا، نہ کوئی رسم ادا کرنے دی تھی نہ ہی شگن، بس شادی کی تاریخ طے کر دی، انہیں اس لڑکی کی بدنصیبی پہ بہت رونا آ رہا تھا۔ ایزی سے شادی ہونا ان کے نزدیک تو یہ بدنصیبی ہی تھی مگر وہ اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھیں۔

"مام! معاذ کے گھر چلیں۔" اسوہ جو ان کے ساتھ ہی گئی تھی، راستے میں ہی گاڑی رکوا کر اچانک بولی۔

"آں ہاں چلو دیکھتے ہیں وہاں سے کیا ملتا ہے۔" وہ اداسی سے مسکرائیں۔

"وہ ایسے جاہل اور دقیانوسی سوچ کے مالک نہیں ہیں مام! رنگلی معاذ کے بابا اتنی ڈیشنگ اور امپریسو پرسنالٹی رکھتے ہیں کہ میں تو انہیں دیکھتی ہی رہ گئی۔"

"اوہ! تم تو معاذ سے زیادہ اس کے بابا سے متاثر لگتی ہو۔" وہ بے دلی سے مسکرائیں۔

"نہیں خیر، مجھے تو جس سے متاثر ہونا تھا ہو گئی۔ ان سے تو آپ جیسی خواتین ہی متاثر ہو سکتی ہیں۔"

اس نے خفیف سی شرارت کی تھی مگر ان کے چہرے پہ موجود مسکراہٹ کو لمحے کے ہزارویں حصے میں غائب ہوتے دیکھ کر وہ خاموش سی ہو گئی۔

گاڑی مطلوبہ مکان کے سامنے رکی، اور وہ ان کی حیران اور کسی حد تک خفا نظروں کو خاطر میں لائے بغیر گاڑی سے اتر کر اطلاعی گھنٹی بجانے لگی، وہ بھی خاصی بددلی سے اس کے ہمراہ دروازے تک آ گئی تھیں۔ دروازہ وا ہوا اور جیسے ہر سو روشنی سی بکھر گئی۔ معاذ سفید کلف شدہ شلوار سوٹ میں نکھرا نکھرا سامنے تھا۔

"السلام علیکم انکل ہیں۔ دراصل مائی مام ان سے ملنے آئی ہیں۔" اسے دروازے میں اکیلے دیکھ کر اسوہ نے شگفتہ لہجے میں کہتے ہوئے گویا اپنی آمد کی وجہ بیان کی، جبکہ وہ اپنی جگہ خفت کا شکار ہو رہی تھیں۔ جانے کیوں انہیں اس بے انتہا خوبرو سے لڑکے کی آنکھوں میں دیکھ کر ایسا کیوں لگا تھا کہ جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ کیوں کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں۔

معاذ نے ایک نظر انہیں دیکھا تھا، جو یک ٹک اسے دیکھ رہی تھیں، پھر آہستگی سے ہٹ کر انہیں راستہ دے دیا۔

"بابا تو نماز پڑھنے گئے ہیں۔ بس آتے ہوں گے۔ آپ بیٹھیے۔"

وہ انہیں ہمراہ لیے چھوٹے سے انتہائی سادگی سے سجے ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔

"میں چائے لاتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر ان کی نظروں کے حصار میں آیا تو جز بز ہو کر کہتا پلٹ گیا۔

"شرمیلا ہوئی ہیں والدہ بھی بیٹی کی طرح۔" اس نے تپ کر سوچا۔

"بیٹا! تمہاری والدہ یا بہن نہیں ہیں گھر میں؟"

"جی نہیں۔ صرف میں اور بابا ہوتے ہیں، وہ بھی، جب وہ تبلیغی دوروں پر ہوتے ہیں تو میں تنہا رہتا ہوں۔" اس نے دروازے سے نکلنے سے قبل آہستگی سے جواب دیا اور اگلے ہی لمحے دہلیز پار کر لی۔

"بابا! کچھ مہمان آئے ہیں آپ سے ملنے۔"

دروازے پر دستک کے بعد، جب اس نے دروازہ کھولا تو پہلی اطلاع یہی دی۔

''کون ہے؟'' وہ سر سے ٹوپی اتارتے ہوئے بال سہلاتے گئے۔

''اسوہ یاد ہے، اسی کی ماما ہیں۔'' وہ بے نیازی سے کہہ کر خود کچن کی سمت بڑھ گیا، جبکہ وہ مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے اور سامنے موجود خاتون پہ نگاہ پڑتے ہی وہ پتھر کے مجسمے کی مانند ساکت ہو گئے۔ اسوہ کی کسی بات کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے بھی اس پل نظر اٹھائی تھی، اور جیسے زمین آسمان ان کی نگاہوں میں گھوم گئے تھے۔ یہ کوئی الوژن نہیں تھا۔ یہ حقیقت تھی وہی حقیقت، جس کی انہوں نے طویل سجدوں میں رب سے التجا کی تھی۔ یہ ثمر تھا ان کی دعاؤں کا، یہ اعجاز تھا ان کی ریاضتوں کا، وہ اچانک اٹھی تھیں اور لڑکھڑا کر ان کی جانب بڑھی تھیں۔

''ہا......رو......ن......'' یہ نام ان کی زبان سے ٹوٹ کر بکھرا تھا اور اگلے ہی پل وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی ان کے قدموں سے لپٹ کر بے اختیار ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

''میرا گناہ بہت بڑا تھا، تو پھر سزا بھی اسی حساب سے ہی تھی، اس گھر سے آپ کو نکال کر، میں ایسے پُرسکون ہوئی تھی کہ جیسے تمام اضطراب ڈھل گیا ہو۔ یہ اضطراب نہیں تھا۔ یہ تو میری فطرت کی کمینگی تھی، یا پھر میرا انتقام، میں سوچتی ہوں، تو حیران ہوتی ہوں کیا ہو گیا تھا مجھے، کیوں اتنی کٹھور، اس قدر سفاک ہو گئی تھی کہ آپ کو ہی نہیں، اپنے بیٹے کو بھی اسی نفرت کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ آپ سچ کہتے تھے ہارون، کہ اس گناہ میں، میں بھی شامل تھی۔ میں نے کیوں اخلاقیات، روایات اور سب سے بڑھ کر مذہب کے بتائے راستوں سے روگردانی کی۔ کیوں تنہائی میں آپ سے ملتی رہی، پھر تو وہی ہونا تھا جو ہوا، مگر اس کے بعد جو میں نے کیا، وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ تو کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا تھا مجھے، آپ کو یاد ہے ہارون! جب آپ اس گھر سے جا رہے تھے، تب میرا بچہ، میرا لخت جگر رو رہا تھا، اس کی تڑپ اور پکار تب میرا دل نہ پگھلا سکی تھی مگر پھر، پھر قدرت نے مجھے میرے کیے کی سزا دینا شروع کر دی، اپنے بچے کے رونے کی آواز راتوں کی نیند اڑانے لگی مگر اس سے پہلے بابا میرے اس قدر سفاکانہ فیصلے پہ لعنت ملامت کرنے کے بعد، مجھے چھوڑ کر عثمان کے پاس سعودیہ چلے گئے۔ ماں تھیں جتنی بھی سخت سہی، مگر وہ میری طرح دل کی جگہ پہ پتھر نہیں رکھ سکتی تھیں، سو وہ میرے پاس ہی رہیں مگر میرا سکون تو کھو چکا تھا۔ کتنا تلاشا آپ کو، مگر

آپ نہیں ملے۔ میں ہسٹریا کی مریض ہو چکی تھی، ڈاکٹرز نے میرے ٹھیک ہونے کی شرط یہی رکھی تھی۔ کہ میرا بچہ مجھے مل جائے، تب یہی ایک حل تھا جو ماما نے نکالا۔ ہاں انہوں نے یتیم خانے سے وہ جڑواں بچے اڈاپٹ کیے۔ ایزی، اور اسوہ، جنھوں نے میری ماتا کی تڑپ کو مٹایا، مگر اس کسک کو دور نہ کر سکے، جو اپنے بچے کے لیے دل میں اٹھتی تھی۔ پچیس سال کم تو نہیں ہوتے ہارون، میں نے پچیس سال تک جھکتان بھگتا ہے۔ کیا آپ مجھے معاف کریں گے؟''

آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے تھے، وہ چونکے، انہیں دیکھا، مسکرائے اور بڑھ کر ان کے بندھے ہوئے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ دہلیز پہ اسی وقت قدم رکھتا معاذ ٹھٹکا تھا۔ چائے کی ٹرے اس کے مضبوط ہاتھوں میں لرزی تھی، اور اس کی آنکھیں سکتے کے عالم میں کھلی رہ گئیں۔ معاذ پلٹا تھا اور ایک جھٹکے سے مڑ کر باہر نکل گیا، تب سے اس داستان الم کے سوز میں گم اسوہ سب سے پہلے چونکی اور تڑپ کر اس کے پیچھے لپکی، اس کے پیچھے ہی وہ دونوں بھی، ضویا کی حالت تو بالکل دیوانوں کی سی تھی۔

''معاذ معاذ بیٹے!'' مگر وہ ہر پکار ان سنی کرتا بیرونی دروازہ پار کر گیا تھا۔

☆☆☆

''واٹ نان سینس معاذ! یو آر ناٹ اے کڈ۔''

جس وقت اس نے تھکے ماندے سے شکستہ اعصاب سمیت گھر کی دہلیز پار کی، وہ اسے بلب کی زرد روشنی میں آنگن میں ہی ٹہلتے مل گئے، اسے دیکھا تو لپک کر قریب آتے ہوئے خفگی بھری سرزنش کی۔ دروازہ بھی یقیناً اس کے انتظار میں کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ اس نے شاکی نگاہ ان پہ ڈالی اور قدم گھسیٹتے ہوئے برآمدے میں پڑے تخت پہ گر گیا۔

''کیوں خفا ہو بھلا؟'' انہوں نے اس کا بجھا ہوا چہرہ دیکھا۔ اس نے شاکی نظر ان پہ ڈالی تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرائے۔

''میں نے آپ سے کہا تھا۔ وہ اسوہ کی ماما ہیں۔''

اس نے منہ پھلا کر تڑ سے چڑ سے کہا، پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھا، اور بوجھل لہجے میں بولا۔

"پتا ہے بابا جانی! جب میں چھوٹا سا تھا، تب میں چاہتا تھا، میرے بابا جانی سب سے بہادر ہوں، ماڈرن کی طرح۔ سپرمین کی طرح، لیکن پھر جب میں بالکل آپ کے قد کے برابر آیا، تو میرے دل نے ایک اور خواہش کی، جو انہونی بے شک تھی، جانتے ہیں وہ کیا خواہش تھی۔"

اس نے رک کر بوجھل پپوٹوں کو اٹھا کر انہیں دیکھا، جو بہت سنجیدگی سے اسے دیکھ اور سن رہے تھے۔

"وہ خواہش تھی، آپ کے مضبوط اور پائیدار کردار کی۔ بابا جانی میں نے آپ میں یہ خوبی پائی بھی ہے۔ اتنی سحر انگیز شخصیت ہے آپ کی۔ میں نے اکثر خواتین کو آپ کی سمت متوجہ ہوتے لپکتے دیکھا، مگر آپ نے بہت محتاط زندگی گزاری۔ اس کے باوجود کہ آپ عورت کی رفاقت کے بغیر زندگی گزار رہے تھے، مگر آج، آج شام بابا جانی، تب مجھے اتنا شاک لگا، جب آپ کو اسوہ کی مما کے ہاتھ تھامے دیکھا۔"

اس کا بوجھل لہجہ بھیگ سا گیا تھا۔ ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"اور اگر میں کہوں کہ وہ اسوہ کی مما نہیں، تمہاری مما تھیں، تمہارے اسٹرانگ بابا جانی جیسی غیر عورت کا نہیں تمہاری ماں کا ہاتھ ہی پکڑا تھا، تو کیا تم مجھے یعنی اپنے بابا جانی کو اس گستاخی پہ معاف کرو گے؟"

ان کا انداز ڈرامائی نہیں تھا، البتہ شریر ضرور تھا، مگر وہ تو جیسے حیران سا رہ گیا۔

"آپ مذاق کر رہے ہیں بابا!" کچھ دیر بعد اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔

"ایسا سنگین مذاق کیوں کروں گا۔" وہ پل کے پل تھکن کا شکار ہوئے۔

"اور آپ نے انہیں معاف کر دیا اتنی زیادتی کے باوجود۔" وہ برہم ہو گیا۔

"معاف کرنے والی ذات تو اللہ کی ہے۔ بیٹے! آپ دعا کرو اللہ آپ کے بابا جانی کی بہت سی لغزشوں اور کوتاہیوں کو معاف کر دے۔" عجز انکساری ان کے ہر انداز سے عیاں تھی۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "انہیں پتا چل گیا تھا سب کچھ، پھر بھی وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ کیا انہیں اس سب پہ پچھتاوا نہیں تھا؟"

اس نے عجیب سا سوال کیا، وہ چونک گئے تھے اور کاغذ سے اچکا دیے۔

"وہ تم سے ملنا چاہتی تھیں۔ بہت بے قرار تھیں، مگر تم تو جانے کہاں چلے گئے تھے۔"

"آخر آ ہی جاتا۔ آیا ہوں نا۔ انہیں عادت ہے بابا! ہمارے بغیر رہنے کی۔" اس کا دل و دماغ تناؤ کا شکار ہونے لگا۔

"معاذ! ایسی منفی سوچ مت اپناؤ۔ بہت غلط بات ہے۔ وہ کل پھر آئیں گی۔"

انہوں نے اسے سمجھایا تھا، مگر وہ تنک کر بولا "مگر میں کل بھی ان سے نہیں ملوں گا۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں تھا۔ ہارون پریشان سے رہ گئے۔

☆☆☆

اور اس کی بدگمانی، یہ شکایت ضوبا نے پہلی بار ہی مل کر کچھ اس طرح سے دور کی تھی کہ وہ ان کی محبتوں کی شدتوں اور آنسوؤں کی برسات کے سامنے ہار سا گیا تھا۔

"تھینک گاڈ فضا کا بوجھل پن تو دور ہوا۔"

جس پل وہ بہت ہلا پھلکا ہو کر مسکرایا، اسوہ چائے کی ٹرالی سمیت اندر آئی تھی، اور اسے دیکھ کر لطیف سی چوٹ کی، مگر معاذ نے اس کی بات پہ کوئی جواب نہیں دیا۔ اچانک وہ اٹھا اور گھڑی دیکھتے ہوئے جانے کو تیار ہو گیا۔

"بابا جانی ایسا ویٹ کر رہے ہوں گے۔"

"بیٹا کال کر لو بتا دو انہیں۔ ابھی تو جی بھر کے تمہیں دیکھا بھی نہیں، کھانا بھی کھاؤ ہمارے ساتھ۔" وہ اس کے پیچھے پیچھے آئی تھیں، اور معاذ ایک دم ہی بے حد طول سا ہو گیا۔ لفظ "ہمارے" اس کے دل میں پھانس بن کر چبھا تھا، اور یہی چبھن اس نے ہارون کے سامنے ظاہر کی تھی۔

"وہ میری ماں ہے بابا! حیدر حق ان پہ دوسرے جتاتے ہیں۔"

اس وقت وہ انہیں وہی معصوم سا بچہ محسوس ہوا۔ جو بہت چھوٹی عمر سے ماں کی آغوش کے لیے ترستا رہا تھا، اور اپنے سوالوں سے انہیں زچ کر ڈالتا تھا، یہاں تک کہ انہیں اسے منتظر کر کے اپنی کہانی سنانا پڑی تھی، اور وہ اسی آس میں دن کا اتنا بڑا ہو گیا تھا، کہ مما کی بابا سے صلح ہو جائے گی، اور پھر وہ سب اکٹھے رہیں گے۔

"وہ ان کی بھی ماں ہے بیٹے! ذہن اور سوچ کو وسیع رکھنا چاہیے۔" وہ ناراضی

سے انہیں تکنے لگا۔

''وہ صرف میری مما ہیں بابا! تو کیپرومائز۔ میں بالکل شراکت پسند نہیں کروں گا۔''

وہ تفکر سے کہتا اٹھ کر چلا گیا۔ ہارون کچھ سوچ رہے تھے۔

☆☆☆

بجلی ہونے کا باعث موسلا دھار بارش کا روپ دھار گئی تھی، جب وہ دوڑتا ہوا لان عبور کرتا اندرونی حصے کی جانب آیا۔ ہر سو خاموشی اور سناٹا تھا۔ اس نے ایک دروازہ کھولا۔

''اماں! اماں کہاں ہیں آپ؟'' لاؤنج پورا ہی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ایک قدم بڑھا اور کسی شے سے الجھ کر لڑکھڑا سا گیا۔

''اُفوہ کہاں ہیں سب! اور یہ اندھیرا؟'' معاً ساری لائٹیں پل بھر میں آن ہو گئیں، اور پورا لاؤنج روشنیوں سے بھر گیا۔ سامنے پھولوں سے سجی ٹرالی پر اس کا من پسند کیک رکھا تھا۔ اور موم بتیاں لگی تھیں۔ یہ سارا اہتمام معاذ کے لیے بے حد حیران کن تھا۔ ٹرالی سے کچھ فاصلے پہ کھڑی اسوہ مسکراتی ہوئی داد طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی، اس کے حیرت زدہ چہرے پہ ساری بات سمجھ میں آتے ہی یکایک گمبھیر قسم کی سنجیدگی چھا گئی۔ تب ہی ضویا ہاتھ میں سرخ اور گلابی پھول کا بالکل تازہ بکے لیے اس کی طرف بڑھی تھیں۔ اور والہانہ انداز میں اس کی پیشانی چوم کر اس کے لمبے چوڑے وجود کو اپنے بازوؤں میں بھرنے کی ناکام سی کوشش کی۔ اسوہ نے آگے بڑھ کر سی ڈی پلیئر آن کر دیا تھا۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو سے پورا لاؤنج گونجنے لگا۔ وہ لب بھینچے کسی قدر خفا نظر آ رہا تھا۔ اسوہ اور ضویا کی آنکھوں میں اسی پل جو خوشی کے جگنو جگمگ کر رہے تھے ان کی جھلملاہٹ اسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھے رہی۔

''آؤ بیٹا کیک کاٹو۔'' ضویا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا، تب وہ محض ان کا دل رکھنے کی خاطر آگے بڑھ آیا۔

''کیا بات ہے بیٹا! آپ بہت سیریس ہو۔ تمہارے بابا شریک نہیں ہیں، مگر وہ اس طرح کی باتوں کو اچھا نہیں سمجھتے ہو۔ میں تو اس لیے۔۔۔''

''اچھا تو میں بھی نہیں سمجھتا ای یہ تو انگریزوں کی رسمیں ہیں جو مجھے وقت اور پیسے کے زیاں کے ساتھ دین سے دوری کا باعث ہی لگتی ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

''اسوہ مجھے اس قسم کے تکلفات پسند نہیں۔''

اس نے اسوہ کو مخاطب کیا، جو اسے کیک پیش کر رہی تھی۔ وہ دھواں ہوتا چہرہ لیے بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی اور ایک جھٹکے سے پلٹ کر باہر نکل گئی۔

''مجھے تم پر فخر ہے بیٹا! تمہارے باپ نے تمہاری تربیت بہت اچھے انداز میں کی ہے، میں شاید کبھی تمہیں اتنا مکمل اور اسٹرانگ نہ بنا سکتی۔''

ضویا کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ''مجھے اپنے بابا پہ فخر ہے، انہوں نے بہت جدوجہد کی ہے میرے لیے، اپنے لیے آپ کو پتا ہے، مجھے منزل پہ پہنچانے کی خاطر انہوں نے اپنا آرام اپنا سکون اور خوشی سب کچھ مجھ پہ نچھاور کیا، وہ دن کو کام کرتے تھے، تو رات کو جاگ کر مجھے پڑھاتے تھے، وہ کہا کرتے تھے جو میرے پاس نہیں رہا۔ وہ مجھے دلوائیں گے، اماں وہ مجھے پولیس ڈپارٹمنٹ میں دیکھنا چاہتے تھے، مگر میں نے انکار کر دیا، پتا ہے کیوں، اس لیے کہ یہ صرف بدنام شعبہ ہی نہیں ہے، یہاں واقعی بہت دھاندلی ہے، میرے بابا ایک ایمان دار آفیسر تھے، بہت کچھ کھو کر وہ اس پوسٹ تک پہنچے تھے، مگر ایک ذرا سی بات کو بنیاد بنا کر انہوں نے بابا کو برطرف کر دیا۔''

ضویا مجرم سی بنی اسے تکنے لگیں۔ کیا اگر یہ جان جائے، کہ اس کے بابا کی نوکری ہی نہیں زندگی کی بھی تباہی کی وجہ وہ ہیں، تو وہ انہیں معاف کر دے گا، اتنی ہی محبت سے ملے گا ان سے۔

وہ سوچ گئی تھیں۔

''اوکے چلتا ہوں اور ہاں، اپنی بیٹی سے کہیے گا، مجھ پہ وقت اور اپنے جذبات ضائع نہ کرے، یہاں دال نہیں گلے گی۔'' آخر میں وہ کچھ شرارتی سا ہوا تھا۔ ضویا نے ہنستے ہوئے اسے دھپ لگا دی۔

☆☆☆

''کیا ہو رہا ہے؟'' سارے گھر میں انہیں تلاش کر کے جب کچن میں جھانکا تو انہیں مصروف دیکھ کر وہیں آ گیا۔

''ارے بابا جانی! آپ کو تنگ کر رہے ہیں۔'' اسے یکایک خجالت نے گھیر لیا۔ کام سے واپسی پہ تھکن اتنی تھی کہ وہ بستر پہ ذرا دم لینے کو لیٹا تھا، مگر پتا نہیں کب آنکھ لگ گئی۔

''اسپیشل آملیٹ بنا رہا ہوں۔ تمہیں پسند ہے نا؟''

انہوں نے انڈے توڑ کر باؤل میں ڈالتے ہوئے مصروفیت سے جواب دیا۔

"بیٹھیں آپ۔ میں کرتا ہوں۔" اس نے کاندھوں سے تھام کر ہٹانا چاہا۔

"ارے یار! تم ایسے کانشس ہو رہے ہو جیسے میں یہ کام پہلی مرتبہ کر رہا ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"جی!" اس نے ٹھنڈی سانس کھینچی اور پھر کسی قدر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بہت دکھ سے گویا ہوا تھا۔

"ہمارے ہاں ہمیشہ سب کچھ الٹا ہی تو ہوتا آیا ہے، جو کام لوگوں کی مائیں کرتی ہیں، وہ کام ہمارے بابا کو کرنے پڑے۔"

ابلے ہوئے آلوؤں کو باریک ٹکڑے کاٹتے ہوئے وہ انہیں چونکا گیا۔ انہوں نے اس کے چہرے کے شاکی تاثرات کو بغور دیکھا۔ "کیا بات ہے معاذ! آج سے پہلے تو تم نے کبھی اس قسم کے شکوے شکایت نہیں کیے۔"

"آج سے پہلے مجھے ماں کی کمی اس حد تک محسوس بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کہ میں اس احساس سے واقف ہی نہیں تھا۔"

وہ کیا کہتے خاموشی سے کھڑے رہے۔

"بابا جانی آپ امی کو لے آئیں۔ میری خاطر اب مجھ سے مزید صبر نہیں ہوتا۔" وہ بھاری آواز میں کہتا اب مچلنے لگا، کسی معصوم سے ضدی بچے کی طرح۔

"مجھے حوصلہ ہی نہیں ہوا معاذ! میں کیسے کہتا۔ یہ بات تو شاید تمہاری ماں کو خود سوچنا چاہیے تھی، شاید یہ گھر اُنکے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ میں پہلے بھی اس سے کمتر تھا اور شاید وہ مجھے اب بھی خود سے کم درجے پہ ہی سمجھتی ہے۔"

معاذ نے چونک کر انہیں دیکھا، وہ جیسے بے خیالی میں کہیں ماضی میں پہنچ گئے تھے، معاذ آہستگی سے پلٹ گیا۔

☆☆☆

"امی! امی!" وہ اندر داخل ہوتے ہی انہیں پکارنے لگا تھا۔ ضوبیا جو اسوہ کے ساتھ ایزی کی بری میں چڑھانے والے زیورات دیکھ رہی تھیں، اس کی آواز پہ بے ساختہ مسکرائیں۔ وہ بھی وہیں آ گیا۔

"امی چلیں، میرے ساتھ۔" ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے قدموں واپس ہوا تو ضوبیا بوکھلا ہی گئیں۔

"مگر کہاں؟" جبکہ اسوہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی، ہلکا آسمانی رنگ کتنا جچ رہا ہے اس پہ اسے اس رنگ کے لباس میں دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

"جہاں میں لے چلوں۔ چلیں گی؟" وہ اچانک ان کی جانب پلٹ کر آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "غلط جگہ پہ اتنا اچھا ڈائیلاگ بول کر مزا ہی کرکرا کر دیا۔" اسوہ موجود ہو اور آس پاس معاذ بھی، پھر بھلا ممکن تھا کہ اس کی شوخی پہ بند بندھے۔ ضوبیا مسکرائی تھیں، جبکہ معاذ نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہیں یاد ہے میں نے ایک بار پہلے بھی تم سے کہا تھا مجھے بے باک لڑکیاں بالکل پسند نہیں ہیں۔" اس کا لہجہ کی سنجیدگی حد تک تلخ تھا۔

"میری خوش بختی کے لیے یہی کافی ہے، کہ تم مجھ سے کہی باتوں کو یاد رکھے ہوئے ہو۔" اس کی چہچہاتی عروج پر تھی۔

معاذ جیسے زچ ہو گیا۔

"بالکل چلوں گی بیٹا چلو۔" ضوبیا نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔

"چلیں اور اس گھر سے جو لینا ہے، لے لیں، میں آپ کو ہمیشہ کے لیے لینے آیا ہوں۔"

وہ اتنا بڑا فیصلہ تنہا کر کے بھی بہت پُرسکون تھا۔ ضوبیا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا لوں گی، جہاں جا رہی ہوں۔ وہاں بھی تو میرا سب کچھ ہے۔ تمہارے اور تمہارے بابا سمیت۔"

وہ اتنے اعتماد سے مسکرا کر گویا ہوئی تھیں، کہ معاذ جو واقعی انہیں آزمانے پرکھنے آیا تھا، ایک پل کو حیران رہ گیا۔

"اب چلیں۔" وہ بہت میٹھی مسکراہٹ سمیت اس کے وجیہہ چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں چلیں۔" وہ ہواؤں میں اڑتا جیسے یکا یک آسمانوں کی بلندیوں پہ اڑنے لگا۔

"آخر میری ماں ہیں، بابا تو بس یونہی ڈرتے رہے۔" اس کا سر یکلخت ہی فخر

سے بلند ہوا۔

"مگر ماما! یہ کیسے ہوسکتا ہے میں تو آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی، پھر یہ گھر، ایزی کی شادی۔۔۔"

جب وہ واقعی اس کے ساتھ چل دیں، تو اسوہ جو اس اچانک سچویشن پہ غیر یقینی سے ساکت تھی، جیسے ایکدم سے جاگی۔

"سب کچھ ہوگا، ایزی کی شادی بھی، اور تمہاری رخصتی بھی، خاطر جمع رکھو۔"

انہوں نے اس کے تھپتھپاتے ہوئے انداز پہ کہا۔

تب ان کی بات سے اپنی مرضی کا مطلب اخذ کرتے اس کا دل سنبھلا تھا۔

"امی! آپ کو خود یہ خیال کیوں نہیں آیا؟" راستے میں اس نے دل میں مچلتا سوال پوچھا۔ وہ مسکرائیں۔

"میں تمہارے بابا جانی کی جانب سے پیش رفت کی منتظر تھی، لیکن خیر تم تو مجھے ان سے بھی بڑھ کے ہو۔"

انہوں نے بہت محبت سے کہا۔ معاذ کھل کر مسکرایا۔

"اب میں بابا جانی سے آپ کی بات بڑھا چڑھا کر پیش کروں گا۔" اس نے آنکھیں نچائیں اور ان کی آخری بات پہ گرفت کی۔

"یعنی لگائی بجھائی کرو گے۔ پہلے ان سے ذھنگ سے صلح تو ہونے دو۔"

وہ بے اختیار ہنسی تھیں، ان کی ہنسی میں معاذ کی ہنسی بھی شامل ہوگئی۔

"یہ تو پاگل ہے ابھی تک بچہ بنا رہتا ہے۔ آپ کو تو سمجھداری سے کام لینا چاہیے تھا ضویا! اکیلی بچی کو چھوڑ کر چلی آئیں۔"

ہارون اندر کی کیفیات چھپائے بہت فکر مندی سے گویا ہوئے، جبکہ معاذ بہت مزے لے لے کر اسپیگیٹی کھا رہا تھا، جو اس نے ضویا سے فرمائش کر کے دیسی مسالے ڈلوا کر بنوایا تھا۔

"یعنی دوسرے معنوں میں آپ میرے، اپنے گھر میں آنے پر خفا ہو رہے ہیں۔"

ان سے معافی تلافی کر لینے کے بعد وہ بہت مطمئن اور سرشار نظر آ رہی تھیں۔ ہارون ذرا خفیف ہوئے۔

"وہ بھلا کیوں کہوں گا میں۔ میں تو اس بچی۔۔۔"

"افوہ بابا! اس بچی کی اتنی فکر کیوں ہے آپ کو، محترمہ تیس سال کی ہو چکی ہیں۔"

معاذ چڑ گیا۔

وہ کچن میں کسی کام سے گئیں اور واپس آئیں تو ہارون کو ایک بار پھر سوچ میں گم دیکھا تو نزدیک آ کر اپنا ہاتھ ان کے کاندھے پر رکھ دیا۔

"پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ اسوہ کو یہاں لانے میں کوئی حرج نہیں تھا، مگر میں باضابطہ طریقے سے اسے لانا چاہتی ہوں۔"

ہارون نے چونک کر ان کی مسکراہٹ دیکھی۔

"مطلب؟"

"مطلب یہ، کہ اپنے معاذ کی دلہن بنا کر۔ وہ بہت پسند کرتی ہے معاذ کو۔"

ضویا نے بہت تفاخر سے بتایا۔

"اور معاذ۔۔۔" ہارون ٹھٹکے تھے۔

"اس نے تو کچھ ظاہر نہیں کیا۔ بہر حال میں اس کی رائے لیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی۔ ڈونٹ وری۔" انہوں نے تسلی دی۔

"تھینکس۔" ہارون واقعی مطمئن ہوئے تھے۔

"نو تھینکس، نو سوری۔" کچھ دیر تک یونہی انہیں شکوہ بھری نظروں سے تکتے رہنے کے بعد وہ بہت استحقاق سے بولی تھیں، ہارون اسرار بہت عرصے بعد بہت دل سے مسکرائے۔

☆☆☆

بہت سارے خدشات، واہمے اور خوف لیے حورین نے اپنے باپ کی دہلیز چھوڑی، اور ایزی کے سنگ اس کے گھر رخصت ہو کر آگئی۔ وہ قسمت کی ستم ظریفی پہ ہراساں ہونے کے بجائے اب خاموش ہو گئی تھی۔ اعتماد، یقین، بھروسا، مان سب کچھ ہی تو بکھر گیا تھا۔ اب کیا بچا تھا۔ ایک ٹوٹا ہوا دل اور سوختہ بدن۔ وہ ایزی پہ یقین کیسے کر لیتی۔ جبکہ اس کے چاہنے والے شفیق باپ نے معنوں میں اسے خود اس کی نظروں سے گرا دیا تھا۔ ضویا اسے اس کے بیڈروم تک پہنچا گئی تھیں۔ ایزی کی طرف اس نے ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ دل ہی نہیں چاہا، حالانکہ کتنی ہی رسموں کی ادائیگی کے وقت وہ اس کے برابر ہی بیٹھا تھا، جا

تھیں وہ واقعی خوش تھا یا خوش نظر آنے کی ایکٹنگ کر رہا تھا، کمرہ بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا، بہت آرٹسٹک انداز میں پھولوں سے آرائش کی گئی تھی مگر اس کا بوجھل اور آزردہ دل کچھ بھی محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ رات دھیرے دھیرے بیتی جا رہی تھی۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہوا تب اس نے اندر قدم رکھا۔ شیروانی اتار کر دور پھینکی، پھر الماری میں کچھ کھٹ پٹ کرتا رہا، اس کے بعد اس کے پاس آ گیا۔ حوریہ کے وہی احساسات جو جامد تھے، اب یکبارگی خوف اور وحشت کا شکار ہونے لگے۔

"یہ بہتر ہے جو آج میں بالخصوص تمہیں تمہارے اس وجود کو خراج پیش کرنے کو چیوں گا، جانتی ہوں کیوں، اس لیے کہ تمہیں اپنی اصلیت پتا چل جائے، تم نے ایزی سے ٹکر لی تھی نا۔" وہ اس کا گھونگھٹ نوچ کر زبردستی چہرہ اٹھاتا، اس کی دہشت سے پھٹی آنکھوں میں اپنی سفاک بے رحم نظریں گاڑھ کر بولا، حوریہ کا دل بجھ کر جیسے ڈوبنے لگا، اب ایزی تمہیں بتائے گا کہ اس روز اگر تمہاری فرینڈ کی وجہ سے میں کامیاب نہ ہوا، تو اسے اب میں پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔ وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔ اس سے پہلے کہ حوریہ اس بدحواسی سے نکل کر اپنا بچاؤ کرتی، وہ تمام لائٹیں آف کرتا اس تک آیا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنی خوش بختی پر جتنا ناز کرتی کم تھا، اس نے جو چاہا تھا اسے مل گیا تھا۔ جس پل وہ اپنی پور پور سجائے معاذ کے پہلو میں بٹھائی گئی۔ منٹوں میں وہ اس کی ہو گئی۔

"آہم!" اس نے باقاعدہ کھنکار کر اس کی توجہ حاصل کی، جو آج بلیک ٹو پیس میں مردانہ وجاہت کا شاہکار نظر آ رہا تھا۔

"جیت لیا نا تمہیں بہت اکڑتے تھے۔" وہ تفاخرانہ ہنسی۔

"میں نے کہا تھا، میں اپنے بابا جانی کی کوئی بھی بات ٹالتا نہیں ہوں۔ یہ میرے بابا جانی کا حکم تھا، اس کے باوجود مانا، کہ میں اسے ماننا نہیں چاہتا تھا۔" اس نے بہت سکون سے کہہ کر بھی اس کی ذات کے پرخچے اڑا دیے تھے اور اٹھ کر اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا۔ اسوہ گم صم بیٹھی تھی۔

☆☆☆

پُرجوش ہشاش بشاش سا معاذ اندر آیا تھا۔

"مجھے مبارک باد دیں امی! آپ کے بیٹے کو ٹیکسلا یونیورسٹی سے لیکچرشپ آفر ہوئی ہے۔ رہائش کی سہولت بھی ہے اور گاڑی بھی۔" وہ آتے ہی ضوبیا سے لپٹا تھا۔

"اللہ مبارک کرے میرے چاند!" ضوبیا نے نہال ہو کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے دعاؤں سے نوازا۔

"چلیں جی۔ موصوف پہلے کم پراؤڈ تھے۔ جو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔" اسوہ نے منہ ہی منہ بڑبڑا کر کہا، اس کی یہ بڑبڑاہٹ نزدیک ہونے کی وجہ سے حوریہ نے سن لی تھی، اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"بھابھی، کسی کی خوشی پہ جلنے والوں کو کیا کہتے ہیں، بھلا؟" وہ حوریہ کو مخاطب کرتا کن انکھیوں سے اسوہ کو دیکھنے لگا۔

"تمہارا سر!" وہ زور سے چیخی اور پیر پٹختی اٹھ کر چلی گئی۔

"تم نے اسے خفا کر دیا، جاؤ مناؤ۔" ضوبیا نے کہا۔ وہ مزید پھیل کر بیٹھ گیا۔

"ابھی یہ ذمہ داری ہم پہ عائد نہیں ہوتی۔"

پھر ضوبیا کے آنکھیں دکھانے پہ معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کر بولا۔

"ابھی رخصتی نہیں ہوئی نا!"

"تو منع کرنے والے بھی تو تم تھے۔" ضوبیا نے فوراً جتایا، وہ جواباً کاندھے اچکا کر ہنسنے لگا۔

☆☆☆

حوریہ نے اس کے کمرے کے پردے ہٹائے۔ اور بکھرا کمرہ سمیٹنے لگی۔ کتنا پھیلاوا تھا، چائے کے خالی مگ، سگریٹ کی ڈبیاں، ایش ٹرے، کشن جو بے ترتیب تھے، وہ کتنی ہی دیر انہی کاموں میں مصروف رہی، اور اس سے لاعلم بھی کہ ایزی کب سے اسے دیکھ رہا ہے۔ کتنی عجیب لڑکی ہے میری اتنی زیادتیوں پر بھی کبھی نہیں کچھ کہا۔ کوئی شکوہ نہ شکایت، نہ گلہ کیا ہے، نہ نفرت مگر نہیں۔ اس نے اپنا خیال خود ہی جھٹک دیا۔ کیا ہے یہ محبت ہے، اس کا دل دھڑکا اور دھڑکتا ہی چلا گیا۔

کیا یہ دل ربا سی لڑکی مجھ سے محبت کرتی ہوگی۔ اس کے دل میں پکڑ دھکڑ سی ہونے لگی۔ اسے اس طرح سے سوچنا اسے دیکھنا اچھا لگنے لگا تھا، جبھی تو حوریہ جب اپنا کام

چھپا کر باہر جانے لگی تو ایزی نے بے اختیار اسے پکار لیا تھا۔
"جی!" وہ حیران سی ہو کر اسے دیکھنے لگی، وہ اس طرح نرمی اور آہستگی سے بھلا کب پکارتا تھا اسے۔
"کہاں جا رہی ہو۔ یہیں رہو میرے پاس۔" وہ دل کی خواہش پہ بند نہیں باندھ سکا۔
"آپ کے لیے چائے بنانے جا رہی ہوں بس آتی ہوں۔" حوریہ نے نرمی سے کہا۔
"جلدی آنا، اس لیے کہ میں ان زخموں کو گلاب بنا کر مہکانا چاہتا ہوں، جو تمہیں مجھ سے ملے ہیں۔"
اس نے بہت آہستگی سے مسکرا کر کہا، حوریہ پہلے چونکی، اور پھر میں اس کی نگاہوں کی معنی خیز شرارت پہ جھینپ کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

آسمان سیاہ گھٹاؤں سے بھرا ہوا تھا۔ چھما چھم موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ فضا میں موجود کہر اس وقت کچھ اور بھی گہرا محسوس ہونے لگا۔ لان میں موجود تمام درخت پودے ہواؤں کی شوریدہ سری پہ ادھر ادھر جھوم رہے تھے۔ موسم تو بہت اچھا تھا، اس کا اپنا ہی دل اداس تھا، اس نے نکاح پہ کھنچی تصویروں کو دیکھا تھا، اور گم صم سی ہوگئی، جو اس وقت بھی سنجیدہ نہیں ہوئی تھی، جب معاذ نے متعدد بار اس پہ اپنی ناپسندیدگی جتائی تھی۔
کیا محبت کے بغیر زندگی گزر سکتی ہے۔ کیوں تو وہ زبردستی کی میں نے، اسے پا کر نہ پانے کا احساس تو اور بھی تکلیف دہ ہوگا نا، وہ کل شام بھی آیا تھا۔ ایزی سے ملنے، تب وہ موجود تھی، مگر ایک نگاہ غلط بھی نہیں ڈالی تھی ایزی کے کہنے پہ وہ اس کے لیے چائے بنانے اٹھی تھی، مگر وہ منع کر چکا تھا۔ اسکے باوجود باہر آگئی اور وہ اس سے ملے بغیر چلا گیا۔ ایک وہ بھی جو اسے دیکھنے کے لیے جتن کرتی تھی۔ کتنا کٹھور تھا وہ۔ خاص طور پہ اس کے لیے، اس سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں دنیا بھر کی ترشی اور کھردرا پن شامل ہو جاتا تھا۔
"... سوچ رہی ہو اداس بلبل کی طرح۔"
اس کی بھاری گھمبیر آواز پہ وہ جو اسے ہی سوچ رہی تھی۔ اپنی جگہ زور سے اچھلی اور اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"اداس ہو؟" اس سے ذرا فاصلے پہ بیٹھتے ہوئے وہ بھرپور سنجیدگی سے بولا۔ اسوہ

نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا، اور لب کچل کر آنسو اندر اتارتی رہی، جو اسے دیکھتے ہی جانے کہاں سے آنکھوں میں جمع ہونے لگے تھے۔
"اس لیے کہ میں کل جا رہا ہوں، یا اس لیے کہ میں تمہیں لفٹ نہیں کراتا ہوں۔"
اب اس نے مچلتی مسکراہٹ ضبط کر لی تھی۔ اسوہ نے غضب ناک نظروں سے اسے دیکھا، مگر آج ان نگاہوں کا رنگ انوکھا تھا۔ وہ لمحہ بھر سے زیادہ نہیں دیکھ سکی۔ پلکیں حیا سے لرزی تھیں۔
"یار! میرا ارادہ تو مکمل استحقاق کے بعد تمہیں منانے کا تھا، مگر یہ بابا کا آرڈر تھا۔"
"اوہ تو تم ان کے کہنے پہ آئے ہو۔" وہ جو سب کچھ بھلا کر خوش ہو چلی تھی، چیخ کر بولی۔
"ہاں یہ تو ہے، اس لیے کہ اپنے بابا کی کوئی بات تو میں ٹالتا نہیں ہوں۔ ورنہ تم جیسی لڑکی——" وہ اب اسے چھیڑ رہا تھا، ورنہ آنکھیں تو کچھ اور کہہ رہی تھیں۔
"کیا؟" اس کی پوری بات سنے بغیر چیخی۔
"تم جیسی محبت کرنے والی لڑکی کو ابھی اور ستانے کا موڈ تھا۔" اس نے سر کھجایا۔
"میری محبت تو دیکھ لی، کچھ اپنی محبت کے بارے میں سوچا ہے؟" اس نے فوراً خبر لی۔
"اُفوہ یار! جب ساتھ رہیں گے تو محبت بھی ہو ہی جائے گی۔" وہ بے نیاز بنا۔
"ہاں جیسے تمہارے بابا جانی کو مام سے۔ سنا ہے، مام کو بھی تمہارے بابا سے ایسی ہی طوفانی محبت ہوگئی تھی۔"
وہ بات کرتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھنے لگی، جہاں سنجیدگی تھی۔
"خفا ہو گئے؟" وہ ڈر گئی۔
"خوبصورت ہونا بھی سزا ہوگی، چڑیلوں کا سایہ ہو جاتا ہے جیسے مجھ پہ۔" وہ شریر ہوا اور اسوہ کی اٹکی سانس بحال ہوگئی۔
"اور جیسے بابا پہ؟" اس نے بدلہ چکایا۔
"میں امی کو بتاتا ہوں۔ تم انہیں کیا کہہ رہی ہو۔"
اس نے دھمکایا ہی نہیں باقاعدہ اٹھ کر اندر کی سمت چلا گیا۔ وہ بوکھلا کر اس کے پیچھے بھاگی۔
"امی! یہ آپ کوئی بہو آپ کو پتا ہے کیا کہہ رہی ہے۔" اس نے اندر جاتے ہی

زور سے کہا اور اس نے اتنی ہی سرعت سے بڑھ کر بازو تھام کر لجاجت سے منع کیا۔ کرشویا اور ہارون اسرار بھی "تھی خیزی سے ہنس پڑے، وہ خجل سی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد وہ جب اگلی شادی کی تاریخ فائنل کر رہے تھے۔ ایزی نے بے خیالی میں سگریٹ سلگانا چاہا تھا۔ حوریہ نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے ٹوکا تھا اور آنکھوں میں نفی کا اشارہ کیا۔ معاذ نے دیکھا، اور مصنوعی انداز میں کھانسا۔ دونوں چونکے اور خجل ہو گئے۔ یہی تھے محبتوں کے مان اور استحقاق۔ بالکل ویسے جیسے ایزی نے سگریٹ واپس رکھا تھا، جیسے ابھی مام نے بابا کی جیب سے والٹ نکال کر مطلوبہ رقم لی تھی، جیسے اس نے معاذ کو شرارت سے روکا تھا، دیر سے سہی مگر من چاہا احساس ان سب نے حاصل کر لیا تھا۔



کاسے کہوں اپنے جیا کی

کراچی ایئر پورٹ پر اتر کر اس نے اطراف میں نگاہ ڈالی اور رعایت آمیز انداز میں گہرا سانس کھینچ کر سر جھکا لیا۔ بظاہر سب کچھ ویسا دکھائی دینے کے باوجود کتنا کچھ بدل گیا تھا، یہ کوئی اس کے دل سے پوچھتا، جو وہ سیاہ جارجٹ کے جدید تراش خراش کے لباس پہ سرخ قیمتی شال شانوں پہ پھیلائے سلمان حیدر کی اُنگل تھامے، متلاشی نگاہوں سے جس پل کسی شناسا چہرے کو تلاش رہی تھی، جانے کیوں ذہن میں ماضی کا ایک لمحہ روشن ہوا تھا۔

بلیک جینز پہ سوبر کلر کی شرٹ پہنے اس کا حسن بھڑک کر شعلہ جوالہ ہو رہا تھا۔ چیکنگ کے دوران وہ خود پہ اٹھتی توصیفی وستائشی نگاہوں سے بے نیاز چیونگم چباتی اپنا سامان سنبھالتی آگے بڑھ آئی تھی۔ نگاہوں کا اٹھنا اور خود پہ ٹھہر جانا اس کے لیے معمول کی بات تھی، وہ اپنے بے تحاشا حسن سے خود بھی اچھی طرح آگاہ تھی۔

"ارے ایک منٹ رکیے تو۔" اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو اسمارٹ خوبرو اور لمبے چوڑے سراپے نے راہ میں حائل ہو کر روکا تھا۔

"واٹ نان سنس!" لہجہ کھولتا ہوا سا بے حد برہم تھا، مگر دوسری سمت بلا کی خود اعتمادی اور بے نیازی تھی۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر کوٹ اور جینز کی جیبوں سے کچھ تلاش رہا تھا۔

"یہیں تو تھی کہاں گئی۔"

"مسٹر آپ!" وہ کچھ اور تپ گئی تھی۔

"مل گئی۔" وہ خوشی سے چہک کر تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر بولا، پھر

ایک نگاہ اس پہ ڈال کر تصویر کو گھورنے لگا۔

''اے مسٹر! کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں؟ راستہ چھوڑیں۔'' وہ جھنا کر بولی تھی۔

اور وہ کھنے کی ایکٹنگ کرتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹا اور آنکھیں پھاڑ کر بولا تھا۔

''لیکن اگر میں تمہیں دیکھوں گا نہیں، تو مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تم میری چچا زاد بہن اریبہ لغاری ہو۔''

اس کے قدم بڑھانے پر وہ اس کے آگے چل پڑا تھا۔

''اوہ تو تم عباس حیدر ہو۔''

''واٹ!'' وہ زور سے اچھلا ''تم مجھے جانتی ہو؟'' اس کی کشادہ آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھل کر کچھ اور کشادہ ہو گئیں۔ انداز میں خفگی نمایاں تھی۔

''بہت اچھی طرح سے، ظاہر ہے تم شاہ رخ خان جو ہو۔'' اس نے غصے سے کہا تھا، تب وہ کھل کر ہنسا تھا۔

''خیر! اب ایسی بات بھی نہیں، ویسے تم اریبہ ہی ہو نا؟''

اس کی سمت جھک کر وہ بات کے اختتام پر مشکوک سے انداز میں وضاحت طلب کر گیا تو اریبہ نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

''ابھی بھی کچھ شک ہے تو ایک بار پھر فوٹو دیکھ لو۔''

''ارے!'' وہ جھینپ کر ہنسا تھا ''سوری یار! پہلے کبھی دیکھا نہیں نا تمہیں، اماں نے تمہیں لانے کا کہا تو میں کچھ پریشان ہو گیا، تب فراز نے یہ آئیڈیا دیا تھا، ویسے ایک بات ہے تم تو اپنی تصویر سے زیادہ اٹریکٹو ہو، اماں کو نہ بتانا۔'' اس کے ہاتھ سے ٹرالی پکڑ کر چلتا ہوا وہ اس بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ سے یونہی ایک دوسرے سے بات چیت کرتے رہے ہوں۔

اریبہ کو یکدم ہی غصہ آ گیا تھا۔ اس کے یوں پل بھر میں بے تکلف ہو جانے پر، جواباً وہ کتنی دیر تک ہنس کر اسے زچ کرتا رہا تھا۔

''مما آپ تو کہہ رہی تھیں، چاچو ہمیں ریسیو کرنے آئیں گے۔'' سلمان حیدر کی آواز اسے ماضی کے گرداب سے کھینچ کر لانے کا باعث بنی تھی، ہتھیلی کی پشت سے اس نے

آنکھوں میں اترا دھندلا غبار صاف کرتے ہوئے جھک کر سلمان کو دیکھا، جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''ہاں بیٹے، وہ دیکھیں آپ کے بڑے پاپا آئے ہیں ہمیں لینے۔'' اسی لمحے اس کی نگاہ ریلنگ کے پار پڑی تھی، جہاں آنے والوں کا استقبال کرنے والوں کا جمگھٹا تھا۔ عاصم بھائی اسی ہجوم میں سے ہاتھ ہلا ہلا کر اسے متوجہ کر رہے تھے، ان کا جوش و خروش قابل دید تھا۔ اریبہ کیدل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔ فراز کے مطابق اسے ریسیو کرنے کے لیے کم از کم عاصم بھائی کو نہیں آنا تھا۔ پہلے ہی قدم پہ عہد شکنی کے خیال نے اس کے دل کی دھڑکنوں میں بھونچال بھر دیا۔ کیا ایک بار پھر وہ جال میں پھنسنے والی تھی لاتعداد خدشات کا عکس اس کے چہرے کی زرد و عیار رنگت کو متغیر کر گیا۔

وہ لپک کر قریب آ گئے۔

''کیسی ہو گڑیا؟'' سلمان حیدر کو گود میں اٹھا کر سینے سے لگانے کے بعد چومتے ہوئے وہ مسکرا کر بولے۔

''جی اچھی ہوں۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

''وہ تو مجھے پتہ ہے کہ تم اچھی ہی نہیں، بہت اچھی ہو جب ہی تو سب کچھ بھول کر ایک بار پھر یہاں آ گئی ہو۔'' اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ندامت سے بولے تب اریبہ کے اندر ایک بار پھر سے ناقابل تلافی نقصان کا احساس سسک اٹھا تھا۔

''گھر میں سب خیریت سے ہیں؟'' دانستہ بات کا رخ بدلتے ہوئے وہ بہت ضبط سے مسکرائی تھی۔

''ہوں الحمدللہ۔'' جواباً وہ سلمان کو اتار کر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ٹرالی کھینچنے لگے۔

واقعی بہت کچھ بدل گیا، اس نے آزردگی میں گھر کر سوچا تھا اور بے اختیار سرد آہ بھری، فراز اپنی اسی چونچال طبیعت سمیت ہنستا کھیلتا، شرارتیں کرتا ہوا ملا، مگر اندر کی سنجیدگی و بردباری چھپائے نہ چھپی۔ عاصم بھائی جو ہر وقت ایک خول میں سمٹے رہتے تھے، اب مختلف روپ میں ہر کسی پہ پھبتیں لگاتے ہوئے نظر آئے۔ پھر تایا جان تھے، تھکے ماندے رنجیدہ و دل، سب سے بڑا تغیر تو تائی اماں کی شخصیت میں نمایاں تھا۔ اتنی محبت، ایسا خلوص، اور والہانہ انداز، گو کہ فراز اسے ان کے بدل جانے کا بارہا یقین دلاتا رہا تھا مگر اتنی بڑی تبدیلی

وہ گویا ابھی تک غیر یقینی کی کیفیت کے حصار میں تھی۔ تائی اماں نے تو دادو کی جگہ سنبھالی تھی۔ ان ہی کے انداز میں لپٹا کر جب اس کا ماتھا چوما تو کتنے ہی آنسو بے آواز بہتے چلے گئے تھے۔

"مجھے معاف کر دو بیٹا! احساس جرم مجھے مارے ڈال رہا ہے۔" اور تب وہ اپنے رستے ہوئے زخموں سے نگاہیں چرائے ان کی ڈھارس بندھانے لگی تھی۔ بھابھی بھی اپنے تینوں بچوں سونیا، عاریہ اور ایشان کے ہمراہ اسی گھر میں تھیں۔ ایک کمی تھی تو اس کی، مگر وہ جیسے کہیں نہ ہو کر بھی ہر جگہ موجود تھا۔ یادیں تھیں، کہ آکٹوپس کی مانند اسے جکڑ رہی تھیں، وہ کہاں کہاں آنکھوں کو بھیگنے سے بچا پاتی۔ اس وقت بھی عباس حیدر کی جمبو سائز انلارج شدہ تصویر کو دیکھ کر سکتے کے عالم میں تکتی چلی گئی تھی، نگاہ تب چھڑا پائی جب سلمان حیدر کسی بات پر کھلکھلاتا ہوا آ کر اس سے لپٹا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا جسے سمجھنے سے اس کا ذہن قطعی عاری رہا، بھیگے ہوئے آنکھوں کے گوشے گو کہ اس نے بہت غیر محسوس انداز میں صاف کیے تھے مگر سر اونچا کرتے ہی فراز کو اپنی سمت تکتا پا کے جھٹ نظریں چرا گئی۔

"آیئے بھابھی! اندر چل کے بیٹھتے ہیں، یہاں کچھ زیادہ ہی سردی محسوس ہو رہی ہے۔" ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر گرمائش دیتا ہوا وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ تب وہ ایک پل کی تاخیر کیے بنا سرعت سے اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔

"کیسے گزرا اتنا وقت ہمارے بغیر؟" فراز چائے کے مگ اٹھائے اس کے پیچھے ہی چلا آیا اریبہ اس وقت تنہائی کی متمنی تھی، مگر منہ پھاڑ کر کہنا بالکل مناسب نہیں تھا۔ جب ہی اس کا بڑھایا ہوا چائے کا بھاپ اڑاتا مگ تھامتے ہوئے جبراً مسکرائی تھی۔

"بہت اچھا گزرا، تم سناؤ جیا کیسی ہے؟" اس نے مختصر سے جواب کے ساتھ گفتگو کے دھارے کو اپنی ذات سے موڑ کر اسی کی جانب کیا، تو فراز اس کے یوں دامن بچا جانے پہ بغور اسے دیکھنے لگا تھا۔

"بھابھی! ایک بات کہوں؟" چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے بالکل اچانک اسے مخاطب کر لیا۔

اریبہ قدرے چونکی تھی پھر اسے دیکھنے لگی۔

"کوئی ایسا بات نہ پوچھنا فراز! جس کا جواب دینا نہ چاہوں۔" تلخی لہجہ اس قدر

دو ٹوک تھا کہ فراز جو بہت عزم لے کر آیا تھا بہت کچھ کہنے کا، چپ کا چپ رہ گیا۔ جبکہ اریبہ سلمان کے پکارنے پہ اٹھ کر چلی گئی۔ چائے کے دونوں کپ پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ فراز کسی سوچ میں ڈوب رہا تھا۔

☆☆☆

تائی جان نے اس کے لیے عباس حیدر کا بیڈ روم کھلوایا تھا، مگر اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ اس کی فرمائش پہ ہی تائی اماں نے اس کے لیے بالائی منزل پہ بیڈ روم صاف کروایا تھا۔ سلمان کو سلا کر وہ خود بھی لیٹ گئی تھی، مگر نیند تو جیسے آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

ایک ماہ کے بعد اسے واپس چلے جانا تھا، گو کہ چھ سال قبل یہاں سے جاتے ہوئے اس نے کبھی دوبارہ لوٹ کر یہاں نہ آنے کا فیصلہ کیا تھا، مگر انسان کو اپنے ہی فیصلوں سے مکرنے والے یہ خون کے رشتے ہی ہوا کرتے ہیں۔ جن کا احساس چاہے بسا اوقات مجبوری بھی وہ کچھ کرنے پہ اکساتی ہے۔ جس کا انسان نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا، اسے بھی اسی قسم کے جذبات نے مغلوب کر ڈالا تھا۔ فراز سے خون کا ہی نہیں دوستی اور مان کا بھی رشتہ استوار ہوا تھا۔ پھر بھی فراز کی ڈھیروں خطوط اور فون کالز کو اس نے درخوراعتنا نہیں جانا تھا مگر جب مما نے بھی وہی بات کی، تب وہ بھونچکی رہ گئی تھی۔

"آ، آ، آپ کہہ رہی ہیں مما؟" اسے اپنی سماعتوں پہ شک سا ہونے لگا تھا۔

مما نظریں چرا گئی تھیں۔

"ہاں کیا حرج ہے، چلی جاؤ دل بہل جائے گا۔" اور تب وہ زہر خند سے ہنس پڑی تھی۔

"دل بہل جائے گا، ویری فنی مما! میرے دل کی آپ کو اتنی پروا کب سے ہونے لگی؟" مما اسے خاموشی سے دیکھ کر رہ گئیں۔

"کیوں چاہتی ہیں کہ میں وہاں جاؤں۔" ضبط کرتے ہوئے بھی اس کی آواز پہ آنسوؤں کی غالب آ گئی تھی۔

"تمہاری تائی اماں بہت بیمار ہیں۔"

"آپ اپنی بات کریں۔" وہ تنفر سے بولی۔

"تم بس وہاں جاؤ! انہیں ڈھارس دو انہیں معاف کر دو بس۔"

"بس!" وہ زخمی سے انداز میں ہنسی تھی تب مما کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

"سنا ہے عباس تو وہاں نہیں پھر تم کیوں خفا ہو۔"

اور ادیبہ کے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹا تھا۔

"وہ تو کیلیفورنیا میں ہے پچھلے چھ سالوں سے ایک بار بھی لوٹ کر نہیں آیا، ماں کی منت سماجت کے باوجود، تم ہی ان پر رحم کھا لو، بیٹا معاف کر دینے میں بہت بڑائی ہے" وہ اسے بہت لمبا لیکچر دیتی رہی تھیں۔

جب وہ وہاں سے اٹھی تو ایک فیصلہ کر چکی تھی پاکستان آنے کا فیصلہ۔

☆☆☆

شادی کی تیاریاں تقریباً مکمل تھیں، چند ایک کام جو باقی تھے انہیں بھی بھابھی جلد از جلد نپٹانے کی فکر میں تھیں۔ ایک افراتفری اور ہڑبونگ سی مچی رہتی تھی۔ جیسی ہر شادی والے گھر میں ہوا کرتی ہے، کہ تقریباً ہر روز ہی رات کو فراز کے تمام کزنز رشتہ دار جو اسی شہر میں مقیم تھے آ کر ڈھولک بجا کر ہلا گلا کر لیا کرتے۔ لڑکیاں ادیبہ کو گھیر کے بیٹھ جاتیں۔ پھر وہی باتیں شروع ہوتیں، جن سے وہ بچنا چاہ رہی تھی۔ وہ سب کی سب اس کے ان بے تحاشا حسن کے رازوں سے آگاہ ہونا چاہتی تھیں، اس کے لانبے گھنیرے ریشمی بال، چمکتی ہوئی بے داغ دودھیا جلد اور روشن چمکتی ہوئی آنکھیں، ان سب کے لیے بے پناہ کشش کا باعث تھیں، اور اپنی تعریف پہ وہ کبھی جھینپ جاتی، کبھی یونہی مسکرا دیتی اور اس رات جب ایسی ہی کسی تعریف کے جواب میں تائی اماں نے کہا تھا۔

"میرا عباس بھی تو کچھ کم نہیں، ماشاء اللہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے اتنے اچھے ہیں کہ نگاہ نہیں ٹکتی، فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے، دونوں میں کون زیادہ خوب صورت ہے۔"

اور تب ادیبہ کا دل کچھ اس طرح گھبرایا تھا، کہ اس سے وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ عباس یہاں موجود نہ ہو کر بھی ہر ہر جگہ اپنا احساس بخش رہا تھا۔ اس کی یادیں، اس کا تذکرہ اسے قدم قدم پہ گھیر رہا تھا، اور وہ اتنی مضبوط نہیں تھی، کہ خود کو یوں چھپا کر جھوٹی مسکان لبوں پہ سجا لیتی، گو کہ فرداً فرداً ہر کسی نے اس سے معذرت کی تھی، مگر وہ ہر بار ہی اس موضوع سے کترا گئی تھی۔ فراغت عموماً سوچوں کو بڑھاتی ہے، یہی وجہ تھی کہ اس نے بھابھی سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس کے لیے کوئی کام ہو تو بتا دیں، جواباً وہ بے طرح خوش ہو گئی تھیں۔

"نہیں چندا! کام تو کچھ خاص نہیں رہ گئے سبھی کچھ تیار ہے۔ بس میری شاپنگ رہ گئی ہے، کسی دن چلنا میرے ساتھ تمہاری چوائس بہت اچھی ہے۔"

شاپنگ کرتے ہوئے بھابھی کے اصرار پہ اسے محض ان کا دل رکھنے کی غرض سے اپنے لیے مزید چند جوڑے خریدنے پڑے، سارے دن کی خواری نے اسے تھکن سے نوازا تھا جب ہی آتے ہی سارے شاپنگ بیگ کارپٹ پہ ڈھیر کرتے ہوئے گرنے کے انداز میں صوفے پہ بیٹھ گئی۔

"بھابھی پلیز، چائے پلوائیں۔ میرا تو سر گھوم رہا ہے۔" شال اتار کر سائیڈ پہ رکھتے ہوئے اس نے درد سے پھٹتے سر کو ہاتھوں سے دبایا۔

"اچھا ابھی لاتی ہوں" بھابھی الٹے پیروں پلٹ گئیں اور جس پل وہ گرما گرم چائے کے مگ سمیت اس کے سامنے آئیں، وہ ایک دم ہی شرمندہ سی ہو گئی۔

"آپ نے بنائی ہے سوری بھابھی! مجھے دھیان۔"

"کم آن ڈیئر! فرزانہ چائے بنا چکی تھی۔ میں تو صرف اٹھا کے لائی ہوں۔" بھابھی نے مسکرا کر تسلی دی تب وہ مطمئن سی ہو کر چائے کی سمت متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

دیدار کو ترسیں انکھیاں
نہ دن گزرے نہ کٹے رتیاں

وہ اپنے دھیان میں اندر آئی تھی۔ فرزانہ کو ڈھولک پیٹنے کے ساتھ حلق پھاڑتے دیکھ کر خفیف سی ہو گئی۔ ایک سائیڈ پہ بیٹھنا چاہ رہی تھی، جب فراز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر کھینچا تھا۔

"چھوڑو نا فراز! سب دیکھ رہے ہیں۔" وہ کنفیوز سی ہوتی آہستگی سے کہہ کر اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔

"اوہ کم آن! ابھی میں ہوں، عباس بھائی نہیں۔"

اس کے فس کر کیے گئے مذاق پہ ادیبہ کا چہرا جانے کس احساس کے تحت بے تحاشا سرخ ہوا تھا۔ سر جھکا کر وہ بے دردی سے لب کچلنے لگی تھی۔ جب فراز نے مزید شوشا چھوڑا۔

"آپ گانا سنائیں۔"

"نہیں پلیز۔" وہ منمنا کر رہ گئی مگر وہاں کس پہ اثر ہوا تھا۔ جب سب نے ضد کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ ڈالا کہ اگر وہ گانا نہیں سنائے گی تو ڈانس کرنا پڑے گا اور ڈانس کے تو نام سے ہی اسے چڑ تھی۔

تب کوئی راہ نہ پا کر اس نے سر جھکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ چند لمحے کچھ سوچا تھا۔ دل کا درد چھلک لبوں پہ بکھرا اور پورے ماحول پہ سکوت چھانے لگا۔

اے دل کسی کی یاد میں ہوتا ہے بے قرار کیوں
جس نے بھلا دیا تجھے اس کا ہے انتظار کیوں

اس کی پرسوز مدھر آواز کا سحر ہر سو بکھر رہا تھا۔ ماحول پہ ہر سو سناٹا طاری تھا۔ وہ سب جیسے کسی ٹرانس میں چلے گئے۔ لاؤنج کے دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی عباس حیدر اس سحر زدہ آواز پہ لمحہ بھر کو ٹھٹکا تھا۔

سختی سے بند لرزتی پلکوں کا مرتعش سایہ گالوں پہ منتشر کیے، تھا لیے سوٹ پہ ریڈ دوپٹہ شانوں پہ پھیلائے، اپنے شعاعیں بکھیرتے دلکش روپ سمیت وہ اس کی قوت گویائی چھین لے گئی تھی، اس کی یہاں موجودگی جس قدر غیر یقینی تھی اس کا سامنا اسی قدر شاک میں مبتلا کر دینے والا تھا۔ وہ شگفتہ و تر و تازہ گلاب کی مہ بند کلی کی مانند آج بھی نگاہوں کو جکڑ لینے کا ہنر رکھتی تھی، وہ سب اتنے محو تھے کہ کسی کو بھی اس کی آمد کا پتہ نہ چل سکا۔

تو نے ہے پھر بنا لیا غم کو گلے کا ہار کیوں
اے دل کسی کی یاد میں ہوتا ہے بے قرار کیوں
جس نے بھلا دیا تجھے اسکا ہے انتظار

کسی کی نگاہوں کے مسلسل حصار نے اسے بوجھل پپوٹوں کو اٹھانے پر مجبور کیا تھا، عباس حیدر کو کاندھے پہ بیگ سمیت، ایک سکتے کی کیفیت میں اپنے روبرو پا کے وہ اسی کیفیت کا شکار ہوئی تھی، جس سے عباس حیدر گزرا تھا۔ اس کے چہرے پہ زلزلے کے آثار نمودار ہوتے دیکھ کر فراز نے چونکتے ہوئے پلٹ کر دیکھا، اور محض چند ثانیے کو گھبرایا۔ اگلے ہی لمحے وہ چھلانگ لگا کر عباس تک پہنچا تھا، تب ہی عباس بھی جیسے اس ٹرانس سے نکلا تھا، اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ مڑا اور سرعت سے باہر نکل گیا۔ "بھائی، بھائی میری بات تو سنیں۔" فراز بھی پکارتا ہوا پیچھے بھاگا اور یہ اٹھ کے آنسوؤں کو روکتی تیزی سے باہر نکل گئی۔

"نو آرگومنٹ پلیز۔ میں نے تم سے کچھ پوچھا نہیں ہے۔ سو پلیز اپنا وقت ضائع مت کرو۔"

فراز پیچھے ہی اس کے پیچھے بیڈ روم میں آیا، وہ سگریٹ سلگا رہا تھا اسے کچھ کہنے کو منہ کھولتے دیکھ کر قطعی لہجے میں بولا، اور اس کا یہی لہجہ پچھلے چھ سالوں سے ان سب کو کچھ بھی کہنے سے روک دیا کرتا تھا۔ وہ اتنا سرد مہر اتنا اجنبی محسوس ہونے لگا تھا، کہ صدیوں کے فاصلے پہ محسوس ہوا کرتا۔

"بھائی! بھابھی بالکل بے قصور ہیں، آپ جب تک کچھ سنیں گے نہیں کہو۔"

"فراز کیا چاہتے ہو، چلا جاؤں یہاں سے؟" وہ اس قدر تلخی سے بولا تھا کہ فراز محض اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"او کے فائن! مگر بھائی، سلمان کا کیا قصور ہے، وہ کیوں باپ کی محبت سے محروم ہے۔ قصور اگر بھابھی کا بھی ہے، تو سزا اسے کیوں دے رہے ہیں" اس کا لہجہ گلوگیر ہوا تھا۔

"کون سلمان؟" عباس قدرے چونکا، اس کی آنکھوں میں رہنے والا سرد تاثر لمحہ بھر کو سہی تحیر میں ڈوبا تھا۔

"آپ کا بیٹا! آپ نے اگر کبھی کچھ سننے کی کوشش کی ہوتی تو پتہ بھی چلتا نا، کہ آپ کی کوئی اولاد بھی ہے" وہ پلٹ کر باہر چلا گیا۔ عباس حیدر کو جو ضرب اس نے لگائی تھی وہ اتنی کاری ضرور تھی، کہ اس کے اندر کا گلیشیر سارے کا سارا نہیں تو کچھ نہ کچھ تو ضرور پگھلا اور ابھی اتنا ہی بہت تھا۔

☆☆☆

اس کے اندر اداسی بال کھولے بیٹھی تھی، اس نے کھڑکی سے ایک بار پھر باہر نگاہ کی۔ وسیع سرسبز لان کے بیچوں بیچ بچھی کرسیوں میں سے ایک پہ عباس حیدر بیٹھا تھا بلیک شلوار سوٹ میں اپنی شاہانہ مردانہ وجاہتوں سمیت، پہلے سے کہیں دلکش اور شاندار نظر آ رہا تھا۔ مضبوط وجود اپنی تمام تر وجاہت اور غضب کی اسمارٹنس سمیت، اس لباس میں بے پناہ جچ رہا تھا۔ کبھی یہ شاندار سا شخص پورے کا پورا اس کا تھا۔ بلا شرکت غیرے، اور اب اس کے لبوں سے کراہ سی نکلی تھی اور آنکھوں میں دھندلا غبار پھیلنے لگا۔

سلمان حیدر کی اس کے آس پاس موجودگی اس بات کی گواہ تھی، کہ اس نے اپنے

بیٹے کو قبول کر لیا تھا، وہ اس کی اولاد تھی، اسے ایک نہ ایک دن اس کی جانب پلٹنا ہی تھا۔ وہ کہاں تھی، کہیں بھی نہیں، اسے عباس کی وہ نگاہ یاد آئی، جس میں اس کے لیے صرف نفرت تھی۔ بھڑکتی ہوئی نفرت، جو اس کا تن من...... جھلسا کے رکھ گئی تھی۔ چھ سال بعد اور چھ سال پہلے والی اس آخری نگاہ میں ایک لمحے کا بھی تو فرق نہیں تھا، وہ ہی نفرت وہی بے کلی جب اس کا نصیب بنی تھی، جو ابھی بھی اسے دیکھ کر عباس کی نگاہوں سے چھلکی تھی، اس کے تاثرات سے چھلکی حقارت، آنکھوں سے لپکتی ہوئی جارحیت، اس پہ اس کی حیثیت کو بہت اچھی طرح سے واضح کر چکی تھی۔ اب اسے عباس حیدر کی نفرت سے کہیں بڑھ کر اپنے بیٹے کی فکر تھی، اسے سلمان حیدر کی فکر لاحق ہوئی تھی۔ اس کا بیٹا باپ کی محبتوں شفقتوں اور توجہ کا ترسا ہوا تھا، اب جبکہ اسے یہ سب کچھ ملا تھا تو کیا وہ اس کے بغیر رہ پائے گا، جب سے وہ بڑا ہو رہا تھا اس کے باپ کے متعلق سوال اسے اکثر زچ کرنے لگے تھے۔

"بھابھی!" اسے ان سوچوں سے فراز کی آواز نے کھینچ کر نکالا تھا، وہ قدرے چونکتے ہوئے پلٹی، تو فراز اس کی آنکھوں میں اداسی کو محسوس کرتا جانے کیوں شرمندہ سا ہو گیا۔

"آپ نے چینج نہیں کیا؟" اسے کل رات کے لباس میں بکھرے بالوں اور ستے ہوئے چہرے سمیت روبرو پا کے فراز نے آہستگی سے پوچھا تھا۔

"نہیں بس یونہی آؤ بیٹھو۔" ہلکا سا رخ پھیر کے دوپٹے کے پلو میں آنکھوں کی نمی کو سمیٹتے ہوئے اس نے بہت دقتوں سے خود کو نارمل ظاہر کیا۔

"سوری بھابھی! ویسے آپ مجھے اس دنیا کا پکا فراڈیا انسان سمجھ کر خوب گالیاں دے رہی ہوں گی۔" فراز سر کھجاتے ہوئے خجل سا ہو کر بولا، تو اریبہ کی سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے کی جانب اٹھ گئیں۔

"میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا، کہ بھائی یہاں نہیں ہیں، حالانکہ بھائی تو۔"

"فارگیٹ اٹ فراز!" اریبہ نے فی الفور اسے ٹوک دیا۔ "تم نے جو کچھ بھی کیا میں اس کی جواب دہی نہیں چاہوں گی، سو پلیز وضاحتیں بھی مت دو۔"

"یہی تو آپ دونوں کی خرابی ہے بھابھی! وہ موصوف بھی کچھ سننے کو تیار نہیں اور آپ۔"

"فراز ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ جھنجلائی تھی۔

"شیور وائے ناٹ...... بس آپ فٹافٹ میرے ساتھ چلیں، پھر باتیں بھی ہوں گی اور کچھ کھانا کھلانا بھی ٹھیک ہے۔"

"ہوں، تو چلو میں چینج کر لوں پھر آتی ہوں۔" وہ رخ پھیرے وارڈ روب کی سمت بڑھ گئی تو فراز کو اٹھنا پڑا تھا۔

☆☆☆

صبح ناشتے میں سلمان کو ناشتا کرانا اس کے لیے ہمیشہ بے حد کٹھن مرحلہ ثابت ہوتا تھا۔ پھر آج کل باپ کے لاڈ پیار نے چند دنوں میں ہی اسے بہت ضدی اور من مانی کرنے والا تقریباً بچہ بنا ڈالا تھا۔ اس وقت بھی اریبہ بہت منت سماجت کر کے اسے دودھ پینے پہ آمادہ کر پائی تھی، جب سلمان کی نگاہ ٹریک سوٹ میں ملبوس جاگنگ سے واپس آتے عباس حیدر پہ پڑی تھی۔

"پاپا آ گئے۔" وہ جوش میں اچھلا تھا۔ جھک کر سلمان کو پیار کرتا ہوا وہ اسے ایک بار پھر یوں اگنور کیے ہوئے تھا جیسے وہ سرے سے وہاں موجود ہی نہ ہو۔ توہین کا سلگتا احساس اس کی رنگت دہکا کے رکھ گیا۔

لب بھینچے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی، مگر دوپٹے کے کھنچاؤ پہ شدید قسم کی اذیت میں مبتلا ہوتے ہوئے اسے پلٹنا پڑا تھا اس کے دوپٹے کا ایک پلو عباس حیدر کے وزنی جوتے کے نیچے دبا تھا۔ اس نے تڑپ کر دوپٹے کے دوسرے پلو کو پکڑ کر ڈھیلا کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن کو سہلایا، گلے میں شدید قسم کے کھنچاؤ کے ساتھ تکلیف کا احساس بھی حاوی تھا اس سے بڑھ کر جو احساس تھا وہ عباس حیدر کی بے اعتنائی کا تھا، جس نے پل بھر میں اس کی آنکھوں کے گوشوں کو بھگو ڈالا۔ اس نے معذرت کا ایک لفظ تو درکنار ہمدردی کی نگاہ تک ڈالنا گوارا نہ کی تھی، اور یونہی کوئی تاثر دیے بنا اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اریبہ کی ڈبڈباتی آنکھوں میں اس کا وجیہ سراپا دھندلا گیا تھا۔

☆☆☆

دوپہر کے کھانے کے بعد سلمان اس کے پاس آیا تھا وہ ابھی آرام کی غرض سے لیٹی ہی تھی۔ جب سلمان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔

"مما ہم شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلیں۔" وہ اس کے گلے لگتے

چہرے سے اندازہ کر سکتی تھی کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ جا رہا ہے۔

"تھینکس بیٹے آپ جاؤ، مما کو کچھ نہیں لینا، وہ شاپنگ کمپلیٹ کر چکی ہیں۔" اس کا گال سہلا کر نرمی سے بولی۔

"ٹھیک ہے مما! لیکن پھر بھی میں آپ کے لیے کچھ نہ کچھ لے آؤں گا۔" اس کے بیٹے نے بڑوں کے سے انداز میں اس کو تسلی دی، تو اس کے لبوں پہ ایک بھولی بھٹکی سی مسکان جھلک دکھلا کر معدوم ہو گئی تھی۔

پھر جب شام ڈھلے سلمان کی واپسی ہوئی، وہ سب گھر والوں کے ساتھ ہال میں موجود تھی۔ اس نے تو گویا اگلی پچھلی تمام کسریں نکال لی تھیں۔ کپڑے جوتے کھلونے چاکلیٹ اور جانے کیا کچھ اس کے سامنے کارپٹ پہ چیزوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔

"دیکھا مما! پاپا نے مجھے کتنی ساری چیزیں دلائی ہیں۔"

سلمان خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا، سلمان کی ایسی کون سی خواہش تھی، جو اریبہ نے بنا کہے پوری نہ کی ہو، مگر وہ بھی اسے اتنا فریش اس قدر خوش نہ دیکھ سکی تھی، جتنا وہ اب نظر آ رہا تھا۔

"مما پاپا نے آپ کے لیے ڈریس لیا ہے، دیکھیں نا۔" سلمان کو اچانک یاد آیا تو سامان میں سے بڑا سا ڈبا کھینچ کر اوپر کرتے ہوئے چہک کر بولا، اریبہ کا دل پوری قوت سے اچھل کر سکڑا تھا۔ اس کی سپاٹ نگاہ بھابی کی سمت اٹھی تھی، وہ سلمان کے ہاتھ سے ڈبا پکڑ کر شرارت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔

"یار! آج اس زاہد خشک نے ہمیں بہت حیران کیا ہے۔" وہ کچھ کہے بنا محض نظریں چرا کر رہ گئی عباس حیدر کی اس انوکھی ادا نے اسے بھی اچھا خاصا حیران کیا تھا۔

کھٹا کھٹ، دیکھنا ذرا اریبہ! ڈبا کھول کر جو سوٹ نکالا تھا۔ وہ اس قدر اسٹائلش اور شاندار تھا کہ بھابی تعریف کیے بنا نہ رہ پائیں۔ سرخ جھلملاتا شلوار دوپٹہ اور آتشی قمیص جس پر فل جال نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ اریبہ کی اٹھتی ہوئی نگاہ ساکت رہ گئی۔

"اگر میرا بس چلے نا، تو تمہیں یہی کلر ہمیشہ کے لیے پہنا دوں۔" مری کے ہوٹل میں جب وہ پہلی بار اس کی خاطر تیار ہوئی تھی تب عباس حیدر کی پرشوق نگاہوں نے بہت تفصیلی جائزہ لینے کے بعد جھک کر اس کی سماعتوں میں یہ امرت رس ٹپکایا تھا۔ "ویسے ایک بات ہے رات تم میرے پیار کی بارشوں میں بھیگ کر بھی بالکل ایسی ہی لگ رہی تھیں۔" وہ کچھ

مزید اس کے نزدیک ہوا تھا اور لہجہ بالکل دھیما ہو کے سرگوشی میں ڈھل گیا تھا۔

"میرا خیال ہے وہ ایک بار پھر تمہیں دلہن کے روپ میں دیکھنا چاہ رہا ہوگا۔" بھابی کے لہجے میں شرارت تھی اریبہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی، اس کے چہرے پہ کرب ناک تاثر دیکھ کر بھابی خفیف سی ہو گئیں۔

"سوری! اریبہ میں۔" وہ کچھ بھی کہے بنا تیزی سے اٹھی تھی، جیسے ہی بلیک پینٹ کوٹ میں اندر آتے عباس کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ بازو پر کوٹ ڈالے وہ حسب عادت اسے نظر انداز کرتا آگے بڑھ کر صوفے پہ بیٹھ چکا تھا۔

"بہت زبردست چوائس ہے تمہاری عباس! اریبہ کے لیے سوٹ بہت اچھا سلیکٹ کیا تم نے۔" بھابی جتا کر بولیں، عباس کے سپاٹ چہرے پہ تناؤ کی لہر اٹھی تھی۔

"میری نہیں، سلمان کی چوائس ہے، اور میں اس کی کوئی خواہش ٹال نہیں سکتا۔" اس کے تلخ لہجے نے دروازے سے نکلتی اریبہ کی آنکھوں کو بہت تیزی سے بھگویا تھا۔

☆☆☆

"آئی لو یو پاپا!" وہ چیئر پر بیٹھا کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھا، جب سلمان نے آ کر اس کے گلے میں بازو حمائل کیے۔

"آئی لو یو ٹو مائی سن!" ہونٹوں کے درمیان سلگتے سگریٹ کو انگوٹھے اور انگشت شہادت کی مدد سے نکال کر ایش ٹرے میں ڈالنے کے بعد وہ اس کے گرد بازوؤں کا حصار کرتے ہوئے محبت سے بولا۔

"ایک بات پوچھوں پاپا؟"

"شیور وائے ناٹ سویٹ ہارٹ؟" عباس نے کتاب بند کر کے اس کی طرف توجہ کی۔

"پاپا آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟"

اس کا سوال عباس کے لبوں سے مسکراہٹ پل بھر میں غائب کر گیا۔

"پاپا آپ اب تو ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے نا۔"

اس کے ننھے سے دل میں جانے کیا خدشہ تھا، جھوٹ وہ بولنا نہیں چاہتا تھا عباس حیدر جو تب سے لب بھینچے خاموش تھا اسے ایک ہاتھ سے دور ہٹاتا جھٹکے سے اٹھ کر چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے روز لڑکی والوں کی طرف مہندی لے کر جانا تھا۔ اس نے سلمان کو تیار کیا، پھر خود تیار ہونے کے ارادے سے اندر آ گئی۔ آج کے دن کے لیے اس نے اپنی پسند سے بلیک سوٹ پہنا تھا، جس کی شرٹ کے دامن، اور گلے پہ سلور کا کام تھا ہلکے پھلکے میک اپ اور لائٹ سلور جیولری میں اس کا گلاب چہرا تمام تر رعنائی و دلکشی سمیت دیکھنے والی نگاہ پر سحر طاری کر رہا تھا۔

”کہاں ہیں سب، کہاں چلے گئے اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں“ فراز نظر آیا تو وہ برس پڑی۔

”او کم آن ڈیئر بھابھی! آپ کے لیے ڈرائیور حاضر ہے بس آپ کی تیاری کا منتظر ہے۔“ وہ سینے پہ ہاتھ رکھے جھکا۔

”تو کیا اب تم چھوڑنے جاؤ گے؟“ وہ جی بھر کے حیران ہوئی تھی۔

”بندہ خادم ہے پلیز آیئے۔“ وہ اسے ہمراہ لیے باہر چلا آیا پورٹیکو میں ایک ہی گاڑی تھی، پچھلی سیٹ پہ مٹھائیوں کے ٹوکرے تھے۔ وہ فراز سے سلمان کا پوچھ کر اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

”چلا گیا ہے آپ کیا سمجھتی ہیں، وہ آپ کے بغیر نہیں جا سکتا۔“ وہ چہک کر بولا۔

اسی پل پورٹیکو میں آتے عباس حیدر کو دیکھ کر وہ ساکت رہ گئی۔ وائٹ کلف دار شلوار سوٹ میں وہ اس قدر پرکشش نظر آ رہا تھا کہ وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہ گئی۔ ہوش تو تب آیا تھا جب عباس حیدر کی نگاہ اس پر اٹھی تھی وہ گڑبڑا کر نظریں چرا گئی۔ جبکہ اسے گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر براجمان دیکھ کر جو ناگواری و برہمی اس کے وجیہہ چہرے پر امڈی تھی وہ کسی طرح بھی اریبہ سے مخفی نہ رہ پائی۔ فراز کے مسکراتے چہرے پہ بھرپور شاکی نگاہ ڈالتی وہ بچے ہوئے انداز میں دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ کہ فراز قریب آ گیا۔

”یہ نہیں کھلے گا۔“ پھر اس کے غصے کی پرواہ کیے بغیر عباس کی سمت متوجہ ہو گیا، جو دوسری سائیڈ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ رہا تھا۔

”بھائی جلدی جایئے اماں کا فون آیا ہے کہ آپ ابھی تک پہنچے کیوں نہیں۔“

گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی تو فراز نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا اریبہ کی آنکھیں جلنے لگیں۔

فراز نے جس قسم کا مذاق اس کے ساتھ کیا تھا، جیسے اس کے احساسات کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

”صاحب جی بی بی کے لیے گجرے لے لیں۔“

گاڑی سگنل پر رکی تھی، پھول بیچنے والا دس بارہ سالہ لڑکا، کھڑکی کا شیشہ بجا کر باقاعدہ متوجہ کر رہا تھا۔ نا چاہتے ہوئے اریبہ کی نگاہ اٹھی تھی۔ سختی سے لب بھینچے پیشانی پہ لاتعداد شکنیں لیے وہ بے حد ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”صاحب جی لے لیں نا۔ چودہ روپے کا گجرا ہے کیا چودہ روپے آپ کو بی بی جی سے زیادہ عزیز ہیں۔“ وہ کچھ دیر ہی چرب زبان معلوم ہوتا تھا، یقیناً بہت بری طرح سے پیش آتا مگر اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی، جب عباس حیدر نے والٹ نکال کر پچاس کا نوٹ لڑکے کو تھمانے کے بعد گجرے لے لیے تھے۔ محض ایک پل کو دونوں کی نگاہیں چار ہوئی تھیں، اریبہ ششدر تھی۔ دل بہت انوکھے راگ الاپنے لگا تھا۔ عباس حیدر نے لب بھینچے ہوئے گجرے اس کی گود میں پھینکے تھے، اور گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ اریبہ کا تمتمایا ہوا چہرہ یکبارگی پھیکا پڑا تھا۔ ایک نگاہ گود میں کسی بھیک کی مانند پھینکے گئے گجروں اور دوسری اس کے چٹانی چہرے پر ڈالی تھی وہ بہت غیر محسوس انداز میں رخ پھیر گئی۔ ایک بار پھر اس کی آنکھیں جھلملائی تھیں۔ دلہن والوں کا گھر آ چکا تھا۔ اس نے یونہی رخ پھیرے پھیرے ہی نگاہ اٹھا کر برقی قمقموں سے سجے گھر کو دیکھا، اور ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر گال صاف کیے۔ گود میں رکھے گجرے اٹھا کر ڈیش بورڈ پر رکھنے کے بعد، دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

”اتنی تحقیر سے تو اگر تم مجھے کل کائنات بھی دیتے تو میں ٹھکرا دیتی۔“

بنا دیکھے کہ وہ اس کے ساتھ ہے یا نہیں، وہ تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

اگلا دن بارات کا تھا۔ اس دن کے لیے اریبہ نے خاص طور پر وائٹ نیٹ کا ڈریس بنوایا تھا، جس کی فل شرٹ پہ موتی سوتیوں کا انتہائی نفیس ڈیزائن اور منقش تھی، جو ہلکی سی جنبش پہ جھلملا کر اس کے چہرے کی تابناکی کو مزید بڑھا گئی، کانوں میں ننھی سلور جھمکیاں اور سفید ہی موتیے کے گجرے، اس کا یہ سادہ سا روپ تمام تر دلکشی سمیت پورے ماحول پہ

بجا رہا تھا۔ سہرا بندی کی رسم ہو رہی تھی، وہ بھی کندھے سے پھسلتا ہوا دوپٹہ سنبھالے اپنے دھیان میں آگے بڑھی تھی، جب اسی پل تیزی سے اسٹیج پر چڑھتے عباس حیدر سے ٹکراتے ٹکراتے بچی...... جدید تراش خراش کے پینٹ کوٹ میں میرون ٹائی لگائے وہ غضب کی مردانہ وجاہت سمیت روبرو تھا، اریبہ کتراتی ہوئی سی سائیڈ پہ ہو کر تیزی سے آگے بڑھ گئی، اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے دانستہ احتیاط کی تھی، کہ ان نگاہوں کی تلخی و نفرت کو از سر نو محسوس کر کے وہ اپنا اچھا بھلا موڈ غارت نہیں کرنا چاہتی تھی، رسم کرنے کے بعد وہ دانستہ ایک سائیڈ ہو کر الگ تھلگ کونے میں آ بیٹھی تھی۔ عباس حیدر کی آنکھوں کی نفرت زہر قاتل کی مانند اس کی رگ جاں میں اترتی جا رہی تھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا، کہ وہ واپس بھاگ جائے، عباس حیدر کا یہ توہین آمیز رویہ اس کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ ہونٹ کچلتے ہوئے وہ فراز کے ساتھ شہ بالا بنے بیٹھے سلمان کو دیکھنے لگی، بلیک پینٹ کوٹ اور سر پہ سرخ صافہ لپیٹے وہ چھوٹا سا دولہا بنا اتنا کیوٹ لگ رہا تھا، کہ بے اختیار ہی اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ٹھہر گئی، نگاہوں کی تپش پہ بے اختیار اس نے دائیں جانب دیکھا، تو دل جیسے دھک سے رہ گیا۔ ہر قسم کے ہنگاموں سے بے نیاز وہ ایک سائیڈ پہ کھڑا عجب بے خودی کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا یوں ماحول سے بیگانہ ہو کر یک ٹک، اسے اپنی سمت متوجہ پا کر بھی اریبہ حیران ہوئی تھی، بلاشبہ اس کا یہ روپ ہوش اڑا دینے والا تھا، مگر اس کے یوں دیکھنے پر اسے اپنی ہتھیلیوں پہ پسینہ اترتا محسوس ہوا، دل اتنی شدتوں سے دھڑک رہا تھا، کہ اسے لگا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ ہونٹ کچلتے ہوئے اس نے ایک بار پھر ادھر نگاہ کی، جہاں وہ موجود تھا مگر اب وہاں اس کا نام و نشان نہیں تھا اس کے لبوں پہ عجیب سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

☆☆☆

سلمان اسی سے کھانا کھانے کی ضد کر رہا تھا گو کہ اس کی اپنی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ سر بھاری بھاری محسوس ہو رہا تھا مگر اس کے باوجود سلمان کو لیے کچن میں چلی آئی تھی۔

"سالن کے ساتھ پھلکا بنا دوں۔؟"

سلمان کو کرسی پہ بٹھا کر وہ خود کوکنگ رینج کی سمت آ گئی تھی۔

"بوائل انڈے اور ساتھ ہی چپس دیں۔ مجھے روٹی نہیں کھانا۔"

سلمان نے منہ بسور کر کہا، فریج سے انڈے نکال کر ابلنے کے لیے رکھنے کے بعد، وہ آلو چھیلنے لگی۔

"آ، پاپا آپ بھی میرے ساتھ چپس اور بوائل انڈہ انجوائے کریں۔"

عباس حیدر کو اندر آتے دیکھ کر سلمان نے چہک کر کہا تھا، جبکہ اریبہ اپنی جگہ سن سی رہ گئی۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ پلٹ کر ایک نگاہ اسے دیکھ ہی لیتی۔

"نو تھینکس بیٹے! ہم بس چائے لیں گے۔"

اس نے نرمی سے کہا، ساس پین میں پانی ڈال کر برنر کھول کر آگ جلانے لگا، اس کے اتنے قریب آ جانے پر اس پہ گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔

"پاپا میں بھی چائے پیوں گا۔"

سلمان کی جانب سے پھر فرمائشی پروگرام نشر ہوا، وہ محض مسکرا دیا تھا، اریبہ نے کانپتے ہاتھوں سے فرائی پین میں کوکنگ آئل ڈال کر چولہے پہ رکھا تھا۔

"دیکھیں پاپا، مما اس وائٹ ڈریس میں بالکل پرنسس لگ رہی ہیں نا۔" سلمان کو جانے کیا سوجھی تھی، کہ باپ کی رائے لینے کھڑا ہو گیا تھا، اریبہ کے جسم کا سارا خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا، تب تلخی سے لب کچل کر وہ یکدم پلٹی تھی۔

عباس اسی پل کیبنٹ سے مگ لینے کو بڑھا تھا تصادم یقینی تھا۔ جو ہو کر رہا اریبہ کو اپنے چودہ طبق روشن ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

"حواسوں میں رہو، ایک نا سمجھ بچے کی بات پہ ٹین ایج لڑکی کی مانند شرماتیں تم کس قدر آکورڈ لگ رہی ہو، اس کا شاید تمہیں اندازہ نہیں۔"

بازو سے پکڑ کر متنفر سے انداز میں دور جھٹکتے ہوئے، وہ اس قدر درشتی سے بولا تھا، کہ اریبہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ جبکہ وہ کھولتے ہوئے پانی کو یونہی چھوڑے لمبے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا تھا، وہ منہ پہ ہاتھ رکھے اپنی سسکی گھونٹتی چلی گئی۔

"آج کے...... بعد ہمیشہ کے لیے نوٹ کر لو، تم آئندہ کبھی سفید رنگ نہیں پہنو گی۔" اور وہ بلک ہی تو گئی تھی۔

"کیا کہا، وائٹ کلر از مائی موسٹ فیورٹ کلر۔"

وہ تکلیف بھول کر چیخی تھی۔

”یہ کلر اتنا سوٹ کرتا ہے تم پہ کہ میری نظر ہٹ نہیں پا رہی تھی، نتیجہ تمہارے سامنے ہے، لگ گئی نا چوٹ۔“

”چوٹ نہیں نظر کہو۔“ وہ سوچ ہوئے پاؤں کو ہلکے ہلکے دباتی بولی عباس کے لبوں پہ دل آویز مسکراہٹ بکھری تھی۔

”سمجھا کرو جانم! ریڈ کلر میں تم اس قدر جاذب نظر لگ رہی ہو، کہ میں سب کچھ بھول کر تمہیں دیکھے جا رہا تھا، یہاں تک کہ مجھے اماں اور بابا کا خیال بھی نہیں رہا، تمہیں میری نظر لگ گئی تو دوسروں کی بھی نظر لگ سکتی ہے۔“ وہ اس قدر مضحکہ خیز شکل بنا کر بولا کہ اریبہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئی تھی۔

مگر اب وہی اریبہ روتے ہوئے بے حال ہو رہی تھی وہ دیکھنا چاہتی تھی عباس حیدر کی نفرتوں کی حد کہاں تک تھی، کیا وہ اپنی ہی کہی بات بھلا چکا تھا۔ وہ بھولا نہیں تھا۔ جب ہی تو چھ سال بعد اگر کلام کیا بھی تھا تو اس طرح کہ اس کے وجود کے پرخچے اڑ رہے تھے۔

”مما! آپ کیوں رو رہی ہیں۔“ سلمان کا ننھا سا ہاتھ اس کے شانوں پہ آ کے ٹھہرا، جب اس نے آنسوؤں سے تر چہرا اونچا کیا تھا، اس کا نازک سراپا ہچکیوں کی زد میں تھا“ بابا گندے ہیں انہوں نے آپ کو رلایا ہے نا مما، میں ان سے بات نہیں کروں گا۔ پلیز آپ چپ ہو جائیں۔“ وہ اب اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ رہا تھا۔

آنسو صاف کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

سلمان نے کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا تھا اگر کوئی اور موقع ہوتا تو اریبہ اصرار کرتی مگر اب وہ خود بھی تنہائی چاہ رہی تھی۔

☆☆☆

چونکہ ولیمہ کی تقریب رات کو تھی جب ہی ہر کسی نے اطمینان بھرے انداز میں بستر چھوڑا تھا... بارہ بجے تک ناشتا ہوتا رہا، اس کے بعد وہ سب لاؤنج میں اکٹھے ہو بیٹھے تھے، فراز بھی سعید کے ساتھ وہاں سب کے بیچ آ بیٹھا تھا۔ اریبہ کی کمی کو اس نے ایک ہی نگاہ کے جائزے میں محسوس کر لیا تھا۔

”سلمان، مما کہاں ہیں آپ کی۔“

”ان کی طبیعت اچھی نہیں ہے چاچو! وہ سو رہی ہیں۔“

”لگتا ہے بھابی کو نظر وزر لگ گئی ہے، کل لگ بھی تو بہت پیاری رہی تھیں۔“ وہ کن انکھیوں سے عباس حیدر کو تکتا ہوا بظاہر سعید سے کہہ رہا تھا۔

”سلمان! کم ہیر مائی سن۔“ عباس نے نشست سنبھالنے کے بعد سلمان حیدر کو پکارا تھا، جو ایک نگاہ اس پہ ڈالنے کے بعد پھر سے اپنے کام میں منہمک ہو چکا تھا۔

”سلمان کم آن بیٹے بابا بلا رہے ہیں آپ کو۔“ عباس کے لیے اس کی یہ لاتعلقی اور بے نیازی حیرت کا باعث تھی۔

”میں آپ سے بات نہیں کر رہا بابا! آپ نے میری مما کو رلایا ہے۔“ اس نے جو کہا تھا، اس سے عباس حیدر جیسے مکمل طور پہ پر اعتماد اور بے نیاز بندے کے بھی لمحہ بھر کو کس بل ڈھیلے کر دیے تو حاضرین محفل کے چہروں پر اب دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ فراز نے دور ہی سے مخفی اشارے سے پرجوش انداز میں سلمان کی پیٹھ ٹھونکی تھی۔

”بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے“ وہ ہونٹوں میں ہونٹوں میں گنگنایا تھا، عباس حیدر خفیف سے انداز میں اٹھا تھا، اور سلمان کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی و نرمی سمیت اسے بازوؤں میں بھر لیا ”آپ سے کس نے کہا کہ آپ کی مما کو بابا نے رلایا ہے۔“ باہر نکلتے ہوئے اس کی بے صد مدھم آواز ان تک پہنچی تھی۔

☆☆☆

گو کہ اس کا ارادہ نہیں تھا ولیمہ اٹینڈ کرنے کا مگر بھابی، تائی اماں اور فراز نے کچھ اس طرح سے اصرار کیا، کہ وہ ایک بار پھر نا چاہتے ہوئے بھی مان گئی تھی اور جس پل وہ بے دلی سے تیار ہو کر اور بج سار کی میں باہر آئی، تو فراز صرف اس کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ اس نے تقریب میں شرکت کی شرط ہی یہی رکھی تھی ”میں صرف تمہارے ساتھ جاؤں گی مائنڈ اٹ فراز اگر اب کے تم نے کسی قسم کی کوئی بدتمیزی کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا یاد رکھنا، میں چپ ہوں تو اسے میری شرافت سمجھو۔“ مگر وہ یہ سب کچھ فراز کو جتاتے ہوئے یہ نہیں جانتی تھی کہ عباس حیدر بھی یہیں موجود ہے وہ تو جب اپنی بات کے اختتام پہ پلٹی تو دروازے میں اس کے لمبے چوڑے وجود کو ایستادہ پا کے محض ایک پل کو ساکت ہوئی تھی۔ دونوں کی نگاہیں محض ایک پل کو چار ہوئی تھیں، اور نگاہوں کا یہ تصادم بہت معنی خیز تھا۔ عباس حیدر کے سپاٹ چہرے پہ اب کوئی تاثر نہیں تھا، جبکہ اریبہ ایک پل کو کسی دھک سے رہ گئی۔

دروازے سے قدم بڑھاتا وہ اوپر جاتی سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

ولیمہ کے مہمان رخصت ہو چکے تھے، خود فراز بھی سعید کے ساتھ اس کے میکے جا چکا تھا، جو بچے کچھے مہمان تھے، وہ بھی تھکے ہونے کے باعث آرام کی غرض سے لیٹ گئے تھے۔ اریبہ کو اپنی طبیعت اچھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ تب ہی وہ معمول سے بھی کچھ جلدی کمرے میں آ گئی تھی۔ کتنی دیر تک بستر میں کروٹیں بدلنے کے بعد بھی جب اسے نیند نہیں آئی تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جانے کیوں دل معمول سے زیادہ کہیں بڑھ کر ویران محسوس ہو رہا تھا۔ فوٹو سیشن کے دوران جب اریبہ، فراز اور سعید کو سلامی دینے اسٹیج پر گئی تھی، تو فراز نے زبردستی ہاتھ پکڑ کر سعید کے برابر بیٹھا دیا تھا۔ سعید سے باتوں میں مگن ہو کر وہ فراز کو اسٹیج سے اترتے نہیں دیکھ سکی تھی۔ وہ کچھ فاصلے پہ موجود عباس کو تصویریں بنوانے پہ راضی کر رہا تھا مگر اس کی ایک ناں میں نہیں بدلی تھی۔ فراز منہ لٹکائے واپس لوٹا تو اریبہ کے اندر ایک بار پھر بہت کچھ بہت آہستگی سے ٹوٹتا چلا گیا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ عباس محض اس کی وجہ سے فراز کی بات نہیں مان رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ اس کی ذات کی نفی کر کے اس کی توہین کر چکا تھا۔

عباس حیدر کی نفرت کی یہ آگ اسے جلا کر خاکستر کرتی جا رہی تھی۔ اسے ایک بار پھر یہاں آنے پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ مضطرب سی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ ناکافی روشنی میں درختوں کے پاس طویل سایہ دیکھ کر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی تیز لہر دوڑی تھی۔ آنکھیں سکیڑ کر بغور دیکھنے پہ اس کا خوف تحیر میں جا چھپا۔ لائٹ آسمانی شلوار سوٹ پر میرون مردانہ شال کاندھوں پر پھیلائے، اس ٹھٹھرتی سردی میں عباس حیدر لان میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ دبا تھا۔ شانوں پہ پھیلی شال کے سرے ہوا سے سرسراتی گھاس کو چھو رہے تھے اور وہ ہر احساس سے عاری ٹہل رہا تھا۔

''کیوں بے چین ہو عباس حیدر۔ حالانکہ ساری وحشتیں، اضطراب اور بے بسی تو تم نے مجھے سونپ دی تھی۔'' اس کے لب کپکپائے تھے اور آنکھیں بے تحاشا برس پڑیں۔ ماضی پوری جزئیات سمیت اس کے سامنے تھا جس سے وہ اتنے دنوں سے دامن بچاتی رہی تھی۔

☆☆☆

عباس حیدر کے ساتھ اس نے جس تین منزلہ شاندار عمارت میں قدم رکھا تھا، اس کے متعلق مما نے بالخصوص اسے جتایا تھا۔

''یہ گھر ہمارا ہے، جس پر اس کے تایا ابا اور ان کی بیوی بچے تسلط جما کر بیٹھ گئے ہیں۔ تم اور کچھ کرو یا نہیں، البتہ اس گھر کے دستاویز ضرور حاصل کر لینا۔''

اس نے تب یہ بات اتنے دھیان سے نہیں سنی تھی کہ ان باتوں میں اس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایگزیمز کے بعد طویل فراغت تھی، اور وہ اس مرتبہ مما کے ساتھ کسی فارن کنٹری جانے کی بجائے پاکستان آنے پہ بضد ہوئی تھی۔ پاپا تو سنتے ہی خوش ہو گئے تھے مگر ان کے برعکس مما کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''وہاں کیا ہے جو تم وہاں جانا چاہ رہی ہو؟'' ان کا تحقیرانہ سا انداز اسے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا تو اس کی وجہ پاپا کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ تھے۔

جب ہی مما کے تضحیک آمیز لہجے میں کہی گئی بات کے جواب میں کچھ تلخی سے بولی تھی۔

''وہاں کیا نہیں ہے مما! ہمارے اپنے وہاں ہیں پھر وہ ہمارا ملک ہے، وہ ملک جس نے ہمیں پہچان دی۔''

پاپا کے چہرے پر رونق آئی دیکھ کر وہ مزید پرجوش ہو گئی تھی۔

''اونہہ۔ میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتی، مگر جانے سے پہلے سوچ لو وہاں کے لوگ کسی کنویں کے مینڈک سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جن کا کوئی لائف اسٹائل ہی نہیں، کھایا پیا اور سو گئے۔ دیٹس آل۔'' اریبہ کو ان کے لہجے میں نفرت بھی محسوس ہوئی تھی اور تمسخر بھی۔

''جو کچھ بھی ہے مما! یہ تو طے ہے مجھے وہاں جانا ہے۔'' اسے ضد سی ہو گئی تھی۔ مما نے اسے ہر ممکن روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ جواب میں کچھ کہے بنا محض مسکراتی رہی، تو انہوں نے زچ ہو کر کہا تھا۔

''چلی جاؤ، مگر ایک بات یاد رکھنا، صرف ایک ہفتے کے لیے، اس کے بعد واپس آ جانا۔''

پاپا نے اس کا ٹکٹ کنفرم کرنے کے ساتھ ہی تایا ابا کو فون کر کے اس کی فلائٹ کا وقت اور نام بتا دیا تھا۔

راستے بھر وہ پاکستان اور اپنے عزیز رشتہ داروں کے متعلق سوچتی آئی تھی۔ عباس

حیدر اپنی بے تکلف اور پُر اعتماد شخصیت سمیت اسے دلچسپ محسوس ہوا تھا۔ ایئر پورٹ سے گھر تک کے راستے میں وہ اسے اپنے اور اپنی فیملی کے متعلق مکمل تعارف دے چکا تھا۔ وہ نیوی میں کیپٹن تھا اور آج کل چھٹیوں پر گھر آیا ہوا تھا۔ اس سے بڑے عاصم بھائی تھے جن کی شادی ہو چکی تھی۔ علینہ ان کی بس کچھ بے تکلف اور پیاری سی بیوی تھیں۔ وہ بڑی اماں کے ظلم و ستم کی ستائی ہوئی بے چاری سی خاتون تھیں۔ یہ بات اریبہ نے چند دنوں میں ہی نوٹ کر لی تھی۔ سب سے چھوٹا فراز تھا، جو ان دنوں ہاؤس جاب کر رہا تھا۔

تایا ابا خاموش طبع اور گم صم سے رہنے والے بے ضرری شخصیت کے مالک تھے۔ پورے گھر پر جو ہستی قابض کی جا سکتی تھی۔ وہ تائی اماں کی تھی۔ درشت، کرخت لہجہ، بے مہر آنکھیں اور سپاٹ چہرہ۔ ان کی شخصیت پہلی نظر میں ہی اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ انہوں نے پہلی نگاہ میں ہی اریبہ کا جس طرح پوسٹ مارٹم کیا تھا، اس کے اندر سنسنی دوڑ گئی تھی۔ آر پار ہوتی بے حد عجیب نگاہیں، عباس حیدر کے اشارے پر بھی اس نے ان سے گلے ملنے کی غلطی نہیں کی کہ ان کے تاثرات ہی ایسے تھے کہ جو اس کے حوصلوں کو پست کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس کے جھکنے پہ انہوں نے سرد سے انداز میں اپنا ہاتھ اس کے سر پہ رکھ دیا تھا۔

"تمہارے اماں بابا کیسے ہیں؟"

"جی!" اس عجیب و غریب تخاطب پر وہ کچھ حیران سی ہوئی تھی۔

"چاچو اور چچی کی خیریت دریافت کر رہی ہیں۔"

عباس جھک کر سرگوشی میں بولا۔ تائی اماں نے اپنے شاندار بیٹے کو تیکھی نظر سے دیکھا تھا مگر کہا کچھ نہیں۔

"ہوں۔ بیٹھو۔ ابھی تمہاری دادو نماز پڑھ رہی ہیں پھر مل لینا۔"

"جج..... جی..... باقی گھر والے کہاں ہیں؟" ان کے پاس بیٹھنے کے خیال نے ہی اسے بدمزا کر دیا تھا، جب ہی کچھ بے چینی سے اطراف میں نگاہ دوڑا کر پوچھ بیٹھی تھی۔

"اور کس سے ملنا ہے تمہیں؟" اس کا لہجہ بے حد عجیب تھا۔ اریبہ کوئی جواب نہ دے پائی تھی کہ انہوں نے لٹھ مار انداز میں ہنس کر اسے دیکھا تھا۔

"کہیں تم عباس کا تو نہیں پوچھ رہی ہو۔ بہت بانکا چھیلا ہے میرا چڑا جہاں بھی

جاتا ہے لڑکیاں شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے گرد چپٹ جاتی ہیں۔"

ان کا گھمنڈی لہجہ عجیب سی نخوت لیے تھا۔

"جی۔" اریبہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"اریبہ پتر! میری دھی، میری جند جان! یہاں آ۔ دادی کے سینے میں ٹھنڈ ڈال پتر!" بوڑھی کپکپاتی آواز پہ وہ بے ساختہ پلٹی تھی۔ کمزور نحیف جھریوں بھرا چہرا۔ آنکھوں میں شوق کا جہان آباد کیے بازو پھیلائے منتظر تھا۔ وہ بھاگ کر ان کے کھلے بازوؤں میں سما گئی تھی، تو اس کی وجہ دادو کی پھوٹتی محبت تھیں، تائی اماں کا وہ نامہم سلوک تھا۔

☆☆☆

اریبہ علی شیر ابوظہبی کے مشہور انڈسٹریلسٹ کی بے حد چہیتی بیٹی تھی۔ سرخ و سفید اجلی رنگت، سانچے میں ڈھلا موی سراپا، ملکوتی نقوش، اور سیاہ گھنیرے ریشمی بال، اسے مکمل حسن کا روپ دیتے تھے۔

علی شیر کے فون نے کہ "اریبہ پاکستان آ رہی ہے" ان کی راتوں کی نیند کو غارت کر ڈالا تھا۔ یہ عالی شان گھر علی شیر کے نام تھا، جو انہوں نے بہت شوق سے اپنے لیے بنوایا تھا، مگر ان کا شوق پورا نہ ہو سکا، کہ ان کی بیگم کو پاکستان میں رہنا پسند نہیں تھا۔ اریبہ محض چھ ماہ کی تھی، جب وہ شوہر کو کسی نہ کسی طرح قائل کر کے ابوظہبی سیٹلڈ ہو گئی تھیں۔ جہاں ان کے بھائی ہی نہیں، پورا میکہ آباد تھا۔ علی شیر کا شمار..... خوشحال لوگوں میں ہونے لگا تھا۔ علی شیر اپنے بڑے بھائی کی مالی حالت کو سمجھتے تھے اور بیوی سے چوری چھپے اکثر ان کی بھاری رقوم سے مدد کرتے رہتے، جسے..... تائی اماں ہمیشہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتیں جبکہ..... تایا ابا کچھ خجل کچھ نادم سے نظر آتے۔ ان دنوں بچے پڑھ رہے تھے اخراجات بمشکل پورے پڑتے تھے۔ جب شائستہ (اریبہ کی ماں) نے ابوظہبی جانے کا شور مچایا، تو مجبوراً علی شیر کو اپنا وطن ہی نہیں، اپنے عزیز رشتے دار بھی چھوڑنے پڑے، کہ شائستہ بیگم تند مزاج کی من مانی کرنے والی عورت تھیں، مگر ان کا ایک امیر ترین لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ جائیداد میں انہیں جو حصہ ملا تھا، وہ اتنا زیادہ تھا، کہ وہ ابوظہبی میں اپنا بزنس آسانی سے شروع کر سکتے تھے۔ انہیں جس چیز نے مفاہمت پر آمادہ کیا تھا، وہ ان کی جائیداد یا بینک بیلنس نہیں بلکہ ان کے دو معصوم بچے تھے۔ چار سالہ علی، اور چھ ماہ کی اریبہ، جس نے انہیں خود سے بڑھ کر محبت تھی۔ اپنے

بچوں کی خاطر ہی انہیں یہ قدم اٹھانا پڑا تھا، مگر جاتے ہوئے انہوں نے یہ کام ضرور کیا کہ اپنے گھر کو بڑے بھائی کی تحویل میں دے دیا۔

"بچے بڑے ہو رہے ہیں بھائی! پھر یہ پوش ایریا ہے۔ یہاں سے اسکول کالج وغیرہ کا بھی مسئلہ نہیں ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ اس طرح میں گھر کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں گا۔" ان کے بات کرنے کا انداز ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ خود احسان کر کے بھی وہ یوں ظاہر کرتے جیسے سامنے والے نے ان کی بات مان کر ان پر احسان کیا ہے۔ یوں تایا ابا کی فیملی مکمل مالکانہ حقوق کے ساتھ اس گھر میں آن بسی تھی مگر اب اٹھارہ سال بعد تائی اماں کو یہ حاکمیت خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ اگر اریبہ اپنے تایا یا پھر عاصم، عباس میں سے کسی ایک سے گھر کے کاغذات کا مطالبہ کر دیتی تو کیا ہوتا پھر عباس تو تھا ہی سر پھرا۔ اس قسم کے معاملات میں وہ ماں کے رعب میں بھی نہیں آتا تھا۔ اس کا صرف ایک ہی حل تھا اور وہ کہ اس خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جاتا اور جو ان کا منصوبہ تھا اسے بڑے ابا نے سنا تو بری طرح سے بدک گئے۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ مجھے پہلے شک تھا مگر اب لگ رہا ہے کہ تم واقعی سٹھیا گئی ہو۔" انہوں نے غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔

"تم چپکے بیٹھے رہو۔ نہ تو میرا دماغ سٹھیایا ہے نہ خراب ہوا ہے۔ بس دیکھتے جاؤ، میں کیا کرتی ہوں۔"

انہوں نے مسکرا کر چکنی بجائی۔ ان کی آنکھوں کی حریصانہ چمک بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

"دادو! میں آپ کو ایک نظم سناؤں۔" اریبہ دادو کی گود میں سر رکھے آنکھیں موند پڑی تھی، جب عباس حیدر کی بھاری آواز اس کے دائیں جانب سے ابھری۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی دادو نے اس کے سر میں تیل کی مالش کی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس پہ غنودگی سی طاری ہو گئی تھی۔

"ارے۔" دادو بے ساختہ ہنسیں۔ "بچے تجھے کیا سوجھ بوجھ شاعری کی۔"

عباس ہنس پڑا۔

"آپ نظم تو سنیں۔" اس نے دادو کی گود سے سر اٹھا کر سیدھی ہوتی اریبہ کو ترچھی

نگاہوں سے دیکھا۔

مالک..... میرے دل کی خوشیاں تو نے
کن لوگوں سے جوڑی ہیں کہ
جن سے ملنے کے راستے میں آگ کا دریا پڑتا ہے

نظم سنا کر وہ چپ ہو گیا تھا۔

اریبہ نے بال سمیٹتے ہوئے سرسری نگاہ سے اس کا جائزہ لیا۔ شکن آلود لباس پیشانی پہ بکھرے بالوں کے ساتھ وہ اس حلیے میں بھی بہت منفرد اور خاص محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی مقناطیسی شخصیت میں کچھ تو ایسا خاص تھا کہ وہ ہر بار دیکھنے پہ تیا لگتا۔

"کیا بات ہے بیٹے کچھ پریشان ہو؟" دادو نے ہاتھ بڑھا کر اس کا گال سہلایا تھا۔

"کچھ نہیں! آپ نے نظم پہ غور نہیں کیا۔" ان کے شانے سے سر ٹکاتے ہوئے وہ دانستہ اریبہ کو دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

"تم کہاں جا رہی ہو پتر! یہاں میرے پاس بیٹھو نا۔"

اریبہ کو اٹھ کر باہر جاتے دیکھ کر دادو نے ٹوکا۔

"سوری دادو، مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔ ابھی تو آپ عباس کی کمپنی میں جی بھر کے بور ہو لیں، تب تک میں فریش ہو جاؤں گی۔" مسکرا کر کہتی وہ پلٹ کر چلی گئی۔ اب دادو عباس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔ جو تاثرات انہیں عباس کے چہرے پہ نظر آئے تھے وہ ساری کہانی سنا رہے تھے، مگر وہ جیسے کچھ کر بھی انجان رہنا چاہتی تھیں۔

"کچھ کہہ رہے تھے تم......؟" انہوں نے سائیڈ پہ پڑی تسبیح اٹھا کر تجاہل برتا۔

"ہوں۔ کہہ تو رہا تھا، دادو آپ کو نہیں لگا، اریبہ دانستہ یہاں سے اٹھ کر گئی ہے۔ جیسے وہ میری بات نہیں سننا چاہ رہی تھی۔" وہ الجھ کر بولا۔

"نہیں پتر! لازمی نہیں ایسا ہو۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔

"اچھا" وہ عجیب سے انداز میں ہنسا "دادو آپ کے لاڈلے پوتے کی یہ حسین و نازک سی پوتی، آپ کے سب سے شاندار پوتے کو پسند آ گئی ہے، کچھ کریں دادو پلیز۔" ان کی گود میں منہ چھپاتے ہوئے وہ اپنا آپ ان پہ عیاں کر گیا تھا اور دادو بالکل گم صم سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔

"آپ خاموش کیوں ہیں دادو" خاصی دیر تک ان کی طرف سے جواب کا منتظر

رہنے کے بعد وہ سر اٹھا کر اچنبھے سے بولا تھا۔

"یہ خیال اپنے دل سے نکال لے پتر! تیری ماں ایسا کبھی نہیں چاہے گی اور شائستہ بھی، اسے میں جانتی ہوں وہ خود تو اس گھر، اس ملک میں رہنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ اکلوتی بیٹی کو کیسے یہاں بیاہ دے گی۔"

ان کے لہجے میں اداسی تھی، عباس حیدر کا چہرہ یک لخت تاریک ہوا تھا۔ "وہ چند دن کے لیے یہاں چاچی نہیں اسے کیسے دل سے بھیجنے پہ آمادہ ہوئی، پھر اریبہ، اس کا بھی میں نے ایسا کوئی رجحان نہیں دیکھا، اس کے علاوہ تو کسی بھی لڑکی کے لیے کہہ دے۔"

"نہیں دادو صرف اریبہ، اس کے علاوہ اور کوئی نہیں، اور یہ بات بھی سن لیں اب اسے حاصل کرنا ہی عباس حیدر کی زندگی کا مقصد ہے۔" وہ جیسے مضبوط لہجے میں بولتے ہوئے دادو کو سخت سراسیمہ کر گیا۔

"کیا مطلب کیا کرے گا تو؟" عباس نے ان کے چہرے کو دیکھا اور یکدم ہنس پڑا۔

"گھبرائیں نہیں دادو، بھگا کر نہیں لے جاؤں گا۔ آپ کی پوتی کو باقاعدہ رخصت کراؤں گا، سب کی رضامندی سے بس دعا کریں آپ۔" ان کے گلے میں بازو حائل کرتا ہوا وہ اس قدر رنجیدگی سے بولا تھا کہ دادو کو اپنے خدشات بھلا کر مسکرانا پڑا۔

دادو کے بعد اس نے عاصم بھائی کو سب کچھ بتا کر مدد چاہی تھی، جواباً انہوں نے کچھ دیر اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے کے بعد اس بات کو ہمیشہ کے لیے بھول جانے کی نصیحت کی تھی۔ وہ سخت بے چین و مضطرب سا ہو کر واپس کمرے میں آیا تھا۔ اور اب انتہائی رنجیدگی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ جب دروازہ کھول کر چار سالہ ذیشان اندر آیا تھا۔

"چاچو آپ کو دادو اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں۔"

"اچھا تم جاؤ میں آتا ہوں" یونہی اوندھے لیٹے اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

"عباس ایسا کون سا اہم کام ہے کہ تمہارے پاس میری بات سننے کو دو گھڑی بھی فرصت نہیں۔" تائی اماں کی گونج دار آواز پہ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہوا تھا۔

"اماں! آ... آپ پلیز بیٹھیں" ان کے کوتوالی مزاج سے اچانک خائف رہتے تھے وہ کیا چیز تھا۔

"وہ تو میں بیٹھ ہی جاؤں گی تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں، بس تم میری بات

ذرا سنو۔"

"جی جی" وہ مؤدب ہو گیا۔

"ایسا کرو بیٹے کہ تم نہا دھو کر شام تک تیار رہنا، اگر اپنے کسی دوست کو بلانا چاہو۔ تو بلا لو آخر خوشی کا موقع ہے، شام چار بجے تمہارا نکاح ہو گا۔"

"جی..... جی....." حیرت کی زیادتی سے اس کی زبان گنگ رہ گئی۔

"اریبہ تمہیں پسند ہے۔ میں جانتی ہوں بیٹا! ماں تو اپنی اولاد کی آنکھوں سے اس کی خوشی کھوج لیتی ہے۔"

وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی تھیں، عباس حیدر کو یکا یک اپنی تمام حیات مقطوع ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ اس کی زندگی کوئی کہانی یا ڈرامہ فلم نہیں تھی کہ چند لمحوں کے بعد ختم ہو جاتی یہ عمر بھر کا معاملہ تھا اس میں یہ عجلت، یہ افراتفری، اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ ان سب سوچوں سے عاری جو احساس تھا وہ بے تحاشا خوشی کا تھا۔ جس نے پل بھر میں ہی اس کے اندر پھلجھڑیاں بکھیر دی تھیں۔

"مگر اماں یہ سب کچھ اتنا اچانک، پھر چاچو چچی۔ کیا وہ لوگ مان گئے۔"

"یہی سمجھ لو، ان لوگوں کی تو خواہش ہی یہی تھی بیٹا، کہ اریبہ کی شادی پاکستان میں اپنوں میں ہو۔ کل ہی تمہارے چاچو کا فون آیا تھا۔ انہوں نے خود کہا ہے، میں نے سوچا نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

تائی اماں نے پہلے سے سوچی گئی اسکیم کے تحت اس کے ذہن پر گرفت کی تھی۔

"اور اریبہ وہ مان گئی" اس کے تصور میں اریبہ کے ملول انداز در آئے تھے۔

"لو بتاؤ یہ بھی کوئی نہ ماننے والی بات تھی۔ میرے پتر میں کیا کمی ہے۔" انہوں نے مسکرا کر اس کا شانہ تھپکا، تو عباس کے لبوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی تھی، وہ قدرت کی اس فیاضی پر ابھی تک ششدر تھا۔ "اچھا تم ایسا کرو جا کے اپنے لیے کوئی اچھا سا سوٹ خرید لو۔ وقت بہت کم ہے۔"

وہ اسے جلد از جلد وہاں سے بھگا دینا چاہتی تھیں، کہیں خوشی کے عالم میں وہ اریبہ کے پاس جا کے بھانڈا پھوڑ دے جو ہنوز اس ساری کھچڑی سے بے خبر تھی۔

☆☆☆

کراچی آئے اسے تیسرا دن تھا اور مما کے کم و بیش دس فون وہ اب تک ریسیو کر چکی تھی جس میں ایک ہی تقاضا تھا۔

''جلدی واپس آؤ تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے اور ہاں آتے ہوئے ان نو دولتیوں سے اپنے گھر کے کاغذات بھی لے آنا، ورنہ تمہارے باپ کی حماقت پر تو میں صرف تاؤ ہی کھا سکتی ہوں۔''

''مگر مما، میں کیسے کہوں ان لوگوں سے، پھر یہ بات مناسب بھی تو نہیں لگتی، جب وہ لوگ اس گھر میں رہ رہے ہیں تو ڈاکومنٹس بھی یہاں پڑے رہیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔''

''ہونا اپنے باپ کی طرح بے عقل، ارے بے وقوف لڑکی! وہ لوگ ہمارے لاکھوں کی مالیت کے گھر پر قابض بھی ہو سکتے ہیں۔''

''انہوں نے سات سمندر پار سے بھی اسے پھنکارنے سے گریز نہیں کیا۔ تو ٹھیک ہے۔ پھر آپ خود تقاضا کر لیں ان سے، میرا کیا ہے میں لے آؤں گی۔'' ترخ کر کہتی وہ فون پٹخ چکی تھی اور اس بات سے لاعلم کہ تائی اماں ایکسٹینشن کے ذریعے اس کی ساری بات سن چکی ہیں۔

اس گھر میں صرف دادو وہ واحد ہستی تھیں، جنہیں مل کر اسے دلی خوشی ہوئی تھی۔ اسے یہاں آنے کا اپنا فیصلہ سراسر احمقانہ محسوس ہو رہا تھا۔ پچھلے تین دنوں سے وہ گھر میں قید تھی۔ تایا ابا نے عباس حیدر کے ساتھ گھومنے کی اجازت دی تھی، مگر تائی اماں کی تیر برساتی نگاہوں سے وہ کچھ اس طرح جز بز ہوتی تھی، کہ عباس حیدر کے ساتھ جانے کا سن کر ہی ارادہ بدل دیا۔ اب اس نے رات ہی اسلام آباد جانے کے خیال سے بیگ تیار کیا تھا۔ اس نے تائی اماں سے خائف رہنے پہ خود کو ملامت کی تھی۔

''بھلا وہ کون ہوتی ہیں اس پہ رعب جمانے والی۔''

وہ اپنی مرضی کی مالک تھی، اور یہاں محض سیر و تفریح کے لیے آئی تھی، اس نے رات ہی سوچ لیا تھا، کہ وہ کل جانے سے قبل تائی اماں کو محض اطلاع دے گی، یہاں تک کہ اس نے دادو پہ بھی اپنا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ ان تین دنوں میں ہی وہ بہت اچھی طرح سے جان گئی تھی کہ اس گھر میں ہر کام تائی اماں کے حکم سے ہوتا ہے اور صرف اس گھر میں ہی نہیں یہاں پورے ملک میں ہی لڑکیوں کا تن تنہا باہر نکل کھڑے ہونا بالکل پسند نہیں کیا جاتا

تھا مگر اسے نہ تو تائی اماں کی پروا تھی نہ کسی اور کی۔ ان سوچوں اور ارادوں نے اسے از حد مطمئن کیا تھا یہی وجہ تھی کہ یہاں آنے کے بعد وہ پہلی رات پر سکون نیند سوئی تھی۔

مگر اگلا دن اس کے لیے قیامت خیز ثابت ہوا تھا۔ سب سے پہلے جو بات اس کے مزاج کو برہم کرنے کا باعث بنی تھی، وہ دادو کا تنہا اسلام آباد جانے سے منع کرنا تھا۔ وہ ان سے بحث نہ کرنا چاہتی تھی، اس کی یہ کوشش عبث ہوگی، اسے مما کی بات بہت اچھی طرح سے یاد آئی تھی جو انہوں نے اس کے ددھیال کے متعلق بہت تنفر سے کی تھی۔

''ان لوگوں کا بس نہیں چلتا، عورت کو گھر کے اندر قید کر ڈالیں۔ محض روٹی کپڑا ہی عورت کی بنیادی ضروریات نہیں ہیں، اس کی اپنی سوچ اپنی اور پسند بھی کچھ اہمیت رکھتی ہے۔ جسے یہ لوگ کبھی اہمیت نہیں دیتے اور جس کسی بے چاری نے میری طرح اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی کوشش کی اسے باغی، سرکش اور بے حیا جیسے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔''

تب اریبہ کو ان کی بات سے اتفاق نہ ہوا تھا، کہ اس کے پاپا جیسے سوبر پڑھے لکھے انسان تھے ان پہ یہ اسے سراسر الزام ہی محسوس ہوا تھا، ویسے بھی اس نے کبھی بھی انہیں مما کو روکتے یا ان پہ اپنی مرضی مسلط کرتے نہیں دیکھا تھا، اس کے برعکس مما اکثر ان کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کر جاتیں جسے پاپا اپنے رویے کی نرمی اور رکھ رکھاؤ سے برداشت کر جاتے مگر اب اسے مما کی یہ بات سو فیصد درست محسوس ہو رہی تھی۔

دروازہ دھماکے سے کھلا تھا اور تائی اماں قدرے گھبراہٹ میں اندر آئی تھیں۔ اس کی سوچوں کو بریک لگے تھے۔ ''اریبہ کہاں ہے؟''

''یہ بیٹھی ہے میرے پاس'' دادو نے اپنے دائیں جانب موجود اریبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قدرے آہستگی سے کہا، اریبہ نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ دادو تائی سے بہت خائف رہتی تھیں۔

''یہ اپنے کمرے میں نہیں تھی، ماتو میرے تو ہاتھ پیر ہی پھول گئے بتایا اسے کہ آج اس کا نکاح ہے۔''

انہوں نے آنکھیں سکیڑ کر دادو کو دیکھا تھا، جو شرمندہ سی ہو گئیں۔ اریبہ نے بری طرح چونکتے ہوئے دادو، پھر تائی اماں کو دیکھا، جن کے لبوں پہ شاطرانہ مسکراہٹ تھی۔

''کچھ پوچھا ہے بڑی بی، یا پھر بینائی کے ساتھ ساتھ سماعتیں بھی کمزور ہو گئیں؟''

اپنی بات کا جواب نہ پا کر وہ اب لاٹا بھلا کر کاٹ کھانے کو دوڑیں۔

"تائی اماں! یہ آپ دادو سے کس لہجے میں بات کر رہی ہیں اور کس کے نکاح کی بات ہے... مجھے بتائیں۔"

دادو کا چہرہ یک لخت سفید پڑا تھا۔

"تمہارا نکاح ہے، عباس حیدر کے ساتھ، آج ابھی ایک گھنٹے بعد، بس یا اور بولوں؟"

اس کی سماعتوں پر بم پھوڑنے کے بعد وہ طنزیہ نظروں سے دیکھنے لگی تھیں جسے یکبارگی اپنا آپ فضا میں معلق محسوس ہوا تھا۔

"واٹ" وہ بولنے کے قابل ہوئی تو نفی میں سر ہلاتے ہوئے بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی "امپاسبل واٹ نان سینس۔" وہ چیخ کر بولی تو تائی اماں کے نتھنے پھڑک گئے تھے۔

"اے کسی انگریزنی کی اولاد! یہ گٹ پٹ کر کے نہ دکھاؤ۔ چپ چاپ تیار ہو جاؤ ورنہ وہ حشر کروں گی کہ قیامت تک اپنی اصل شکل نہ دیکھ سکو گی انوری نام ہے میرا کوئی ایسا کام نہیں جس میں ہاتھ ڈالا ہو اور وہ پورا نہ ہوا ہو۔" اریبہ کو ان کا یہ انداز بری طرح سے تپا کے رکھ گیا۔

"کیا کریں گی آپ کن بنیادوں پہ نکاح پڑھائیں گی، میں ابھی پولیس کو فون کرتی ہوں کہ آپ لوگ میرے ساتھ زبردستی کر رہے ہیں۔"

"بات سن... بات مان لے یہ تیرا ابوظہبی نہیں ہے کہ اتنی سی بات پہ پولیس بھاگی آئے۔"

اریبہ تو صدمے سے جیسے گنگ رہ گئی تھی۔ اس انداز کی توقع کب تھی اسے۔

"اریبہ! میری جان ضد مت کر مان لے میری بچی۔ مان لے میری خاطر۔" دادو اس کے چہرے کو اپنے کمزور ہاتھوں میں بھرے سسک سسک کر گڑگڑا رہی تھیں۔

☆☆☆

اب یہ اس کی قسمت تھی کہ اس پر بھی یہ افتاد اچانک ٹوٹی تھی ناگہانی طور پر وہ بھی شکست تسلیم نہ کرتی اگر دادو کا ناتواں کمزور وجود اپنے آنسوؤں میں اسے نہ بہاتا اس نے بنا کسی مزاحمت کے ہتھیار ڈال دیئے تو نہ صرف نکاح اپنے مقررہ وقت پہ ہوا بلکہ بھابھی نے اسے عروسی لباس پہنا کر تیار بھی کر دیا وہ بالکل گم سم موم کی گڑیا کی مانند ساکت تھی۔

"دیکھو اریبہ کتنی اچھی لگ رہی ہو۔" بھابھی نے اسے مکمل تیاری کے بعد آئینے کے سامنے لا کھڑا کیا تھا، ڈیپ میرون بھاری کام والا لباس اور میچنگ جیولری، اس پہ نفاست سے کیا گیا میک اپ، اس کے نوعمری کے لوخیز چہرے کو انوکھا نکھار بخش رہا تھا۔ بھابھی اس کا ہاتھ پکڑ کر تسلی سے نواز رہی تھیں۔ اپنی ساس کی زیادتیوں سے وہ بھی نالاں تھیں مگر ان کے نزدیک وہ خوش نصیب تھی کہ عباس کی جاب بہت اچھی تھی کم از کم وہ ساس کی روک ٹوک اور ظلم و ستم سے بچ سکتی تھی کہ عباس اسے یقیناً اپنے ساتھ لے جاتا۔

بھابھی کے جانے کے بعد وہ اٹھ کر ٹیلی فون اسٹینڈ تک آ گئی۔ اس کے اندر ابھی تک اکھاڑ پچھاڑ جاری تھی۔ جس طرح سے اسے ٹریپ کیا گیا تھا۔ عباس حیدر کو قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اس سازشی ٹولے میں وہ بھی تو شریک تھا۔ لالچی اور کمینے لوگ وہ بھلا کیونکر ایسے کم ظرف شخص کو اپنے شریک حیات کے طور پہ قبول کر لیتی، خاصی دیر کوشش کرتے رہنے کے باوجود بھی اس کا ماما سے رابطہ نہ ہو پایا تو جھنجھلا کر ریسور پٹخ دیا۔ اسی پل عباس حیدر نے اندر قدم رکھا تھا۔ اریبہ نے لاک کرنے کی آواز پہ پلٹ کر دیکھا تھا۔

"اریبہ میری زندگی میری جان آئی ایم ویری ہیپی، مجھے ابھی تک یقین نہیں ہو رہا کہ... تم میری زندگی کی ساتھی بن چکی ہو۔" ایک ہی جست میں درمیانی فاصلہ سمیٹتا اسے بازوؤں میں بھر کے مجنونانہ والہانہ انداز میں خوشی کا بے پایاں اظہار کر رہا تھا۔ اریبہ بھی اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہیں تھی اس کے بازوؤں کے تنگ ہوتے گھیرے میں کچھ اس طور گھبرائی کہ بولنے تو کیا سوچنے سمجھنے تک کی صلاحیت کھو بیٹھی۔

"اریبہ، پتا ہے اگر تم مجھے نہ ملتیں تو میں سچ مچ پاگل ہو جاتا، اتنی بڑی خوشی ملی ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ پہلی بار تمہیں دیکھ کر ہی مجھے لگا تھا، جیسے تم میرے ہی وجود کا کوئی گم شدہ حصہ ہو۔ بے حد اہم حصہ جس کے بغیر میں کبھی مکمل نہ ہو پاتا۔ آئی لو یو سو مچ۔"

اس کی شدت اور دیوانگی میں کچھ مزید اضافہ ہوا تھا۔ لہجے میں بے پناہ خوشی اور جوش چھلکا پڑ رہا تھا۔ اریبہ حواسوں میں لوٹی تو غم و غصے نفرت بے بسی اور خفت سے بے حال ہو گئی۔

"چھوڑو مجھے ذلیل کمینے، جھوٹے دغاباز فریبی مکار، دوغلے بہروپیے۔ چھوڑو ورنہ میں تمہارا منہ نوچ لوں گی تم کیا سمجھتے ہو لالچی انسان، میں تمہارے فریب میں آ جاؤں گی یہ

پھانسا کسی اور کو دینا۔ جو تمہاری اصلیت سے واقف نہ ہو۔"

تمام قوتوں کو مجتمع کرتی وہ بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے اسے اچھا خاصا حیران کر گئی۔ عباس حیدر کے لیے اس کا یہ شدید مشتعل روپ ششدر...... کر دینے کو بھی کافی تھا۔

"اریبہ!" اس نے غیر یقینی کیفیت سے اسے دیکھا، اریبہ کی سانسیں بری طرح اتھل پتھل ہو رہی تھیں۔

"بات مت کرو مجھ سے، نام بھی نہ لو میرا، سنا تم نے آئی ہیٹ یو۔" ہاتھوں میں چہرا ڈھانپ کر روتی وہ اسے مزید بھونچکا کر گئی۔

"اریبہ واٹ ہیپنڈ پلیز ٹیل می۔" اسے یوں زور زور سے روتے دیکھ کر وہ اپنی انسلٹ بھلائے ایک بار پھر اس کے قریب آیا تب وہ بدک کر کئی فٹ دور اچھل تھی۔

"ڈونٹ ٹچ می انڈر اسٹینڈ۔" اس کا لہجہ ہسٹریک تھا۔ عباس کا چہرہ جانے کس احساس کے تحت بے تحاشا سرخ ہوا تھا۔ مزید چند لمحوں تک وہ لب بھینچے بالکل خاموش اسے یونہی روتا سسکتا ہوا دیکھتا رہا پھر کچھ کہے بنا پلٹ کر باہر چلا گیا۔

"سنو اس بڑھیا کو کھانا دے دینا، پہلے ہی بے چاری پوتی کی وجہ سے صدمے سے نڈھال ہے کہیں بھوکا رہنے کی وجہ سے کوچ نہ کر جائے، بلاوجہ خون ہمارے سر آئے گا۔"

تائی اماں بھابھی کو رعونت زدہ لہجے میں حکم دے رہی تھیں، عباس حیدر کے قدم کچن کی چوکھٹ پر ٹھٹکے تھے، ماں کی یہ بدزبانی اسے اکثر شرمندہ کرنے کے ساتھ گہری پشیمانی میں مبتلا کرتی تھی، اور اکثر ایسا ہوا تھا، کہ ان کی اس قسم کی سراسر جاہلانہ حرکتوں کی وجہ سے اس کا ماں سے اچھا خاصا جھگڑا ہوا تھا۔ وہ اس سے خائف بھی رہتی تھیں کہ تینوں اولادوں میں صرف وہی ان کے سامنے غلط کو غلط کہنے اور روکنے ٹوکنے سے باز نہیں رہتا تھا۔

"ارے تو یہاں کیا کر رہا ہے اپنے کمرے میں جا۔"

اس کے ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے ساتھ لے جانے پہ وہ گھبرا کر بولنے لگی تھیں۔

"بات سن لیں میری پہلے پھر جو مرضی کیجیے گا۔"

اس کا لہجہ دوٹوک اور ضبط کی شدتوں سے کھنچا ہوا تھا۔

"ارے کیا افتاد آگئی یہ بات صبح بھی ہو سکتی ہے۔"

انہوں نے گویا دہائی دی تھی۔

"نہیں ہو سکتی نہیں یہاں، اور اماں مجھے اپنی ہر بات کا بالکل کلیئر جواب چاہیے۔"

انہیں ہال کمرے میں لا کر صوفے پہ بٹھاتے ہوئے اس نے جس قدر تلخی سے کہا تھا تائی اماں اس قدر رنج ہو گئی تھیں۔

"ہا تو مجھے یہ بتا، مجھے جھوٹ بولتے کب دیکھا تم نے؟" انداز سراسر ٹالنے والا تھا اس کا بیٹا نہ ہوتا تو لحاظ رکھے بغیر صواتیں سنوانا شروع کر دیتا جب انہوں نے جھوٹ بولے تھے، سراسر الزام تراشی کی تھی مگر وہ کہاں سہار پاتیں بیٹے کی زبان سے یہ تلخ حقیقت جب ہی وہ تحقی سے دانت پیسے محض انہیں دیکھتا رہا تھا۔

"اب بول بھی منہ سے کیا پوچھنا چاہتا ہے۔" اس کے خطرناک تیور انہیں کسی گڑبڑ کا احساس بخش چکے تھے مگر لہجے میں وہی گھن گرج تھی۔

"اماں! اریبہ سے پوچھا تھا آپ نے اس نکاح سے قبل؟" ان کے چہرے پہ نگاہیں گاڑھے وہ سرد لہجے میں بولا تھا

"بیٹے۔ اس کے باپ نے خود کہا تھا تو پھر۔" انہوں نے پھر جھوٹ بولا۔

"مجھے اپنی بات کا جواب چاہیے تو وہی ہونا چاہیے" وہ ضبط گنوا کر چیخا تھا۔

"نہیں۔" تائی اماں کا انداز لٹھ مار قسم کا تھا۔

"کیوں اماں کیوں نہیں پوچھا، آپ نے تو کہا تھا۔"

"ہاں کہا تھا میں نے، اس نے تجھے میرے خلاف اکسا کے بھیج دیا آئے ہائے آج کل کی نئی نسل کی بے حیائی تو دیکھو۔ ابھی چند گھنٹے نہیں ہوئے شادی کو اور بیٹا ماں سے دو بدو جھگڑا کرنے کھڑا ہو گیا، رن مرید تجھے شرم نہیں آتی۔"

وہ باقاعدہ بین کوئی کرتے ہوئے کوسنوں پہ اتریں، تو عباس حیدر کے چہرے پر موجود سرخی کچھ اور بھی گہری ہو گئی۔

"چپ ہو جائیں اماں، فار گاڈ سیک خاموش ہو جائیں، آپ کو احساس تک نہیں ہے آپ میرے ساتھ کتنا برا کر چکی ہیں، اپنی ہی نظروں میں گر گیا ہوں میں، ہائی گاڈ میں نے خود غور کیوں نہیں کیا، بھلا کیسے ہو سکتا ہے، یہ سراسر آپ کی سازش ہو سکتی تھی، ورنہ مجھ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے کہ چاچو نے از خود فون کر کے آپ سے گزارش کی، کیا سوچ رہی ہوگی اریبہ میرے متعلق، میرے اللہ" اس نے تحت اضطرابی

کیفیت میں بال نوچ رہے تھے۔ اچانک ملنے والی سرخوشی جو انگ انگ میں مستی بھر گئی تھی۔ شدید قسم کے تاسف اور شرمندگی میں ڈھل گئی۔ وہ کب سے اتنا کوڑھ مغز ہو گیا، کہ اتنی سی بات پہ بھی غور نہ کر سکا، یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا اسے کچھ تو سوچنا چاہیے تھا، شاید من کی مراد ملنے کی اچانک خوشی نے اس کے حواس خبط کر لیے تھے، مزید ستم یہ کہ نکاح بھی ہو چکا تھا۔ کیا وہ بھی خود کو اس کی نگاہوں میں وہ مقام دلا پائے گا نئی نئی چاہت کی کونپل کھلنے سے قبل ہی مرجھانے کو تھی، اور اس نقصان سے دوچار کرنے والا بھی کوئی اور نہیں اس کی سگی ماں تھی، جن پہ نہ وہ گرج سکتا تھا نہ ان کے شانے پہ سر رکھے اس نقصان پہ آنسو بہا سکتا تھا، تبھی مزید کچھ بھی کہے سنے بغیر گھر سے نکل گیا۔ تائی اماں دندناتی ہوئیں اس کے بیڈ روم میں آئیں تو اریبہ مسلسل آنسو بہاتی ہوئی زیورات نوچنے کے انداز میں اتار کر پھینک رہی تھی "ارے اے چھچھلی، یہ کیا کر رہی ہے، منہ توڑ دوں گی میں تمہارا، یہ اتنے سستے نہیں ہیں، جو یوں پھینک رہی ہے۔" وہ اسی جنونی انداز میں اس پہ جھپٹیں، اریبہ اگر بروقت سائیڈ پہ نہ ہو جاتی تو یقیناً ان کا گھونسا اب تک اس کی ناک سے خون چھلکا چکا ہوتا۔

"کیا کہا تم نے عباس سے، بول ورنہ میں تیرا گلا گھونٹ کر ابھی کام تمام کر دوں گی۔" آنکھیں نکال کر چیخیں وہ اس کے خوف کو مزید بڑھا گئیں، جو کچھ انہوں نے اس کے ساتھ کیا تھا وہ ان سے ہر قسم کے سلوک کی توقع رکھتی تھی۔

"آنے دو تمہارا ہوتا سوتا اسے بھی دیکھ لوں گی اور سن اب تمہارے منہ سے آواز بھی نہیں نکلنی چاہیے۔"

سرد لہجے میں دھمکاتی وہ جیسے آئی تھیں ویسے ہی ہر شے کو ٹھوکروں کی زد پہ رکھے پلٹ کر چلی گئیں، اریبہ اس قدر متوحش تھی، کہ آنکھوں میں آئے آنسو بھی گویا ٹھہر گئے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح جب اس نے بیڈ روم میں قدم رکھا اریبہ رات بھر جی بھر کے آنسو بہانے کے بعد سو چکی تھی بیٹ ناٹی میں اس کا جگمگاتا ہوا حسن گویا شعاعیں بکھیر رہا تھا بیڈ پہ بکھرے دراز گیسو اس کے حسن کو مزید تابناکی بخش رہے تھے، کمبل کے ہٹنے سے وہ قدرے سکڑ کر لیٹی تھی، وہ پہلے ہی قدم پہ ٹھٹک گیا تھا۔ نیم وا لب اور جاذب نظر نقوش دراز خمیدہ پلکیں ہوش اڑانے کو سب کچھ تھا۔ وہ جیسے سب کچھ بھلائے مبہوت سا ہو کر اسے دیکھتا چلا گیا۔ اپنی

اٹھائیس سالہ زندگی میں یہ پہلی لڑکی تھی، جسے دیکھ کر دل بے تاب ہو کر اس کی جانب کھنچا تھا، جانے کیا تھا ایسا اس ایک چہرے میں، کہ اس کے لیے گویا پوری کائنات اسی چہرے میں سمٹ آئی تھی۔

بے خودی کے عالم میں وہ آگے بڑھا اور بیڈ کے نزدیک آ کر جھک گیا، اس کے چہرے پہ آنسوؤں کی نمی محسوس کر کے وہ قدرے چونکا۔ انگ انگ میں دوڑتی سرخوشی کی جگہ عجیب سی اذیت نے لے لی۔ اس کے ذہن کو خفیف سا جھٹکا لگا تھا، لب بھینچے ہوئے وہ سیدھا ہوا، کمبل اٹھا کر اس پہ پھیلانے لگا۔ تب بالکل اچانک اریبہ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اسے خود سے اس قدر نزدیک پاتے ہی اس کی آنکھوں سے ہی نہیں چہرے سے بھی گھبراہٹ و سراسیمگی چھلکی تھی، دل لاتعداد خدشات لیے اندر زخمی پرندے کی مانند پھڑپھڑایا، وہ ایک جھٹکا کھا کر اٹھی تھی۔

"اوہ آئی ایم سوری میں تو یہ کمبل۔" اس کے اس درجہ شدید ردعمل پہ خجالت سے سرخ پڑتا وہ نظریں چرا کر گویا وضاحت پیش کر رہا تھا۔ اریبہ کوئی جواب دیے بغیر لب کاٹتی ہوئی بکھرے بال سمیٹنے لگی، تب عباس کی خجالت میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا، فاصلہ بڑھا کر صوفے پہ بیٹھتا ہوا وہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا تھا۔

"اریبہ مجھے افسوس ہے جو کچھ ہوا۔ آئی نو آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ میں اپنی کوئی صفائی پیش نہیں کروں گا، آف کورس اس سب میں میں فقط پرسنلی ملوث رہا ہوں مگر۔"

"نو آرگومنٹ، مسٹر عباس مجھے کچھ نہیں سننا۔" وہ ضبط کھو کر چیخی تھی۔ عباس جو نگاہیں ملائے بغیر بات کر رہا تھا سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا، اس کی سرخ آنکھوں میں مچلتے آنسو عباس کا دل بھینچ گئے۔

"اریبہ! میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ بس صرف اتنا، کہ مجھے صرف آپ کی خوشی مقدم ہے۔"

رات بھر کی ذہنی اذیت کے بعد وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا، کہ اس طرح وہ اس مجرمانہ احساس سے نکل سکتا ہے۔

"میری خوشی؟" اریبہ کے چہرے پہ تناؤ کے ساتھ تمسخر پھیلا، لہجہ از حد تلخ ہو گئے۔ عباس کو بے تحاشا شرمندگی سے دوچار کر گیا۔

"اگر ایسی بات ہے عباس حیدر! تو مجھے واپس بھجوا دو۔ مجھے مما کے پاس جانا ہے صرف یہی میری واحد خواہش ہے" وہ نفرت سے بولی تو عباس حیدر کے وجیہہ چہرے پہ تاریک سا سایہ لہرا کر معدوم ہو گیا۔

"کیوں اہو گئے نا چپ۔" عباس ایک نگاہ اس کے درشتگی چھلکاتے..... چہرے پہ ڈال کر عجیب شکستہ سے انداز میں مسکرایا تھا۔

"اگر تم یہ چاہتی ہو تو ایسا ہی ہوگا۔ ڈونٹ وری۔"

اس کی معصومیت بھری خوبصورتی سے نگاہ چراتا وہ اپنے دل پہ جبر کر گیا۔

اریبہ نے غیر یقینی میں گھر کے چونکتے ہوئے اسے بغور دیکھا، تو دل پل بھر کو تھم کے بے تحاشا دھڑکا تھا۔

"رئیلی!" اس کے مایوس چہرے پہ امید کی کرن جگمگائی۔

"تت! تم واقعی سچ کہہ رہے ہو۔" پل بھر میں اس کے پورے وجود میں تیزی سنسناہٹ دوڑ گئی تھی لہجے میں دبا دبا جوش..... اور چہرا کھلا اٹھا تھا، عباس حیدر نے بے بس نظروں میں عجیب سا تاسف بھر کے اس کی اس چھلکتی خوشی کو دیکھا تھا، اور سر اثبات میں ہلا دیا۔

"آف کورس! میں نے کہا نا مجھے صرف آپ کی خوشی عزیز ہے۔" اس کی ستاروں کی مانند دمکتی آنکھوں سے نظر چراتے ہوئے وہ بہت ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"اگر تم واقعی ایسا کرو عباس حیدر! تو تمہارا یہ جرم معاف کر سکتی ہوں۔" ہلکے پھلکے سے انداز میں کہتی وہ بے حد ریلیکس محسوس ہوئی، عباس حیدر نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پلٹ کر واش روم میں گھس گیا اس اچانک فیصلے نے اسے جو ذہنی و جسمانی تھکن عطا کی تھی وہ اس کے اعصاب کو شکستہ کرتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

تائی اماں نکاح کر لینے کے باوجود..... مطمئن نہیں تھیں اب ان کا ارادہ پورے خاندان کو جمع کر کے ولیمہ کی تقریب منعقد کرنے کا تھا اریبہ نے سنا تو تلملاتی ہوئی اٹھ کر کمرے میں آئی۔ تائی اماں سے وہ یوں بھی خائف رہتی تھی ان سے بحث تو بہت دور کی بات تھی۔ بھابھی نے اسے بتایا تھا کہ وہ تو اس لحاظ سے بہت خوش نصیب ہے کہ نکاح کو دو دن گزر جانے کے باوجود تائی اماں نے اسے گھر کے کام دھندے میں نہیں الجھایا۔ خود وہ تو

اپنی شادی کی اگلی صبح ہی کام میں جت گئی تھیں۔ اپنا ہی نہیں پورے گھر کا ناشتا انہوں نے خود بنایا تھا۔ بقول تائی اماں کے ان کی بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم کہاں کہ وہ ان کے ناز نخرے برداشت کریں اریبہ کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے تھے ان کی باتیں سن کر گو کہ وہ اس پہ بھی ہاتھ اٹھا چکی تھیں۔ اب بھی محض عباس حیدر پہ تپتی ہوئی نگاہ ڈال کر وہ اندر چلی آئی اور اب پورے کمرے میں ٹہل ٹہل کر وہ اپنا دماغ کھولتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

"اب بھی نہیں آتے۔ بیٹھے رہتے اپنی ماں کے گھٹنے سے لگ کر۔" آدھے گھنٹے بعد عباس نے کمرے میں قدم رکھا تو اریبہ اتنی دیر تک سلگ سلگ کر آدھی رہ گئی تھی۔

عباس ایک پل کو متحیر رہنے کے بعد بے ساختہ مسکرایا تھا۔ خالصتاً بیویوں والا یہ انداز اس کے اندر ایک انوکھا سا سرور بھر گیا تھا۔ آنکھوں میں آپ ہی آپ شرارت بھری مسکان مچل گئی۔ جس سے نظریں چرائی وہ چہرے کو جھکا گئی تھی۔

"تو گویا میرا انتظار تھا۔ خیریت۔" جیکٹ اتار کر بستر پہ رکھتا ہوا وہ اس کے چہرے پہ بکھرے خوبصورت رنگوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ.... یہ سب کیا ہے۔" وہ بری طرح سے سلگی تھی۔

"کیا؟"

"آپ شاید ولیمہ کی بات کر رہی ہیں، نہیں ہوگا اور کچھ۔" اس کا بھرپور طمانیت بھرا لہجہ اریبہ کو آگ لگا گیا۔

"کچھ اور بھی کہا تھا آپ نے، وہ یاد ہے یا بھول گیا؟" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"یاد ہے مگر غلطی آپ کی ہے۔ آپ نے پاسپورٹ اور ویزا کیوں اماں کے حوالے کیا تھا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں رہا۔ بہر حال میں کوشش کر رہا ہوں۔"

دھیما دھیما اتنا گھمبیر اور متاثر کن لہجہ تھا، کہ اریبہ اس شدید قسم کی ذہنی کوفت میں بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ پائی۔

"مجھے مما کو فون کرنا ہے، میں ہر حال میں ایک ہفتے تک واپس جانا چاہتی ہوں اور یہ تمہیں ممکن بنانا ہے۔" ہونٹ سکوڑ کر نفرت سے کہتی وہ اسے اپنی سوچ سے بہت دور محسوس ہوئی تھی۔ عباس نے بنا کچھ کہے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر کچھ نمبر پنچ کیے تھے، چند لمحے بات کرنے کے بعد وہ اس سے کانٹیکٹ نمبر پوچھنے لگا، جو اریبہ نے بتا دیا، جسے دوسری

جاب دوہراتے ہوئے وہ شکریہ ادا کرنے کے بعد ریسیور رکھتا اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"صرف چند منٹ انتظار کریں، ابھی آپ کی بات ہو جائے گی۔" وہ جو اس کے انگلش لب و لہجے کے خوبصورت اتار چڑھاؤ سے متاثر بہت ستائشی نگاہ سے دیکھ رہی تھی، اس سے نگاہیں چار ہوتے ہی فی الفور نظریں چرا گئی۔

"تھینکس۔" وہ منہ ہی منہ میں منمنائی تھی۔

عباس اچھا خاصا چونکا اور پھر عجیب سے انداز میں ہنس پڑا۔

"یو ویلکم سویٹ گرل۔" اخبار اٹھا کر سامنے پھیلاتے ہوئے اس نے نرمی سے کہا تھا۔ اریبہ کو پہلی بار اس کے مزاج و انداز کی یہ نرمی بہت خاص محسوس ہوئی، جب ہی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے دیکھنے لگی تھی، بلیک جینز اور وائٹ ہائی نیک شرٹ میں، اس کا مضبوط و لمبا چوڑا سراپا غضب کی مردانگی سمیٹے روبرو تھا۔ چوڑی پیشانی، کھڑی ناک اور روشن کشادہ آنکھیں، بلاشبہ وہ کسی کے بھی دل کی دھڑکن کو غیر معمولی حد تک بڑھانے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔

"اریبہ بات کریں آپ کا ہی فون ہے۔" اس کا جائزہ لینے میں وہ اس حد تک مگن ہوئی تھی کہ زور و شور سے بجتی فون کی بیل تک سے نہیں چونکی، عباس حیدر کے متوجہ کرنے پر وہ یوں ہڑبڑائی جیسے گہری نیند سے جاگی ہو۔ عباس حیدر کی نگاہ میں ذرا سا تحیر و استعجاب اس قدر گہرا تھا کہ اسے خجالت کے احساس سے اپنا چہرا جلتا ہوا محسوس ہوا۔

"ہیلو۔" اس کے کانپتے ہاتھوں میں ریسیور باقاعدہ لرزا تھا۔ دوسری طرف ملازمہ تھی۔

"مما کو بلاؤ۔" ہونٹ کچلتے ہوئے وہ انتظار کے چند لمحے اس پہ بے حد بھاری پڑے تھے۔

"ارے اریبہ ڈارلنگ! یہ تم ہو۔ تھینک گاڈ، کہ تمہیں خود بھی خیال آیا فون کرنے کا، ورنہ جب بھی کریں ہم کریں۔ ہاؤ آر یو سویٹ ہارٹ۔ کیا ابھی ایک ہفتہ پورا نہیں ہوا جو ابھی تک وہیں بیٹھی ہو۔"

مما کی بالکل فریش ہشاش بشاش آواز ایئر پیس سے نکل کر اس کی سماعتوں میں اتری تو اس کا گلا رندھ گیا۔ کچھ بولنے کی کوشش میں وہ محض لب کچل کر رہ گئی۔ اس نے محسوس کیا، اس کے گال بہت تیزی سے بھیگتے جا رہے ہیں۔

"کچھ بولو بیٹے! یہاں تمہارے پپا بہت مس کر رہے ہیں تمہیں۔ پلیز کم بیک ڈارلنگ۔"

"مما... مما کیسے آؤں نہیں آسکتی میں۔" وہ سسک کر روئی تھی۔

"واٹ ہیپنڈ؟ اور یہ تم رو کیوں رہی ہو اریبہ" دوسری جانب مما گھبرائی تھیں۔

"مما... مما... ان لوگوں نے بہت غلط کیا۔

مما... انہوں نے مجھے یرغمال بنا لیا ہے۔" وہ کچھ اور شدتوں سے روئی، تو عباس حیدر جو اخبار سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھنے لگا تھا اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

اریبہ کے آنسوؤں میں کچھ اور روانی آگئی۔ "پلیز مما... ہیلپ می۔"

"واٹ ہیپنڈ؟ کچھ بتاؤ بھی، کیا پرابلم ہے۔ کیا ان لوگوں نے اپنے اس مکان کی وجہ سے کوئی جھگڑا کیا ہے تو لعنت بھیجو، بس تم آجاؤ۔ ان لوگوں سے میں خود نبٹ لوں گی۔" انہوں نے اپنے انداز میں اسے تسلی دی تھی۔

"نو مما! یہ بات نہیں ہے۔ ایکچولی یہاں بڑی اماں نے زبردستی اپنے بیٹے سے میرا نکاح کروا دیا ہے۔ انہوں نے ٹارچر کیا تھا مجھے۔" وہ زور زور سے روتے ہوئے بولی جبکہ دوسری جانب مکمل سناٹا چھا گیا تھا۔

"مما..." اریبہ نے گھبرا کر پکارا۔

"شٹ اپ! جسٹ شٹ اپ۔"

"مما..." اریبہ صدمے سے چور ہوئی تھی، اس دھاڑتی ہوئی پھنکار پہ۔

"بکواس بند کرو! بات مت کرو مجھ سے دھوکے باز لڑکی! تم بھی اس دغاباز، مکار کی بیٹی ہو نا، یہ تم سب کی ملی بھگت ہے۔ میں جانتی ہوں۔" وہ پوری قوت صرف کر کے چیخیں۔

اریبہ چھلکتی خوفزدہ آنکھوں میں بے یقینی سموئے ساکت بیٹھی تھی جبکہ مما حلق کے بل چنگھاڑ رہی تھیں۔

"تمہارا باپ بھی یہی چاہتا تھا، وہ تمہاری شادی اپنے بھتیجے سے ہی کرنا چاہتا تھا۔ تمہیں بھی وہاں بھاگنے کی جلدی تھی۔ کسی نے مجھے نہیں بتایا۔ اگر تمہاری مرضی نہ ہوتی تو نکاح کیونکر ہوتا۔"

لائن کٹ گئی۔ اریبہ شاکڈ رہ گئی۔ اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں ہر منظر دھندلا

گیا۔ اسے گمان تک نہ تھا مما یہ سب کچھ بھی اس کے ساتھ کرسکتی ہیں۔ وہ اسے اتنا غلط سمجھ سکتی ہیں۔ یعنی وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ اسے اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''اریبہ! لو پانی پی لو۔ پلیز سنبھالو خود کو۔'' وہ حواس کھو رہی تھی۔ جب اس نے عباس حیدر کی آواز سنی۔ آنسوؤں میں تیز بارش کے باعث اسے عباس کا بہت دھندلا عکس دکھائی دیا تھا جو گلاس اس کی جانب بڑھائے بہت ہمدردانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر نفرت، حقارت، بے بسی اور غم و غصے کی ایک تند و تیز لہر اٹھی تھی۔

''تم ہی تو ہو، مجھے اس اسٹیج تک پہنچانے والے۔ زندہ نہیں چھوڑوں گی میں تمہیں۔'' ہاتھ مار کر پانی کا گلاس گرانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان دبوچ لیا تھا۔ ''نفرت ہے مجھے تم سے، تمہاری صورت سے، سنا تم نے۔ تم ہی تو ہو میرے ناقابلِ تلافی نقصان کے ذمہ دار۔ اب ہمدردی کرنے کے بہانے نمک چھڑک رہے ہو میرے زخموں پر۔''

اس کے سینے پہ مکے مارتی وہ ہذیانی انداز میں چلاتی رہی تھی۔

☆☆☆

وہ پچھلے دو گھنٹوں سے آنسو بہا رہی تھی اور عباس حیدر بے چارگی و بے بسی سے اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہا تھا۔ اریبہ نے جو بات چیت چچی سے فون پر کی تھی، اس سے اسے ان کے شدید ردعمل کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ یہ معصوم سی پیاری سی لڑکی جو اسے رگِ جاں سے بھی قریب محسوس ہونے لگی تھی، اس کی ذرا سی بے احتیاطی کی وجہ سے گہرے دکھ سے دوچار ہو چکی تھی۔ اس پہ ستم یہ کہ وہ اس کی کوئی بات بھی سننے پہ آمادہ نہیں تھی۔ ایک دو بار اس نے اسے چپ کروانے کی کوشش کی تھی مگر اس کے بھڑک اٹھنے پہ خاموش بیٹھنا پڑا تھا۔ دل پہ پتھر رکھ کے وہ اسے واپس بھیجنے پہ آمادہ ہو گیا تھا۔ ہر ممکن طریقے سے وہ اس زیادتی کا ازالہ کرنے کا خواہاں تھا۔ مگر اب اسے بہت شدت سے احساس ہوا تھا یہ معاملہ بہت بگڑ چکا تھا۔ صرف اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ وہ ایک دو بار خود چچی سے بات کر کے معاملہ سلجھانے کی کوشش کر چکا تھا، مگر انہوں نے اس کی بات سننا گوارا نہیں کی۔ تب اس کے اندر موجود حکمن کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اس کے آنسو عباس کو بہت تکلیف دے رہے تھے، جب ہی ایک بار پھر اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔

''اریبہ پلیز مت روؤ۔ آئی تھنک، ابھی چچی جان غصے میں ہیں۔ انہیں شاک لگا ہے اس انکشاف پر۔ بٹ آئی ایم شیور کہ آہستہ آہستہ ان کا غصہ ختم ہو جائے گا۔ تب میں بھی اماں سے کسی نہ کسی طرح پاسپورٹ نکلوا لوں گا۔ آئی پرامس دو دیو۔ میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ بس اب روؤ نہیں۔''

پنجوں کے بل اس کے مد مقابل بیٹھ کر وہ اس قدر محبت اور نرمی سے بولا تھا کہ اریبہ نے بوجھل پپوٹے اور نم بھیگی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ طنزیہ چھیدتی ہوئی نظروں کا وار وہ سہار نہ سکا اور نگاہیں شرمندگی کے احساس سے جھک سی گئیں۔

''اگر میں تم سے کہوں کہ مجھے نہ تم پر بھروسہ ہے نہ تمہاری باتوں پہ تو۔'' اس نے غرا کر کہا، تو عباس کے چہرے سے بے بسی کا واضح اظہار چھلکا تھا۔

''مجھے تمہاری ہمدردی نہیں چاہیے۔ پلیز اس وقت یہاں سے چلے جاؤ۔'' اندر کی تمام تلخی اور بدگمانی وہ اس پر برسا کر رخ پھیر گئی تو عباس سرخ چہرے کے ساتھ لب بھینچے ہوئے سرعت سے اٹھ کر سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح جب بھابی نے اسے عباس حیدر کے واپس ڈیوٹی پر چلے جانے کی اطلاع دی تو ایک پل کو وہ بالکل گم صم رہ گئی تھی۔

''میں نے اس سے کہا تھا کہ اسے یوں تمہیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔ اماں صرف اس سے دبتی ہیں۔ اب تو گویا انہیں تمہارے خلاف خوب کھل کر کھیلنے کا موقع ملے گا۔''

وہ اپنے خدشے کا اظہار کر رہی تھیں اریبہ کے لبوں پہ زہر خند پھیل گیا جو کچھ مما نے کہا تھا اس کے بعد شاید اسے مزید کوئی بات بھی اتنا گہرا صدمہ نہیں پہنچا سکتی تھی۔ تائی اماں کی بھی کوئی بات نہیں۔ اس نے بے حسی سے سوچا۔

''سنو۔ عباس حیدر تم سے ناراض تھا؟'' بھابی راز داری سے اس کی جانب سرکیں۔ وہ ناشتا جو وہ لائی تھی، یونہی رکھا تھا۔

''مجھے اس کی ضرورت نہیں، جہنم میں جائے۔'' وہ تڑخ گئی تھی۔

بھابی کچھ کہے بغیر اسے دیکھتی رہیں پھر اٹھتے ہوئے بولیں۔

''ابھی تم غصے میں ہو، اس لیے اپنے برے بھلے کی پہچان کھو دی ہے تم نے، مگر

پلیز عباس کو خفا نہ کرو، وہ بہت اچھا ہے۔ کیئرنگ اور لونگ اور پھر تمہارے معاملے میں تو بہت سنسیئر ہے۔"

وہ نرمی سے اپنی بات کہہ گئی تھیں۔ اریبہ نے یونہی لیٹے لیٹے آنکھوں پہ بازو رکھ لیا۔

"جھوٹ ہے سب محض فریب نظر۔ اگر اسے میری پروا ہوتی، اسے مجھ سے محبت ہوتی تو مجھے یوں چھوڑ کے چلا جاتا؟ اسے مجھ سے، میرے وجود سے۔ بس اپنے نفس کی تسکین کرنا ہے۔ جب میں نے اس کا مقصد پورا نہیں ہونے دیا، تو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ آئی ہیٹ اٹ۔" اس کا تھکا ہوا ذہن سوچوں سے بوجھل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

عباس حیدر کو گئے پندرہ دن ہوئے تھے اور ان پندرہ دنوں میں زندگی اپنی تمام تر سفاکی، تلخی اور سختی کے ساتھ اس کے سامنے آ گئی تھی۔ بھابھی نے بالکل سچ کہا تھا، کہ تائی اماں صرف عباس سے دبتی ہیں۔ اس کے جاتے ہی وہ اسے تختہ مشق بنا گئی تھیں۔ اس نے آج تک کبھی چائے بھی نہیں بنائی تھی مگر یہاں تائی اماں اس سے ہر کام لینا چاہتی تھیں۔ وہ بھابھی کی موجودگی اور دادو کی ڈھارس کے باوجود بری طرح بکھر گئی تھی۔ کئی مرتبہ چولہے کا کام کرتے اناڑی پن کی وجہ سے اس کا ہاتھ جلا۔ ایک مرتبہ تو اس کے دوپٹے کو بھی آگ لگ گئی تھی جو بھڑک کر لباس کو لگنے کو تھی۔ اگر بھابھی بروقت نہ دیکھ لیتیں، تو اریبہ بری طرح سے جھلس جاتی۔ اپنا انجام سوچ کر اس کے وجود میں کپکپی دوڑ گئی تھی۔

گوشت صاف کرتے، سبزی بناتے کئی بار اس کا ہاتھ کٹا تھا۔ محض پندرہ دنوں میں وہ حال سے بے حال ہو گئی تھی۔ مایوسی، دل گرفتگی، بے مائیگی اور بے بسی، پوری طرح اسے اپنے پنجوں میں جکڑ چکی تھی۔ جب اچانک بالکل غیر متوقع طور پر عباس حیدر چلا آیا۔ سرخ شکن آلودہ لباس، الجھ کر بکھرے بالوں اور بے رونق چہرے کے ساتھ تائی اماں کے کمرے سے چائے کے خالی مگ اٹھائے وہ بالکل اچانک اس کے سامنے آ گئی تھی۔ عباس حیدر پہلی نگاہ میں اسے پہچان نہیں پایا تھا۔ جبکہ اریبہ کی آنکھوں میں اسے یوں روبرو پا کے حیرت سمٹ آئی تھی۔

"اریبہ......" وہ ششدر رہ گیا تھا۔ "مائی گاڈ۔ یہ۔۔۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔" اس کے ہاتھ سے مگ لے کر وہیں پٹختے ہوئے وہ بھڑک کر بولا تھا۔

"تمہیں کیا، اپنی ڈیوٹی نبھاؤ، میں چاہے مروں یا جیوں۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ اس کے لبوں سے پھسلا تھا اور ڈھیروں ڈھیر نمی آنکھوں سے، عباس حیدر اس کے لہجے سے چھلکتے مان، اور اپنائیت بھری خفگی پہ عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہوا۔ بے اختیار اسے شانوں سے تھام کر اپنے مقابل لے آیا، مگر اریبہ کچھ کہے بنا ہی سسک کر کسی معصوم سی بچی کی طرح اس کے گلے لگ گئی تھی۔ جس قسم کے حالات سے وہ گزری تھی، اس کے بعد یہ جذباتی کیفیت طاری ہو جانا کچھ ایسا بھی عجیب نہیں تھا مگر اس کے نرم و نازک دلکش سراپے کو خود سپردگی کے انداز میں خود سے اتنا قریب پا کر عباس حیدر کے اندر سنسنی خیزی کا احساس تھرتھرایا تھا۔ خوشگوار سی حیرت بھرے تاثرات کے ساتھ جھک کر اس نے اریبہ کو دیکھا تھا جو ہنوز اسی طرح گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔

"یار! اگر مجھے پتہ ہوتا ایسا شاندار استقبال ہو گا تو بہت پہلے آ جاتا۔" مسکراتی ہوئی دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ ذومعنی لہجے میں بولا۔ تب جیسے اریبہ ہوش میں آ گئی۔ کچھ دیر قبل سرزد ہو جانے والی اپنی بے اختیاری حرکت یاد آنے پر اس کے گلابی چہرے پہ خجالت آمیز تاثر ابھرا تھا۔ مچلتی ہوئی مسکراہٹ لبوں کے گوشوں میں دبائے عباس اسے بھاگنے کو پر تولتے محسوس کر کے سرعت سے لپک کر اس کے راستے میں حائل ہوا تھا۔

"نہیں، راستہ چھوڑیں، جانے دیں مجھے۔"

"اور اگر میں نہ جانے دوں تو؟ مرضی ہے نا میری۔" اس کے حیا آلود چہرے پہ گہری نگاہ ڈالتا وہ بہت موڈ میں آ چکا تھا۔

اریبہ کی جان پہ بن آئی، خود اپنی مغلوب حالت پہ بھی اسے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔

"ک...... کوئی آ جائے گا تو......"

"تو کیا۔۔۔ کچھ نہیں...... ابھی کچھ دیر قبل جب خود تم......"

"عباس۔۔۔ پلیز" بری طرح سے سرخ ہوتی وہ اس قدر منتی ہوئی تھی کہ عباس کو اس پہ رحم کھانا پڑا۔ اریبہ سائیڈ سے کترا کر سرپٹ بھاگی تھی۔

☆☆☆

بھابھی اور عاصم بھائی نے مل کر خوب خوب سنائی تھیں اسے ان ہی کے فون کرنے پہ وہ آیا تھا اور اب ان کی عدالت میں سر جھکائے کسی مجرم کی طرح بیٹھا تھا۔

"مجھے سب سے زیادہ تم پہ غصہ ہے۔اماں کو جانتے ہو تم پھر بھی۔چلو میری بات اور تھی، میں اسی ماحول، اسی شہر کی تھی، ان کی سخت طبیعت سے سمجھوتہ کر لیا مگر اریبہ..... اس کا نہ ماحول یہ تھا نہ رہن سہن، پھر تم کس کے رحم و کرم پہ اسے چھوڑ گئے تھے۔ وہ بے چاری ہر طرف سے آزمائش میں گھر گئی۔ماں اس سے بدظن ہو کے خفا ہو گئیں۔باپ کو شاید سرے سے خبر ہی نہیں۔اس کے تئیں یہاں ان کی بیٹی اپنے ددھیال میں سیر و تفریح کے لیے آئی ہے۔مگر یہاں یہ خبر نہیں کہ بیٹی کی گن پوائنٹ پر شادی منعقد کرنے کے بعد" بھابھی پلیز۔"

"چپ رہو تم۔" بھابھی نے بری طرح سے جھاڑا۔

"ساس صاحبہ ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہی ہیں، تو شوہر موصوف کو ایسے حالات میں اس کی ہمت حوصلہ بڑھانے کے بجائے اپنی انا عزیز ہے۔حالت دیکھی ہے اس کی۔کھل پندرہ دنوں میں وہ پھول سی نازک لڑکی کس بری طرح سے مرجھا گئی۔عباس! اگر اس کی ماں کو بھنک بھی پڑ گئی تو ہم پہ حبس بے جا میں رکھنے کا کیس بن سکتا ہے۔" انہوں نے لعنت ملامت کا سلسلہ روک کر آخر میں دہائی دی تھی۔

"آئی ایم ساری۔مجھے احساس ہے کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ سچ مچ ندامت کا شکار ہوا تھا۔پھر موڈ بدل کر ذو معنی لہجے میں بولا۔

"پندرہ دنوں میں ہی آپ کی دیورانی صاحبہ کو پہلے سے بڑھ کر خوبصورت حسین اور نازک نہ بنا دیا تو نام بدل دیجیے گا۔" اس کی آنکھوں میں مچلتی شرارت پہ جھینپ کر بھابھی نے اسے دھپ رسید کی تھی۔

☆☆☆

وہ اندر آیا تو اریبہ نم بالوں کو پشت پہ بکھرائے لائٹ آسمانی لباس میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی۔آہٹ پر گردن موڑ کر دیکھا۔اسے روبرو پا کے اس کے چہرے پہ خفیف سی سرخی نمودار ہوئی تھی جو سرشاری کا احساس اس کے اندر پیدا کر گئی۔وہ یکسر بدلے ہوئے روپ میں سامنے آئی تھی۔گویا وہ ذہنی طور پر اس تعلق، اس رشتے کو قبول کر چکی تھی۔

"ویل از ناٹ فیئر۔" اس کی پشت پہ ہلکا سا جھک کر شاکی لہجے میں بولا تو اریبہ جو اس کے یوں قریب آ جانے پہ گھبرا کر پیچھے ہوئی تھی، چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"بھئی۔اب اتنا تو ہمارا حق تھا نا کہ ہماری مسز نئی زندگی کی شروعات پہ ہماری

خاطر کوئی خاص تیاری کرتیں۔اتنا ڈل ڈریس پہننے کی کیا ضرورت تھی۔"

اس کی آنکھوں کے سوال کو پڑھ کر وہ قدرے شاکی لہجے میں بولا تو اریبہ کا چہرا متغیر ہو گیا۔

"آپ سے کس نے کہا، کہ آج سے ہماری نئی زندگی کی شروعات ہو رہی ہے۔"

اس کا دھیما لہجہ بے حد سرد تھا۔عباس نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"واٹ ڈو یو مین۔" اس کا الجھا ہوا لہجہ نامعلوم سی تپش لیے تھا۔

"پلیز، کچھ مت پوچھیں، مجھ سے..... ابھی میں ذہنی طور پر آمادہ نہیں ہوں۔پاپا کی بے خبری، مما کی ناراضی کے باوجود......" وہ جھجک کر بات ادھوری چھوڑتی انگلیاں مسلنے لگی۔

"کتنا انتظار کرنا پڑے گا مجھے۔" اس کا لہجہ سلگ کر آنچ دینے لگا۔

"کتنا انتظار کر سکتے ہیں آپ؟" وہ الٹا اس سے سوال کر گئی۔

"میں.....اریبہ! مجھے مت آزماؤ۔" بے ربط، بکھرا ہوا سا لہجہ تھا، وہ یک لخت اسے اپنے آہنی بازوؤں میں جکڑ گیا تھا۔ایک پل کو اریبہ حق دق رہ گئی۔اس کی بانہوں کے حلقے میں گم ہوتے حواسوں میں بھی اس نے اپنی دھڑکنوں کو اس کی دھڑکنوں میں مدغم ہوتا محسوس کیا۔عباس حیدر کی قربت کا احساس اسے صندل کی طرح مہکا کر معطر کر گیا تھا۔

"بہت محبت کرتا ہوں تم سے، اور یہ دوری، یہ فاصلہ، میری برداشت کا کڑا امتحان ہی تو ہے اریبہ! پلیز۔" وہ ہوش و حواس میں نہیں تھا۔اریبہ حواس کھوتی جا رہی تھی۔اس کی چاہت کا احساس اس کا خوشبودار حصار اس کے تمام احتجاج کو پس پشت ڈال گیا۔وہ اس کی محبتوں کی تند و تیز دریا میں کسی تنکے کی مانند بہتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح اس کے پچھلے ایک ماہ کی ذہنی تھکن اور ہیجان کو اس سے بہت دور کہیں پھینک آئی تھی۔رات عباس حیدر نے بہت نرمی، محبت اور سبھاؤ سے اسے برتا تھا۔کچھ اس قدر احتیاط سے کہ اسے لگا تھا جیسے وہ کوئی نازک آبگینہ ہو جو ہلکی سی بے احتیاطی سے بکھر جائے گا۔اس کی بے اختیاریوں میں جو احتیاط اور چاہت کے رنگ نمایاں تھے، انہوں نے اریبہ کو خود پر نازاں کر ڈالا تھا۔جس پل اس کی آنکھ کھلی، اس کا سر عباس حیدر کے شانے سے لگا تھا۔کس قدر گہری پرسکون نیند لی تھی اس نے، وہ خود حیران رہ گئی۔حالانکہ جب سے وہ

پاکستان میں آئی تھی۔ پہلے پہل جگہ کی تبدیلی کے باعث اور پھر جس کرائسس سے وہ گزری تھی، اس کے بعد تو اچھی نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے ایک طویل سانس کھینچا اور مسکرا دی۔ اسے خود نہیں پتہ تھا، وہ آج خوش کیوں تھی۔ ہر احساس جیسے پس پشت چلا گیا تھا۔ چاہے وہ ممی کی خفگی کا تھا یا پھر تائی اماں کی تیز چبھتی ہوئی نظروں کا۔ اس ایک رات میں، محض ایک رات میں وہ عباس حیدر کے چاہت کے بہت سے مراحل طے کر آئی تھی۔ اس نے مسکرا کر عباس کے روشن اجلے چہرے کی سمت دیکھا تھا اور اسے لگا تھا جیسے یہی اس کی کل کائنات ہے۔ اس نے گردن گھما کر وال کلاک کی سمت دیکھا۔ چھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ اتنے دنوں کے ذہنی کرب میں مبتلا رہنے کے بعد ایسا اطمینان اور خوشی یقیناً رب کی عطا ہی تھی..... جب بھی وہ گھبرا کے دادو کے سامنے روئی تھی، انہوں نے ہمیشہ اپنی مہربان آغوش میں سمیٹ کر اسے ایک ہی نصیحت کی تھی۔

"نماز پڑھا کرو چندا! دیکھنا اللہ کیسے نوازتا ہے۔"

ہاتھ لینے کے بعد اس نے نماز پڑھی تھی اور بہت دیر تک دعا مانگتی رہی۔ اسے یہ محسوس کر کے حیرت نہیں ہوئی تھی، کہ اس کی تمام دعاؤں کا محور عباس حیدر کی ذات کے گرد گھومتا رہا تھا۔ منہ پہ ہاتھ پھیر کر اس نے جائے نماز تہ کی اور پلٹ کر بیڈ کے پاس آ گئی، وہ ہنوز بے خبری کے عالم میں تھا۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ ذرا سا جھکی اور اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر جھٹکا دیا تھا۔ عباس نے اگلے ہی پل کراہ کے آنکھیں کھول دیں۔

"ہائی گاڈ! یہ کیا طریقہ ہے جگانے کا۔" مصنوعی خفگی سے کہتا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"اب اٹھ جائیں۔" وہ اس کی گہری پر تپش نگاہوں سے نظریں چراتے ہوئے آہستگی سے بولی تھی۔

"کیوں، میرے بغیر دل اداس ہو رہا تھا۔" نچلا لب دانتوں تلے داب کر وہ اس کا دھلا دھلا، حجاب آلودہ گلاب چہرہ بغور تکنے لگا، پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولا۔

"ویسے بہت ظالم بیوی ہو تم۔ کتنی بے دردی سے بال کھینچے میرے۔ کچھ بھی خیال کر لیتیں کہ میں کتنے پیار سے"

"عباس پلیز..." اس کے ادھورے فقرے کی معنی خیزی اسے لجا کر خود میں سمٹنے

پھر مجبور کر گئی۔

"ہاں کیا بھی، بولو نا۔" عباس کے لبوں کی شوخ و شنگ مسکان اور چمکتی سیاہ آنکھوں کی معنی خیز چمک اریبہ کے حواس مختل کر رہی تھی۔ شرمندگی و حیا سے جلتے چہرے کے ساتھ اس نے حیا آمیز خفگی سے اسے گھورا۔

"اگر ایسی باتیں کریں گے تو میں چلی جاؤں گی۔"

"میری محبتوں، میرے بازوؤں کے حصار کو توڑ کر۔" اس کے گرد بانہوں کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے اس کا لہجہ بوجھل سرگوشی میں ڈھل گیا تھا۔ اریبہ اس کے رومینٹک موڈ سے خائف اپنا ہاتھ چھڑائی فاصلے پہ چلی گئی۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔

"میں پھر کہوں گا، بہت ظالم بیوی ہو تم۔ کم از کم محبت کا جواب ہی محبت سے دے دو۔" اریبہ منہ چڑاتی ڈریسنگ روم میں جا گھسی تھی۔

☆☆☆

عباس حیدر کو شادی کی وجہ سے ایک مہینے کی چھٹیاں ملی تھیں اور وہ اس ایک مہینے کو اریبہ کے ساتھ مکمل آزادی کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا جو ظاہری سی بات تھی کہ گھر میں نہیں مل سکتی تھی، اس لیے اس نے ہنی مون کا پروگرام سیٹ کر لیا تھا۔

"عباس! میں چاہتی تھی پہلے ولیمے کی تقریب ہو جاتی پھر ہنی مون وغیرہ بعد میں بھی ہو سکتے ہیں، وہ کہیں بھاگی نہیں جا رہی ہے۔ ساری عمر اسے تمہارے ساتھ سیریں کرنا ہے۔" ان کے چہرے پہ شکنوں کا جال بچھا تھا، غصہ اور خفگی۔

عباس نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا تھا، دراصل وہ ان کی ذہنی الجھن کو ناپنا چاہ رہا تھا۔

"اماں! ابھی کوئی پروگرام طے نہیں پایا۔ دعوت نامے نہیں چھپے۔ کوئی تیاری نہیں ہے۔ آپ ایسا کریں، یہ سب کچھ ارینج کریں۔ تب تک میں واپس آ جاؤں گا۔"

"تو یہ سب کرے گا کون؟" تائی اماں جھنجلا کر کہتیں اس کی بات قطع کر گئیں۔

"فراز اور عاصم بھائی ہیں یہاں، پھر بابا بھی، کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے۔ نو پرابلم۔ کیوں فراز؟" اس نے اماں کو مطمئن کرنے کے ساتھ فراز کی تائید چاہی، جو اس نے فی الفور سر ہلا کے کر دی۔ تائی اماں دل مسوس کر رہ گئیں۔

☆☆☆

طویل تھکا دینے والے سفر کے بعد بالآخر وہ رات کے پچھلے پہر گلگت آن پہنچے تھے۔ نگاہوں پہ سحر طاری کرتا ہوا گلگت شہر تمام تر خوبصورتی سمیٹے انہیں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ اریبہ اس قدر تھک چکی تھی کہ فوراً ہوٹل جانے کی رٹ لگا دی۔

''کول یار! تمہیں تو مجھ سے بھی زیادہ جلدی ہے" وہ آنکھ دبا کر جس شریر لہجے میں بولا تھا۔ وہ اریبہ کو کانوں کی لوؤں تلک سرخ کر گیا، وہ اس کے بازو پہ مکے برساتی اپنی خجالت مٹانے کی سعی کرنے لگی۔

پھر وہ ہوٹل میں آ کر بھی اس سے نگاہ چرائے رہی تھی۔ ہوٹل میں کمرہ بڑی دقتوں سے مل پایا تھا۔

''کیا ہے! اریبہ ضروری ہے کہ تم ہر جگہ ظالم بیوی کا ہی پارٹ نبھاؤ۔ کبھی کبھار رومینٹک ہونے میں کوئی حرج نہیں، شوہر ہوں تمہارا۔" اس کے کترا تے ہوئے انداز پہ چوٹ کرتے ہوئے وہ لگاوٹ بھرے لہجے میں بولا تو اریبہ کا چہرا حیا کی سرخی سے دہک گیا تھا۔

''پلیز سونے دیں مجھے۔ سچ بہت تھک گئی ہوں۔"

''اوہو یار! سو جانا ابھی کیا جلدی ہے۔"

اس کا نرم و نازک ہاتھ پکڑ کر وہ مکمل طور پہ اس کی سمت متوجہ تھا۔

اگلے روز اس کی آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی۔ فجر کی نماز قضا ہو جانے کے تاسف کے ساتھ وہ فریش ہونے کے بعد کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ رات کے وقت تو اندھیرے نے اس شہر کے قدرتی حسن کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا مگر اب وہ مبہوت سی ہو کر بل کھاتی ٹیڑھی میڑھی سڑکوں، فلک بوس پہاڑیوں، چمکیلی دھوپ اور نیلے آسمان کو تکتی رہ گئی۔ عباس دوپہر کے کھانے کے بعد کال فون پہ مصروف ہو گیا، جن وادیوں کی سیر پہ انہیں جانا تھا وہاں کے ریسٹ ہاؤسز میں اس نے بکنگ کروالی تھی تاکہ کل کی طرح رہائش کے پرابلم سے نہ گزرنا پڑے۔

☆☆☆

شام ڈھلتے ہی گلگت کی فضاؤں میں موجود خنکی بے تحاشا بڑھ گئی۔ عباس اسے چنار باغ کی طرف لے آیا تھا۔ مقامی کھیل پولو میں اس کی دلچسپی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی جبکہ اریبہ تھکن اور سردی کی وجہ سے بہت جلد بور ہو گئی۔

''واپس چلیں۔" اس کی ایک ہی رٹ تھی۔

''بازہ مارکیٹ چلو، وہیں سے تمہیں رونمائی گفٹ دلاتا ہوں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا تو اریبہ نے بھرپور خفگی سے اسے دیکھا تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں، مجھے بہت تھکن ہے۔ بس ہوٹل چلیں۔"

''یار اب آئے ہیں تو انجوائے کرو نا، پھر یہاں سے گھر والوں کے لیے گفٹس وغیرہ نہیں لوگی تو کتنا برا امیج پڑے گا تمہارا، اور میں نہیں چاہتا، کہ کوئی تمہیں برا کہے بائی دا وے اگر زیادہ تھکن ہے، تو میں اٹھا لیتا ہوں تمہیں نو پرابلم۔" بات کے اختتام پہ وہ شریر ہوا تھا۔ اریبہ جزبز ہوتی اس سے کئی قدم آگے چلنے لگی۔

بازہ مارکیٹ پہنچ کر اس کی یہ بے زاری خوشگوار حیرت میں ڈھل گئی۔ بہت صاف ستھری مارکیٹ تھی کشادہ دکانیں ہر قسم کے ساز و سامان سے بھری پڑی تھیں۔ عباس نے اسے بتایا کہ یہ سارا سامان چین سے منگوایا جاتا ہے۔ اریبہ نے وہاں سے اچھی خاصی شاپنگ کی تھی۔

''دھیان سے یار فوجی بندہ ہوں۔ یہ تمہارے بابا کا والٹ نہیں ہے۔ وہ تو انڈسٹریلسٹ ہیں، تمہارا شوہر ابھی اتنی تگڑی اسامی نہیں ہے۔"

اسے دھڑا دھڑ چیزیں خریدتے دیکھ کر اس نے دہائی دی تھی۔

تب اریبہ شاپنگ بیگز اسے تھماتی دکان سے نکل آئی۔

''اب صرف واپسی، ورنہ میں یہیں بیٹھ جاؤں گی۔"

اس نے روہانسی ہو کر کہا تھا۔ اس کے نازک پیر کئی جگہ سے فگار ہو چکے تھے۔

''او کے او کے چلو۔" وہ ہتھیار ڈال گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح عباس نے اسے جلدی جگا دیا تھا۔

''ناشتہ پیکنگ کر لو پھر ہمیں چلنا ہے۔" بھاپ اڑاتا چائے کا مگ اٹھائے، وہ کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ فضا میں تیرتا کہر موسم کی شدت کا پتہ دے رہا تھا۔

''عباس بہت سردی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے میں فریز ہو رہی ہوں۔"

اس کی آواز باقاعدہ کپکپا رہی تھی۔

"ہمارے پاس گرم کرنے کا فرسٹ کلاس انتظام ہے سوڈونٹ وری۔" چائے کا مگ اس کے لبوں سے لگا کر بیڈ پہ بٹھا دیا۔

"چائے پیو تم، میں رکھ لیتا ہوں جو تھوڑا بہت سامان ہے کم آن بیو! کیا ہو گیا یار! اٹس آل رائٹ" وہ مسکرا کر کہتا بیگ میں چیزیں بھرنے لگا، اریبہ کی آنکھیں جانے کس احساس سے بھیگ گئی تھیں۔ عباس حیدر کی توجہ، محبت، ایک انجانا سا خوف اس کے دل میں جگا جاتی، کچھ تھا ایسا، جو اسے بے چین کرنے لگا تھا، مگر کیا؟ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

ناشتے کے بغیر وہ اس ہوٹل سے نکلے تھے۔

"اریبہ" عباس کے پکارنے پہ وہ جو آنکھیں موندے کسی سوچ میں گم تھی۔ پل بھر کو چونکی۔

"یار! بریک فاسٹ لے لو، یا اپنے ہاتھ سے کھلاؤں۔" گرما گرم سینڈوچ اور چلی ساس اس کے سامنے تھا۔

پھر ناشتے کے دوران ہی وہ اسے بتا رہا تھا کہ پچھلی بار جب وہ یہاں آیا تھا تو کیلاش، چترال سے مستوج سرلاسپور، وہ شندور گوپس اور گاکوچ سے ہو کر گلگت گئے تھے لیکن بھنڈر ویلی میں نہ رک سکے۔

اب میں بھنڈر ویلی کے علاوہ یاسین ویلی بھی تمہیں دکھاؤں گا۔ پھر دیکھنا ہمارا ملک کس قدر حسین ہے۔

بات کرتے اس نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ اریبہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

"بند کریں اسے۔" عباس نے یونہی مسکراتے ہوئے سگریٹ کھڑکی کے رستے دور اچھال دیا۔

بھنڈر ویلی گلگت سے تقریباً دو سو پونے دو سو کلومیٹر کی دوری پہ تھا۔ اریبہ کو سفر کی طوالت کا اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ جانے کب یونہی بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ آنکھ کھلی تو اس کا سر عباس حیدر کے شانے پہ تھا اور عباس سیل فون پہ بات کرتے ہوئے اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"کیا کر رہی ہے؟ مسکرا رہی ہے اس قدر حسین ہم سفر کو دیکھ کر۔" وہ جانے کس سے کہہ رہا تھا۔ اریبہ جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی۔

پھر دوسری جانب کی بات سن کر کتنی دیر تک ہنستا رہا "کیسی ہیں بھئی بہت خوبصورت۔" اس کی آنکھیں شرارت پہ مائل تھیں۔ "مجھ سے چاہو تو پورا دیوان لکھوا لو ان پہ۔" وہ اب بھی ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اریبہ نے فون اس سے لیا دوسری طرف فراز تھا۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے موبائل اس کی جانب بڑھایا، تو عباس بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ نروس ہونے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" پلکیں جھکاتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا۔

"دیکھ رہا ہوں۔ میری ذرا سی بٹی ہوئی توجہ بھی تم سے برداشت نہیں ہوتی اور اگر جو کبھی میں سارے کا سارا بدل گیا تو تب تم کیا کرو گی۔"

"عباس!" اس کا دل اتھاہ گہرائیوں میں اتر گیا، یہی تو وہ خدشہ تھا۔ مگر وہ اپنے اس خدشے کو زبان نہ دے پائی تھی۔

"اریبہ" عباس اس کے چہرے پہ سجے خوف سے ٹھٹکا۔

"آپ ایسا کر سکتے ہیں عباس؟"

وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

"نہیں بالکل نہیں۔ بھلا کوئی اپنی زندگی سے بھی منہ موڑ سکتا ہے۔ اٹس جوک۔ اٹس اے اونلی جوک۔"

وہ اسے بازو کے حصار میں سمیٹتے ہوئے بولا، تو اریبہ کا خوف کے حصار میں سمٹا دل ذرا سا سنبھلا تھا۔

"ہائی داوے، سا آئی محبت کرنے لگی ہو مجھ سے۔"

وہ بہت توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اریبہ کے سرخ و سفید اجلے چہرے پہ شفق پھوٹ پڑی۔

"کم آن یار! منتظر ہوں تمہارے اقرار کا۔" اس کا محبتوں کے خمار سے گندھا لہجہ سرگوشی میں ڈھلا تھا۔ اریبہ کی سانسیں بے ہنگم ہونے لگیں۔ فطری حیا اس کے اس اقرار کی راہ میں حائل تھی۔

"زبان سے اقرار ضروری تو نہیں ہے۔ عباس پلیز، مجھے شرم آ رہی ہے۔" ہاتھوں میں چہرہ چھپایا تو کلائی کی چوڑیاں جلترنگ بجا اٹھیں۔

"لیکن شوہر سے محبت کا اظہار تو بری بات نہیں۔ بے چارے شوہر کو بھی تو خوش ہونے کا موقع ملنا چاہیے نا۔"

اب وہ اس کی کلائی میں پڑی چوڑیوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ اس کی کھنک اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ رہی تھی۔ بہت دلچسپ مشغلہ تھا۔

"بیوی محبت کا اظہار کرتے ہوئے اچھی نہیں لگتی عباس، یہ شوہر کا شعبہ ہے، اسے ہی سوٹ کرتا ہے۔"

وہ بہت خوبصورتی سے دامن بچا گئی تھی۔ عباس نے خفیف سا اسے گھورا مگر اس کی دبی دبی مسکان پر خود بھی ہنس پڑا تھا۔

☆☆☆

وادی اشکومن عباس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ اس نے وہاں بہت یادگار وقت بتایا تھا۔ واپسی پہ اس کا ارادہ اریبہ کو وادئ اشکومن لے جانے کا تھا۔ کوچ سے سفر کرتے ہوئے راستے کے انتہائی خوبصورت دلنشیں منظر اریبہ کو خوشی و سرشاری کے احساس سے لبریز کرتے رہے تھے۔

"تھینکس عباس! میں نے سوچا بھی نہیں تھا، کہ پاکستان اتنا خوبصورت ہوگا۔ اگر آپ مجھے نہ لے کر آتے تو۔"

"تو؟" وہ مسکرایا تھا، اس ادھوری بات پہ۔

"تو مجھے زندگی اتنی خوبصورت نہ لگتی، جتنی اب محسوس ہو رہی ہے۔"

"مجھے پالینے کے بعد بھی۔" وہ اس خوبصورت سفر کے دوران من پسند ساتھی کی قربت میں، اس کے منہ سے کوئی خوبصورت سی بات سننا چاہ رہا تھا، جو من آنگن میں پھول کھلا دے۔ مگر اریبہ کا گریز اس کے موڈ کو بری طرح سے بگاڑنے کا باعث بنا تھا، وہ کچھ چپ سا ہوا تھا۔ اریبہ نے اپنے دھیان میں اس خاموشی کو محسوس نہیں کیا۔ اس کی تمامتر توجہ دریائے گلگت کی جانب تھی جو سڑک کے ساتھ ساتھ گلگت کی جانب بہے جا رہا تھا مگر جلد ہی اس کی یہ محویت بکھر گئی۔ ان کا سفر اس کی مخالف سمت گوپس کی جانب تھا گوپس چاروں اطراف سے بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان گھری خوبصورت وادی۔ اطراف میں اتنی خوبصورتی بکھری تھی، کہ اسے اپنے پہلو میں موجود اپنے شریک حیات کی خفگی محسوس ہی نہ ہو

پائی۔ وہ گاہے بگاہے جوش مسرت سے لبریز ہو کر باہر کے مناظر کی سمت اس کی توجہ مبذول کراتی تو کبھی اس سے کچھ پوچھ لیتی۔ دریائے گلگت کے راستے میں دریا کے روپ دیکھ کر وہ ششدر تھی، وہی دریا جو گوپس تک جوشیلے انداز میں جھاگ اڑاتا شور مچاتا ہوا تھا لیکن گوپس سے آگے خلتی کے مقام پر دریائے غذر اپنی تیزی اور روانی سے تھک کر جیسے دم لینے، ستانے کے موڈ میں سبک خرام نظر آتا ہے۔ وہاں دریا نے گویا ایک جھیل کی شکل اختیار کر لی ہے۔ عباس نے اسے بتایا تھا کہ اس جھیل کو خلتی جھیل بھی کہتے ہیں اور یہاں کی ٹراؤٹ مچھلی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اریبہ کی دلچسپی دیکھتے ہوئے عباس نے وہیں کچھ دیر ٹھہرنے کا ارادہ کیا تھا، اور اسے ساتھ لیے جھیل کے کنارے ریسٹورنٹ میں چلا آیا۔ سڑک کے بائیں ہاتھ بلندی پر پی ٹی ڈی سی کا ہوٹل اپنی شاندار عمارت لیے کھڑا تھا۔ فرنچ فرائز کے ساتھ چائے اور ٹراؤٹ مچھلی انجوائے کرتے ہوئے اریبہ بات بے بات کھلکھلا کر اپنی بے پایاں خوشی و مسرت کا اظہار کرتی رہی تھی، پھر اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے کیمرا نکال کر عباس کے حوالے کرتے ہوئے تصاویر کی فرمائش کر دی تھی۔ عباس نے کھٹا کھٹ اس کے کئی پوز کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر دیے۔

"آپ بھی تو آئیں نا میرے ساتھ، آخر مما کو پتا چلنا چاہیے، ان کا داماد کس قدر گڈ لکنگ، اسمارٹ اور بیوٹی فل ہے۔"

اس کا ہاتھ پکڑ کر جو بات اس نے کہی تھی، عباس کا موڈ خود بخود ہی درست ہو گیا۔

☆☆☆

جس پل ان کی گاڑی ریسٹ ہاؤس کے گیٹ سے اندر داخل ہو کر چیڑ کے درختوں کے تلے رکی، اریبہ تھکن اور نیند سے نڈھال نظر آنے لگی تھی۔ ملازم نے ان کی رہنمائی کمرے تک کی تھی۔ اریبہ تو آتے ہی بستر میں گھسی تھی۔ عباس فریش ہو کے واش روم سے نکلا، تو ملازم چائے کے ساتھ منرل واٹر کی بوتلیں رکھ کے جا چکا تھا۔

"اریبہ! کچھ کھا لو پھر سو جانا۔" تولیے سے بال خشک کرتا، وہ اس کے پاس آیا تھا۔

"نہیں، مجھے بھوک نہیں۔" وہ خمار آلود سرخ آنکھیں پل بھر کو کھول کر بمشکل بولی تھی۔

"چائے تو پی لو پھر سو جانا۔" عباس نے زبردستی پکڑ کر اٹھایا تھا۔

''عباس پلیز، ڈونٹ ڈسٹرب می۔'' وہ بری طرح سے نیند میں ڈوبی تھی، اس کا ہاتھ ہٹا کر بولی، تو عباس کے چہرے پر محض ایک پل کو خفیف سا تاثر ابھرا تھا۔ اس خوبصورت سفر کے بعد وہ اریبہ سے بہت ساری باتیں کرنا چاہ رہا تھا۔

اس نے لب بھینچے، اور اٹھ کر اپنے لیے چائے بنانے لگا۔

''سر! کھانے میں کیا لیں گے؟'' وہ کھڑکی میں کھڑا باہر ڈھلتی شام کو دیکھ رہا تھا جب ملازم نے آ کر مداخلت کی۔

''آں ہاں، کچھ نہیں۔'' ایک نظر اریبہ کے مکمل طور پر نیند کی آغوش میں ڈوبے سراپے پر ڈال کر اس نے صاف انکار کرتے ہوئے ملازم کو چائے کے برتن اٹھانے کا اشارہ کرتے ہوئے رخ پھیر لیا۔ اگلی صبح وہ جیکٹ پہن کر کمرے سے باہر بالکونی میں جانے کے ارادے سے دروازے سے نکل رہا تھا۔ جب اریبہ کی آواز اس کے قدموں کی زنجیر بنی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، اس کا چہرہ کچھ سرخ تھا اور آنکھیں ابھی تک نیند کے خمار میں ڈوبی تھیں۔ چہرے کے اطراف بکھرے بالوں میں وہ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ عباس تمام تر خفگی سمیت نگاہ نہیں چرا پایا۔

''کہاں جا رہے ہیں، مجھے بھوک لگی ہے، کچھ منگوا لیں پلیز۔'' وہ اس پہ کمبل پھیلا رہا تھا، جب اریبہ نے نئی فرمائش کی۔ وہ اس سے اس کے رویے کی بدسلوکی کی وجہ سے خفا تھا اور اسے احساس تک نہ تھا۔

''تمہیں احساس تک نہیں، کہ رات میں تم سے کیا چاہ رہا تھا۔ تمہیں بس صرف اپنی تھکن اور نیند کا احساس تھا۔'' اس کا لہجہ سرد ہوا۔ ''راستے میں بھی تم مجھ سے زیادہ پہاڑوں، ندی نالوں اور کھیتوں کھلیانوں کو دیکھ کر خوش ہوتی رہیں۔ میری حیثیت تمہارے نزدیک کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔'' وہ پھٹ پڑا تھا۔ اریبہ حواس باختگی کے عالم میں چھلکتی آنکھیں لیے اس کا یہ یکا یک ابھرا روپ دیکھتی رہ گئی۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے عباس! یہ سب کچھ تو ثانوی ہے محض وقتی خوشی کا باعث۔ میرا اثاثہ تو آپ ہیں۔ میری دائمی خوشی دل کا قرار تو آپ کی ذات ہے۔ آپ کے ساتھ تو مجھے یہ سب کچھ حسین ترین محسوس ہوا ہے۔ مجھے واقعی آپ سے محبت ہے وہ تو صرف شرم کی وجہ سے میں کچھ کہہ نہیں پائی تھی۔''

سر اس کی پشت سے ٹکا کر اس نے پوری سچائی، پوری دیانت داری سے اعتراف کیا تھا۔ عباس ایک پل کو بالکل ساکت رہ گیا تھا۔ ایسا دل موہ لینے والا انداز اور اظہار اس کے اندر دور تک گلاب کھلا گیا۔ جھٹکے سے مڑا تھا۔ اریبہ گرتے گرتے اس کے بازوؤں میں سنبھلی تھی۔

''کیا کہا، ذرا پھر سے کہنا۔'' اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر لبوں کے گوشوں میں مچلتی مسکراہٹ لیے وہ مدھر سروں میں ہنسا، تو اریبہ نے چونک کر بغور اسے دیکھا پھر جیسے پل بھر میں اس کی شرارت سمجھتے ہوئے خفت وخجالت سے سرخ پڑتی اس کے سینے پر مکے مارنے لگی تھی۔

☆☆☆

یہ عباس حیدر کی خوبصورت رفاقت کا ہی احساس تھا، جو خوشی، ترنگ اور خوبصورتی، بن کر اس کے حسین چہرے کو حسین تر بنا گئی تھی۔ کچھ اس قدر کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ واپسی پہ بھابھی کے علاوہ فراز نے بھی جب بے اختیار تعریف کی، تو عباس جو دبے دبے انداز میں مسکرا رہا تھا، کھل کر ہنس پڑا۔

''ہماری قربت کا احساس ہے جناب اور نہ یہ اتنی حسین تو نہیں تھیں۔''

''تمہاری غیر موجودگی میں کئی بار چچی جان کا فون آیا، وہ تم سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔'' بھابھی کی بات پہ وہ کتنی دیر تک ساکت رہی تھی۔ مما کی ناراضی اور خفگی یقیناً ڈھلی تھی، تب ہی انہوں نے اسے فون کیا تھا۔ یہ سوچ اسے ہلکا پھلکا کر گئی تھی۔

''اگر تمہیں بات کرنا ہے تو میں نمبر ملا دوں۔'' جس وقت وہ سب گھر والوں کو ساتھ لائے گئے تحائف دے رہی تھی، عباس حیدر نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں، ٹھہریے، میں خود کر لوں گی۔'' اس نے یونہی مصروف رہ کر جواب دیا تھا۔ عباس حیدر سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ اریبہ نے تائی اماں کو قدرے خاموش محسوس کیا تھا۔ اس کے باوجود ان کی سلگتی نگاہوں کی تپش اس کے بلوریں چہرے کو جھلسا رہی تھی، جب ہی وہ گھبرا کر مزید وہاں رکنے کا ارادہ ترک کرتی اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب چلی آئی۔ لابی سے گزرتے ہوئے اس نے ٹیلی فون کی بیل سنی تھی۔ تب اسے مما کو فون کرنے کا خیال آیا تو ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا تھا۔

"ہیلو! السلام علیکم۔"

"کون اریبہ! آ گئیں اس اوباش کے ساتھ گل چھرے اڑا کر۔ کیسے مان لوں کہ تم اس روز رونے پیٹنے کا ڈرامہ نہیں کر رہی تھیں میرے سامنے۔" دوسری جانب مما تھیں، اور اس سے جس لہجے میں، جس انداز میں انہوں نے بات کی تھی، وہ اس قدر داو پرا تھا، اس قدر انجانا تھا کہ وہ جواب میں کچھ کہے بغیر شاکڈ رہ گئی۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ میری بیٹی ایسی کمزور نفس کی مالک ہوگی، کہ جیسا بھی گرا پڑا شوہر اسے جیسے بھی حالات میں ملے گا، وہ اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانا شروع کر دے گی۔"

ان کی زبان سے انگارے برس رہے تھے، جو اس کے تن بدن کو بری طرح جھلسا کے رکھ گئے۔ اسے یقین نہیں آیا یہ اس کی مما ہیں۔ پڑھی لکھی، مہذب، شائستہ اطوار جن کے اخلاق کی ایک دنیا گواہ تھی۔

"تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم واپس آ جاؤ، ورنہ وہاں آ کے میں تمہارے ساتھ جو سلوک کروں گی وہ کروں گی، تمہارے اس عباس حیدر کو بھی اس کی اوقات یاد دلاؤں گی۔ کیا سمجھ کر اس نے تم سے شادی کی۔ ایک ایک کو دیکھ لوں گی۔ اسے بھی اور اس کی ماں کو بھی۔ میرے خلاف سازش میں جو شریک ہے، میں سب کو اچھی طرح سے جانتی ہوں۔"

تحقیر آمیز لہجہ، جس میں آگ بھری تھی۔ انہوں نے اس کی ایک بات بھی سننا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اتنے دنوں کی جھنجھلاہٹ، بھرپور خفگی، غصہ، بے بسی مل کر انہیں نیم دیوانہ کر چکے تھے۔

"تمہارا باپ بھی یہی چاہتا تھا مگر میں نے بھی اس کی ناک سے لکیریں نہ کھنچوا دیں تو میرا نام بدل دینا۔ پورے خاندان میں ذلیل کر کے رکھ دیا ہے مجھے۔"

وہ ہذیانی انداز میں چلا رہی تھیں، اریبہ نے لب بھینچتے ہوئے ریسیور کو کریڈل پر ڈال دیا۔ مزید سننے کی اس میں تاب نہیں تھی، اسے مما کی سوچ پہ افسوس تھا، جو کچھ انہوں نے عباس کے لیے کہا تھا، وہ اس کے دل میں ان کی طرف سے پہلی بدگمانی بن کر کسی پھانس کی صورت میں گڑ گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تو بے حد مضطرب تھی۔ عباس نہیں تھا، یہ بھی غنیمت تھا، ورنہ اسکی حالت سے جانے کیا سمجھتا۔

☆☆☆

کسی سے تم پیار کرو تو پھر اظہار کرو
کہیں نہ پھر دیر ہو جائے کہیں نہ پھر دیر ہو جائے

دلہن کا ہوش اڑاتا ہوا روپ لیے وہ عباس حیدر کے پہلو میں موجود تھی، جب فراز نے ڈیک پہ گیت فل والیوم میں لگایا۔ عباس نے جتائی نگاہ اس پر ڈالی۔

"سن رہی ہیں محترمہ! کہیں نہ پھر دیر ہو جائے۔" وہ اس کے کندھے سے اپنا کندھا ٹکراتا ہوا گنگنایا، تو اریبہ نے بوجھل پلکیں اٹھا کر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کر تو چکی ہوں اور کیا چاہتے ہیں؟" اس کے لبوں پر شرمیلی مسکان تھی۔

"نو میم! یہ کریڈٹ کیپٹن عباس حیدر کے لیے رہنے دیں۔ آپ نے نہیں کیا۔ میں کروا چکا ہوں۔ زبردستی، اور محبت میں کیا صرف ایک مرتبہ اظہار کیا جاتا ہے۔ نہیں بالکل نہیں۔ اپنے اسجد اسلام امجد پتہ ہے کیا کہتے ہیں۔"

اس پہ جھکا وہ مخمور نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

محبت کی طبیعت میں یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے۔
یہ جتنی بھی پرانی، جتنی بھی مضبوط ہو جائے
اسے تائید تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے
یقین کی آخری حد تک دلوں میں لہلہاتی ہو، نگاہوں سے ٹپکتی ہو
ہزاروں طرح کے حسین دلکش ہالے بناتی ہو
اسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہے
کہو مجھ سے محبت ہے، تمہیں مجھ سے محبت ہے، کہو نا۔"

اریبہ محض اسے چڑانے کو انکاری ہوگئی تھی۔

"نہیں کہوں گی۔" پھر اس کے گھورنے پہ اس کی ہنسی کی جلترنگ اسٹیج سے نیچے کھڑی تائی اماں کو بری طرح سے چونکا گئی۔ اریبہ نے ان کی نگاہوں کی تپش کو محسوس کیا تھا، اور اپنے اندر عجیب سرد سا احساس اترتا پایا تھا۔

"اریبہ! تمہارا فون ہے، ممی بات کرنا چاہ رہی ہیں۔" بھابی اسٹیج پہ آ کر اسے چونکا گئی تھی۔

"مم... مگر اس وقت... میں کیسے بات کر سکتی ہوں۔" عباس حیدر کو دیکھتے

ہوئے اس نے کتراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں نے بہت کہا تھا، تایا ابا انہیں، کہ اس وقت تم دلہن بنی اسٹیج پر ہو تو ٹینشن ہو رہا ہے مگر......"

"کوئی بات نہیں اریبہ! کر لو بات جا کے۔"

عباس حیدر کی مداخلت پہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بھاری لباس سنبھالتی بھابی کے سہارے اسٹیج سے اتر کر ٹیلی فون اسٹینڈ تک چلی آئی۔

"اریبہ...... سویٹ ہارٹ...... کیسی ہو، آئی مس یو ڈارلنگ، ریئلی مس یو۔"

اس کی ہیلو کے جواب میں مما بے تابانہ، والہانہ انداز میں بولتی چلی گئی تھیں۔ اریبہ کو اپنی سماعتوں پہ شبے کا گمان ہوا۔ یہ مما تھیں! اسے حیرت کی زیادتی سے سکتہ ہونے لگا۔

"مما کی بات پہ خفا ہو جاتی! سو سوری، غصہ آ گیا تھا۔ چلو میں ایکسکیوز کر لیتی ہوں۔ ہاؤ آر یو سویٹ ہارٹ۔" وہ لگاوٹ بھرے انداز میں گویا تھیں۔ اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھٹی رہ گئی تھیں۔

"بات نہیں کرو گی مما سے بیٹا!" وہ مسلسل پکار رہی تھیں جب اسے بمشکل خود کو کمپوز کر کے ان کی بات کا جواب دینا پڑا۔ چند منٹ بات کرنے کے بعد انہوں نے اسے آرام کا مشورہ دینے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔ وہ پلٹی تو عباس حیدر کے آہنی وجود سے ٹکراتی بچی تھی۔

"چچا جان کا موڈ کیسا تھا؟" ہاتھ میں موجود پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے، وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ اریبہ کے چہرے پہ عجیب سا تاثر بکھر گیا۔

"واٹ از دس؟" وہ خود کچھ نہیں سمجھ پائی تھی، اسے کیا بتاتی، جب ہی اس کے بڑھائے پیکٹ کی سمت متوجہ ہو گئی جس کی خوبصورتی سے کی گئی پیکنگ اس کی توجہ کھینچ چکی تھی۔ "یو کے سے چچا جان نے بھجوایا ہے۔ جو کچھ بھی ہے بہرحال تمہارے لیے ہے۔"

عباس نے آہستگی سے بتایا۔

"پہلے اندر چلو پھر دیکھ لینا۔" عباس نے اسے ریپر ہٹاتے دیکھ کر ٹوکا۔ اس کے وزنی لباس کی وجہ سے اسے کھڑے رہنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

"ایک منٹ عباس پلیز، مجھے دیکھنے تو دیں۔ پاپا نے کیا بھیجا ہے میرے لیے۔"

اس کے معصوم سے انداز میں حد درجہ بے تابی اور خوشی تھی، جسے دیکھتے ہوئے عباس بے ساختہ مسکرایا تھا۔ ریپنگ ہٹتے ہی اندر سے جیولری بکس نمودار ہوا تھا۔ جسے کھولتے ہی اس کی نگاہیں چندھیا سی گئی تھیں۔ بیش قیمت جڑاؤ نیکلس سیٹ جس میں جڑے یاقوت شعاعیں بکھیر رہے تھے۔

"ہاؤ امیزنگ۔" اس نے بے اختیار خوش ہو کر نیکلس کو چھوا تھا۔

"کیسا ہے؟" اب وہ دمکتی ہوئی نگاہوں سے عباس حیدر کو دیکھ رہی تھی۔

"فنٹاسٹک۔ آف کورس۔ یہ تمہارے پاپا ہی تمہیں گفٹ کر سکتے تھے، میں نہیں۔ اس کی قیمت میں کہاں افورڈ کر پاتا۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

"دکھاؤ، کیا ہے یہ؟" تائی اماں کب وہاں آئی تھیں، دونوں کو ہی خبر نہ ہو سکی۔ وہ تو جب انہوں نے بکس پہ جھپٹا مارا تو وہ دونوں چونکے تھے۔ اریبہ تو دق سی رہ گئی تھی، انہیں چیل کی مانند زیور پہ جھپٹے دیکھ کر۔

"اماں! یہ اریبہ کا ہے۔ پلیز اسے دے دیں۔"

عباس کے چہرے پہ عجیب سا تناؤ تھا۔

"اتنا مہنگا اور قیمتی زیور یہ کہاں سنبھال پائے گی۔ میں حفاظت سے رکھوں گی۔" انہوں نے ڈبہ بغل میں دابتے ہوئے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔

"مگر اماں! یہ اس کا زیور ہے، یہ خود اچھی طرح......"

"بس چپ کرو تم، پورے کے پورے زن مرید ہو گئے ہو۔ شرم آتی ہے مجھے، تمہارا یہ روپ دیکھ کر۔" وہ حلق کے بل چیخی تھیں۔ اریبہ خائف سی ہو گئی، جب ہی عباس کے بازو پہ ہاتھ رکھتے ہوئے لجاجت سے بولی۔

"اٹس آل رائٹ عباس! ڈونٹ مائنڈ اٹ......"

"اے چھپا کیا گٹ پٹ کر رہی ہے۔ ورغلا رہی ہے میرے بیٹے کو میرے خلاف۔ میں تیرا چوکنا توڑ دوں گی۔" تائی اماں سرخ دہکتی آنکھیں نکال کر زخمی ناگن کی طرح اس پہ پھنکاریں تو اریبہ بری طرح سے سراسیمہ ہوئی وہ قدم پیچھے ہو گئی۔

"دس از ٹو مچ اماں! یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟" عباس ماں کے طرز عمل پہ حقیقتاً میں گھبرا اٹھا اگر بروقت وہ دونوں کے درمیان حائل نہ ہو جاتا تو تائی اماں یقیناً اس کا کچ کچ

منہ نوچ لیتیں۔

یہ بھی شکر تھا کہ مہمان سارے ہی تقریباً لان میں تھے کہ وہیں اس تقریب کا سارا انتظام تھا۔ یوں یہ تماشا کسی کی نگاہوں میں نہیں آیا۔ اریبہ غم و غصے، حیرت اور بے بسی کے شدید احساس سے مغلوب ہوتی اندر بھاگ گئی تھی۔

☆☆☆

عباس حیدر نے اس سے معذرت کرنے کے بعد اسے منا بھی لیا تھا، وہ اس سے خفا بھی نہیں تھی۔ عباس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اماں سے اس کا وہی نہیں، اس کے علاوہ جو جیولری تھی، وہ بھی ضرور لے دے گا۔

''ہاں چاچو نے ایک نہیں، چار سیٹ بھجوائے تھے، پہلے ہی اماں نے رکھ لیے تھے۔ یہ ایک سیٹ میں ان کی نگاہ سے بچا کے لایا تھا مگر......''

وہ خجالت سے نظریں چراتے ہوئے بولا تھا اور وہ اسے شرمندہ کرنا نہیں چاہتی تھی جب ہی اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کے رسانیت سے بولی۔

''فارگیٹ اٹ عباس! مجھے ہر شے سے بڑھ کر صرف آپ کی ذات عزیز ہے۔ یہ سب تو مادی چیزیں ہیں۔ دوبارہ بھی مل سکتی ہیں، مگر آپ کا اعتماد، مان اور محبت اگر مجھ سے چھن گئی تو۔''

اس کی آنکھیں جانے کیوں بھیگی تھیں، عباس نے اس کے گرد بازو حائل کر دیا تھا۔

''تم خوف زدہ کیوں ہو اریبہ! میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ تمہارے پاس رہوں گا ہمیشہ۔ ڈونٹ وری۔''

تائی اماں نے صرف لالچ میں اندھے ہو کر اپنے بیٹے کا نکاح اس سے کیا تھا، مگر عباس کی محبت اگلی توجہ ان کی برداشت کا امتحان تھی۔ اگر یہیں تک بات رہتی تو بھی وہ اتنی ہراساں نہ ہوتی۔ اگر جو تائی اماں کی آنکھوں میں وہ خبیث سی شاطرانہ چمک نہ دیکھ لیتی۔ اس پہ ستم مما کی ڈپلومیسی تھی۔ کل رات جب عباس اپنے کسی دوست سے ملنے گیا تھا تب ایک بار پھر ابوظہبی سے فون آ گیا تھا۔ پہلے پاپا سے بات کی تھی، ان کا مشفق لہجہ اس قدر طمانیت لیے ہوا تھا کہ وہ پہلی بار عباس کو پانے کے بعد ڈھنگ سے خوش ہو پائی تھی کہ پاپا نے عباس کے ساتھ اس کا مضبوط رشتہ جڑ جانے پہ بے پناہ خوشی کا اظہار کرنے کے بعد بے

شمار دعاؤں سے نوازا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ دل سے اس رشتے کے حامی تھے مگر اس کی مما کی وجہ سے چپ تھے۔ پاپا کے فون بند کرنے سے پہلے مما آ گئی تھیں۔ وہ اس وقت کسی پارٹی سے لوٹی تھیں۔ پاپا نے انہیں دیکھ کر ریسیور انہیں تھما دیا تھا۔

''اریبہ۔''

''جی مما...... کیسی ہیں آپ......؟'' اس کے لہجے میں واضح کھنک تھی۔

''بس بس، زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے باپ کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بڑھاپا ہے نا، شاید اس لیے، مگر اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ انسان یوں سٹھیا جائے۔ ارے بیٹی کو بیاہتے ہوئے اپنے اسٹیٹس کا ہی خیال کر لیا ہوتا۔ نظریں نہیں ملا پا رہی ہوں میں اپنے بھائی بھاوجوں سے۔ اتنا گر گیا ہمارا معیار کہ اس عباس حیدر جیسے''

''اسٹاپ اٹ مما! بی ہیو یور سیلف۔'' اس کا ضبط چھلکا تھا تب وہ کھنچے ہوئے لہجے میں انہیں ٹوک گئی تھی۔

''شٹ اپ اریبہ! بہتری اسی میں ہے کہ تم یہاں لوٹ آؤ، ورنہ میں بہت بری طرح پیش آؤں گی۔ تم جانتی نہیں ہو مجھے۔'' وہ زخمی ناگن کی مانند پھنکاری تھیں۔

''کیا کریں گی آپ، کیسی ماں ہیں کہ بیٹی کو خوش نہیں دیکھ سکتیں۔ مائنڈ اٹ مما! میں عباس کے ساتھ بھاگی نہیں ہوں، بزرگوں کی موجودگی میں نکاح ہوا ہے۔'' وہ بے بسی سے کہتے رو پڑی تھی۔

اسے حیرت تھی، وہ اپنی ماں کو آج تک نہ سمجھ پائی۔ مما نے ولیمہ کے دن اس سے اچھی طرح بات کی، تو اس کے اندر موجود بدگمانی ڈھل گئی تھی۔ وہ سمجھی تھی۔ انہوں نے سمجھوتا کر لیا، مگر یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ انہوں نے باقاعدہ منصوبہ تیار کیا تھا۔ اب وہ اسے اس منصوبے میں شریک ہونے پر اکسا رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں، اریبہ عباس حیدر کے ذریعے تائی اماں سے کسی طرح بھی پاسپورٹ نکلوا کر واپس آ جائے۔ وہ ہر صورت اس کی شادی اپنے بھتیجے سے کرنا چاہ رہی تھیں۔ مما پاپا کے درمیان جو بچپن سے سرد جنگ وہ دیکھتی چلی آ رہی تھی، وہ اب بری طرح سے اس کی زندگی بگاڑنے کے در پے تھی۔ پاپا کے علاوہ اریبہ کے قسمیں کھا کر یقین دلانے پر بھی وہ کسی طرح یہ ماننے کو تیار نہ تھیں کہ پاپا اس کے نکاح کی سازش میں شریک نہ تھے۔ انہوں نے یہ ٹھان لی تھی کہ انہیں ہر صورت پاپا کو

نیچا دکھانا ہے۔اس کے لیے چاہے کچھ بھی ہو، وہ کر گزریں گی۔ یہ دھمکی انہوں نے اریبہ کو صاف صاف دی تھی، اور فون بند کر دیا تھا۔اریبہ کا دل سوکھے پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔ کچھ ہونے کا وہم اسے ہر پل مضطرب رکھنے لگا تھا۔

"تمہارا فون ہے۔" بھابھی کی اطلاع نے اس کے چہرے پہ جیسے سرسوں بکھیر دی۔ عباس نے سرسری سے انداز میں اس کا چہرہ دیکھا تھا، مگر اسے یوں سراسیمہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"انی پرابلم اریبہ؟" اور اگر وہ اس سے پرابلم شیئر کر لیتی، تو اتنا بڑا بگاڑ کبھی نہ ہوتا مگر وہ چھوٹی سی اپنی معصوم سی لڑکی، کھو دینے کے احساس سے ہراساں صاف مکر گئی تھی۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" بجبراً مسکراتی ہوئی وہ اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔

"عقل کچھ ٹھکانے آئی یا نہیں۔" مما نے چھوٹتے ہی نشتر چبھویا تھا۔

"مما! جو آپ چاہتی ہیں، میں وہ نہیں کر سکتی۔"

اس نے بھی صاف اور دوٹوک انداز میں بات کی تھی۔

"اچھا۔" وہ طنزاً ہنسی تھیں، پھر اسے پکار کر بولیں۔ "بہتر تھا اریبہ! تم بات مان لیتیں۔ اب انکار کرو، اس کا جو میں کروں گی۔" انہوں نے خوفناک لہجے میں کہہ کر لائن کاٹ دی تھی۔ اریبہ حواس باختہ ہو کر انہیں پکارتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

اس روز عباس کو ڈیوٹی پر واپس جانا تھا۔ وہ اریبہ کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر اماں کسی طور راضی نہیں تھیں۔ وہ بہت جھنجلایا ہوا سا ان کے کمرے سے نکلا تھا۔ لاؤنج میں پڑا فون زور و شور سے چیخ رہا تھا۔

"ہیلو، کون.... اریبہ؟" اس کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے مما کی بے صبری آواز ابھری تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دے کر اریبہ کو بلاتا، وہ بیچ بھی نہ رکنے کے ارادے سے کسی ریڈیو کی طرح شروع ہوئی تھیں۔

"اریبہ جی! کب تک لعنت بھیجو گی، عباس حیدر جیسے فقیر پر۔ حد ہوتی ہے جانو کسی کام کو لٹکانے کی۔ تمہیں پتہ ہے، یہاں فہد روز میرا سر کھاتا ہے۔ تم نے بھی تو اسے انکار کی سولی پر لٹکایا ہوا ہے۔ یہ کیوں کہا تھا اسے کہ بہت جلد عباس سے ڈائیورس لے کر یہاں پہنچ

رہی ہو۔ جانتی تو ہو، وہ کس قدر دیوانہ ہے تمہارا، پھر تمہارے ساتھ بِتا وقت بھی تو اسے بہت تڑپاتا ہے نا۔ پلیز کم بیک جانو! عباس حیدر کو محبت کا چیک دینے کیا ضرورت تھی۔ میں نے تو کہا تھا۔ پیار بھرے طریقے سے اس سے طلاق مانگ لو۔ یہ ایشیائی مرد بہت غصیلے ہوتے ہیں۔ عورت کے ایک بار طلاق مانگنے پہ غصے میں آ کر ہر رشتہ تعلق توڑ ڈالتے ہیں۔ تم پتہ نہیں کیوں، بے چارے کو اتنے عرصے سے الو بنا رہی ہو۔ ویسے اگر پاسپورٹ حاصل کرنے کے اس ڈرامے کو طول دینا پڑ رہا ہے تو رہنے دو بیٹا، فہد ہے نا، تمہیں نیا پاسپورٹ دلا دے گا۔ وہ تو تمہارے ایک اشارے پہ اپنا سب کچھ لٹانے پہ تیار رہتا ہے۔ جانتی تو ہو تم۔"

عباس حیدر سکتے کے عالم میں انکشاف کی زد پہ تھا۔ غیر یقینی سی غیر یقینی تھی۔ وہ پوری جان سے ہل کر رہ گیا تھا۔ اس کے اندر جیسے توڑ پھوڑ کا عمل کبھی نہ ختم ہونے کے لیے شروع ہوا تھا۔ چہرے پہ زلزلے کے آثار لیے جیسے پتھر کا ہو چکا تھا۔ اپنے دھیان میں اس طرف آتی اریبہ اس کا یہ غیر معمولی انداز دیکھ کر چونکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود ریسیور دیکھ کر اسے بہت شدتوں سے بہت کچھ غلط ہونے کا احساس جاگا تھا۔

"عبا....س....." اس کا نام ٹوٹ کر اس کے لبوں سے پھسلا تھا۔ عباس حیدر کے چہرے پہ موجود سرخی اور آنکھوں سے چھلکتا ہوا خون اسے سہما کے رکھ گیا۔

"ک.....کس کا فون تھا؟ آپ کچھ بولتے کیوں نہیں۔"

درمیانی فاصلہ گھٹا کر اس کے قریب آتی ہوئی، وہ اس کے بازو پہ ہاتھ رکھ کر جھنجوڑ کر وحشت زدہ انداز میں چلائی تھی۔ عباس نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جو کچھ اسے نظر آیا، وہ پل بھر میں اسے دہشت کے حصار میں جکڑ گیا۔ اس کا ہراساں و دہشت زدہ دل سکڑ سمٹ کر سینے کے اور کسی کونے کھدرے میں جا چھپا۔ اس نے پل بھر میں اپنی تمام قوتوں کو بے کار ہوتا محسوس کیا۔ عباس حیدر کے بھینچے ہوئے جبڑے اس کے ضبط اور برداشت کے ختم ہو جانے کے گواہ تھے۔ بنا کچھ کہے اس نے ہراساں، وسراسیمہ، نظر آتی اریبہ کا ہاتھ دبوچنے کے انداز میں پکڑا، اور اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا بیڈ روم میں لاتے ہوئے بیڈ پر پٹخ دیا۔

"مجھ سے پوچھ رہی ہو، کس کا فون تھا۔ حالانکہ تمہیں بہت اچھی طرح اندازہ ہونا چاہیے کہ کس کا فون ہو سکتا ہے۔"

اس کا سرد لہجہ ہر قسم کی محبت سے عاری بے حد اجنبیت سموئے اریبہ کو نیم جان کر گیا۔ اسے یہ سمجھنے میں ایک پل نہیں لگا تھا کہ فون کس کا ہو سکتا ہے۔ اسے صبا کی دھمکی یاد آئی تو دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

"میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ فہد کون ہے، کیونکہ وہ جو کوئی بھی ہے، اسی کی وجہ سے تم نے میرے ساتھ یہ گھناؤنا انتہائی گراہوا ڈرامہ کھیلا۔ تمہیں میرا ساتھ گوارا نہیں تھا۔ مجھ سے کہا ہوتا۔"

"عباس......" وہ منہ پہ ہاتھ رکھے چیخی تھی۔

"چیخو مت۔" وہ وحشت زدہ انداز میں غرایا۔ اس کے تاثرات میں خوف اور بے یقینی کی جگہ بے بسی اور لاچاری نے لے لی۔ "تمہیں وہ سب کچھ مل جائے گا۔ اریبہ علی شیر جو تم مجھ سے چاہتی تھیں، مگر ایک بات یاد رکھنا، میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔ تو، شور۔ فہد کو پانے کی خاطر، تم نے میری محبت کا مضحکہ اڑایا۔ تم ساری عمر ایڑیاں بھی رگڑو تو میں تمہیں اس سے ملنے نہیں دوں گا۔ اسے میری ضد سمجھو یا انتقام، تمہاری مرضی ہے۔" اس کی خوفزدہ آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہتا، وہ جھٹکے سے پلٹ کر چلا گیا۔ اریبہ گھٹنوں کے بل وہیں کارپٹ پر گری تھی۔ بے بسی کے آنسو بہت تیزی سے اس کا چہرہ بھگوتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

اس کا پورا وجود دہکتے انگاروں پہ لوٹ رہا تھا۔ اس نے صبا سے فون پر کے شدتوں سے روتے ہوئے ان کی منتیں کی تھیں، کہ انہوں نے عباس حیدر سے جو بھی کہا ہے، وہ اس کی غلط فہمی کو دور کر دیں۔ وہ ان سے اپنی خوشیوں کی بھیک مانگتی رہی تھی، مگر صبا کو اس پہ ترس نہیں آیا۔ الٹا وہ معاملے کو اس حد تک اپنے حق میں جاتا دیکھ کر مسرت و شادمانی سے چور ہذیانی قہقہے لگاتی رہی تھیں۔

"تم بچی ہو اریبہ! ابھی نا سمجھ ہو۔ یہاں آؤ گی تو عباس تمہیں بھول جائے گا پھر تم دیکھنا فہد کے سنگ زندگی کتنی حسین ہوگی۔ تب تم اپنی اس حماقت کو یاد کر کے ہنسو گی۔"

اور اریبہ نے ان کی باتوں پہ وحشت زدہ ہو کے فون بند کر دیا تھا۔ اب آخری آس عباس حیدر ہی تھا، وہ اس کی منت کرے گی، وہ اسے منالے گی۔ اس نے بہت بے چینی سے ٹہلتے ہوئے سوچا تھا۔ اسے گھر سے نکلے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ جانے کہاں تھا جس موڑ

میں وہ گھر سے نکلا تھا، اسے اب اس کی فکر لاحق ہونے لگی تھی اور جب وہ صبا کی انتہاؤں پہ تھی، وہ آ گیا تھا۔

"عباس!" وہ بھاگ کر اس تک پہنچی تھی۔

"ڈونٹ ٹچ می۔" اس کے انداز میں اس قدر حقارت اور تحقیر تھی، کہ اریبہ ایک پل کو شرمندگی کی اتھاہ میں جا گری، مگر یہ موقع اپنی خودداری بچانے کا نہیں تھا، یہ موقع تو ڈوبتی ہوئی ناؤ کو تلاطم خیز موجوں سے بچا کر کنارے پہ کھینچ لانے کا تھا۔

"یہ اس گھر کے ڈاکیومنٹس ہیں۔ زیورات اور پاسپورٹ۔ چاہو تو چیک کر کے تسلی کر لو۔ یہی چاہیے تھا نا تمہیں۔"

اس کا لہجہ از حد بے گانگی لیے تھا۔ چہرے پہ سنجیدگی تھی۔ ایسی دہلا دینے والی سنجیدگی، جس سے اریبہ کو خوف محسوس ہوا تھا۔ اسے منانے، اپنی صفائی پیش کرنے کے تمام ارادے ریتیلی دیوار کی مانند بکھر گئے۔ وہ وحشت زدہ سی ہو کر زور زور سے رونے لگی تھی۔

"مجھے یہ سب نہیں چاہیے عباس! مجھے یہ نہیں لینا۔" اس نے زور سے چکراتے سر کو جھٹکتے ہوئے بلک کر کہا تھا۔ ایک ایک کر کے گھر کے تمام افراد وہاں جمع ہوئے تھے اور بالکل خاموش تماشائی بنے صورت حال کو سمجھنے کی سعی کر رہے تھے۔ عباس حیدر کے پتھر یلے چہرے پہ جو سختی تھی، وہ کسی کو بھی آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔

"میری بات تو سنیں عباس! صبا نے آپ سے جھوٹ بولا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے ایک موقع تو دیں، پھر بے شک مجھے جو مرضی سزا دے لیں۔"

وہ کسی کی بھی پروا کیے بغیر اس کے پاس آ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑگڑائی تھی۔

"یہ تمہارا ٹکٹ ہے، تمہیں ابھی اور اسی وقت جانا ہے۔ سنا تم نے۔" وہ جیسے کچھ نہ سننے کی قسم کھا چکا تھا۔

"مجھے نہیں جانا۔ میں یہ ٹکٹ بھی پھاڑ دوں گی، آپ میری بات کیوں نہیں سنتے۔"

اس نے تائی اماں کے چہرے پہ اندلی طنز سے بھرپور مسکراہٹ دیکھ لی تھی اور یہی مسکان اسے گویا جنونی بنا گئی تھی۔

"میں بے قصور ہوں عباس! ٹرسٹ می۔ فار گاڈ سیک عباس! میں بے قصور ہوں۔"

وہ پاگلوں کی طرح چیخی تھی۔

"مجھے آپ سے محبت ہے، صرف آپ سے۔ یوں مت کریں عباس! پلیز مجھے معاف کر دیں۔"

وہ اس کے پاس آ کر اس کے بازو پہ ہاتھ رکھ کر کہہ رہی تھی۔ جب عباس حیدر کا وزنی ہاتھ اس کے چہرے پر بھرپور انداز میں پڑا تھا۔

"سنائی نہیں دیا تمہیں، کیوں نہیں سمجھ جاتیں کہ میں تمہاری صورت تک دیکھنا نہیں چاہتا۔ نہیں چاہئیں تمہاری وضاحتیں، دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ اور کیا سننا چاہتی ہو تم۔ میں تمہارے جیسی گھٹیا عورت کو ایک پل بھی برداشت نہیں کر سکتا۔" اس کے چہرے پر موجود تاثرات میں اتنی حقارت اس قدر تضحیک تھی، کہ اریبہ پتھر ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں موجود آنسو بھی ٹھٹھر گئے تھے۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ اس پہ ہاتھ اٹھا چکا تھا تو اس کا مطلب تھا اس کے دل میں اس کے لیے واقعی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ اپنی عزت نفس کو اس سے زیادہ نہیں کچل سکتی تھی۔

☆☆☆

ایک مکمل سناٹا اس کے اندر آن ٹھہرا تھا۔ عباس حیدر پہ جو مان تھا، بھروسہ تھا، وہ اس کی نگاہوں سے چھلکتی نفرت اور اٹھے ہوئے ہاتھ کی انتہا پسندی کے سامنے کب کا ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا تھا۔ اسے ایسی چپ لگی تھی جو فراز کے گڑگڑا کر رو دینے، بھابھی کے گلے لگا کر رونے پہ بھی نہیں ٹوٹی۔ اس نے صرف اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ لیا تھا۔ مکان کے کاغذات اور زیورات کے ڈبوں کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ پہلے وہ کسی صورت یہاں سے جانے پہ آمادہ نہیں تھی، مگر عباس کے رویے نے اسے جس ذہنی کرب میں مبتلا کیا تھا جو شاک لگایا تھا جس انداز میں اس کی کردار کشی کی تھی، اس کے بعد وہ کسی طور پہ یہاں رکنے پہ آمادہ نہیں تھی۔ بھابھی کے اکسانے پہ بھی اس نے عباس حیدر کو اپنی پریگننسی کے متعلق نہیں بتایا۔ عباس حیدر اسے اپنا فیصلہ سنا چکا تھا پھر وہ کیوں گڑگڑاتی۔ اس نے چپ چاپ ہر الزام سہہ کر اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی، اللہ اس کے لیے بہتر فیصلہ کرے گا۔

دادو اس سارے قصے سے یکسر لاعلم تھیں۔ وہ صرف ان سے الوداعی سلام کرنے آئی تو تب بھی اس کی خشک پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک آنسو نہیں ٹپکا۔ دادو پوچھتی رہ

گئیں۔ وہ کہاں جا رہی ہے، مگر اس کے لب جیسے سل گئے تھے پھر وہ چلی آئی تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاکستان کو اللہ حافظ کہہ کر۔ مما اس کا اجاڑ ویران روپ دیکھ لینے کے بعد بھی اپنی فتح پہ شاداں فرحاں رہیں، مگر اس کی پریگننسی کی خبر نے ان کی یہ خوشی غارت کر دی۔

ان جیسی ہر مقام پہ جیتنے کا دعوا کرنے والی عورت نے اس کے ابارشن کا فیصلہ کر لیا، تب اریبہ جو ان کے اتنے بڑے ستم کو سہہ کر بھی خاموش رہی تھی، وہ دوبدو مقابلے پر اتر آئی۔ اس نے صاف لفظوں میں انکار کیا تھا۔ عباس حیدر کی اس واحد نشانی کو ضائع کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، جب پاپا کو پتہ چلا تھا تو، تب انہیں پہلا ہارٹ اٹیک ہوا۔ اریبہ کی طرح انہیں بھی جیسے چپ لگ گئی۔ اپنے تئیں انہوں نے عباس حیدر سے رابطہ کرنے اور اریبہ کی بے گناہی ثابت کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کچھ سننے پہ آمادہ نہیں تھا۔ جس روز اریبہ نے سلمان حیدر کو جنم دیا، اس روز وہ ایک بار پھر ضبط کھو گئی تھی۔ اریبہ کے لبوں پہ مسکراہٹ بھی دوبارہ اس تابناکی سے نہ کھلی جو کبھی اس کی پہچان بن چکی تھی۔

☆☆☆

وہ کچھ سنتا تو میں کہتا مجھے کچھ اور کہنا تھا
وہ پل بھر کو جو رک جاتا مجھے کچھ اور کہنا تھا
غلط فہمی نے باتوں کو بڑھا ڈالا یونہی ورنہ
کہا کچھ تھا وہ کچھ سمجھا مجھے کچھ اور کہنا تھا
کہاں اس نے سنی میری سنی بھی ان سنی کر دی
مجھے کچھ اور کرنا تھا مجھے کچھ اور کہنا تھا

فجر کی اذان کی آواز اس کی سماعتوں میں اتری، تب وہ چونکتے ہوئے اپنے خیالوں کے بھنور سے ابھری تھی۔ رات بھر ایک ہی زاویے پر بیٹھے رہنے سے اس کے جسم میں اکڑاؤ کی سی کیفیت تھی۔ پورا وجود جیسے سن ہو گیا تھا، بمشکل خود کو گھسیٹ کر وہ بیڈ تک آئی تھی اور اپنے آپ کو بستر پہ گرا دیا۔ ارادہ کچھ دیر تک جسم کو حرارت پہنچا کر نماز ادا کرنے کا تھا مگر رات کا تھکا ماندہ ذہن کب نیند کی گہری وادیوں میں اترا اسے خبر ہی نہ ہو گی۔ آنکھ دوبارہ بھابھی کے جگانے پہ کھلی، تب بھی اس کا ذہن پوری طرح بے دار نہیں ہو پایا تھا۔ سر

بھاری اور بوجھل تھے۔

"ارے تمہیں تو بخار ہے۔" بھابھی اس کی پیشانی چھوتے ہی فکر مندی سے گویا ہوئی تھیں۔

"مما! میں آپ کا سر دبا دوں۔" کچھ دیر بعد ہی سلمان اس کے سرہانے آن بیٹھا تھا۔ اس کے معصوم چہرے پہ جو گھبراہٹ اور پریشانی تھی، اس نے اریبہ کے لبوں پہ مسکراہٹ کے کنول کھلا دیے۔ اریبہ نے ممتا کے جذبے سے مغلوب ہو کر اسے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔

"آپ ٹھیک ہو جائیں مما! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" اس کے سینے میں منہ چھپا کر وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگا تھا۔

"کس بات کا ڈر مائی سن۔" اس نے مدھم نقاہت زدہ لہجے میں کہتے اس کے بال سہلائے۔

"مما! احسان کی مما بھی یونہی بیمار ہو کر اسے چھوڑ گئی تھیں۔ مجھے ڈر ہے آپ بھی مجھے چھوڑ نہ جائیں۔" اس نے سسکتے ہوئے اپنے دوست کا حوالہ دیا جس کی ماں مر چکی تھی۔

اریبہ کا دل بے حد عجیب سے احساسات سے لبریز ہو گیا۔

"نہیں بیٹے! اللہ نہ کرے، کہ تمہاری مما کو کچھ ہو۔ ایسی بات نہیں کرتے، اللہ سے دعا کرتے ہیں۔" تائی اماں جو اریبہ کی بیماری کا سنتے ہی اس کے سرہانے آن بیٹھی تھیں، تڑپ کر سلمان کو ٹوک گئیں تو اریبہ نے لب کاٹتے ہوئے سر جھکا لیا تھا۔

پھر تین دن تک وہ بستر سے نہیں اٹھ پائی اور ان تین دنوں میں تائی اماں جیسے اس کی پٹی سے لگی رہی تھیں۔ بھابھی نے اس کی تیمار داری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، فراز نے اپنا ہنی مون صرف اس کی وجہ سے ملتوی کر دیا۔ فرق نہیں پڑا تو عباس حیدر کو اس کے جینے میں جیسے دل نہیں رہا تھا۔ سلمان سے اسے پتہ چلا تھا، کہ وہ واپس ڈیوٹی پہ جا چکا تھا۔ ایک ہفتے بعد اریبہ کی طبیعت سنبھلی تھی۔ تائی اماں نے مزید کئی دن تک اسے بستر سے اترنے کی بھی اجازت نہیں دی مگر اب وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی، جب ہی اس روز فراز سے واپسی کی ٹکٹیں کنفرم کرانے کی بات کرنے کے ارادے سے اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف آئی تو سیڑھیوں کے موڑ پر اس کا سامنا بالکل اچانک عباس حیدر سے ہوا تھا۔

فل یونیفارم میں ملبوس، شانے پہ بیگ لٹکائے صاف لگ رہا تھا وہ ابھی لوٹا ہے۔ اریبہ کی رنگت اس کی آنکھوں سے چھلکتی درشتی اور چہرے پہ ناگواری کے تاثرات کو پاتے ہی بالکل زرد پڑ گئی تھی۔ بے بسی سے ہونٹ کچل کر وہ کترا کر نکل جانا چاہتی تھی مگر آنکھوں میں تیزی سے بڑھتی آنسوؤں کی دھند نے سامنے کا ہر منظر جیسے تاریک کر ڈالا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا اٹھا ہوا قدم صحیح نہیں پڑا اور وہ اگلے ہی پل لڑکھڑا کر زینے سے دل خراش چیخ سمیت گرتی چلی گئی تھی۔ عباس حیدر اسے یوں گرتے ہوئے سکتے کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ حواسوں میں لوٹ کر اس تک پہنچتا، دوڑتے قدموں کی آواز بہت قریب آ گئی۔ اس کے ذہن کو خفیف سا جھٹکا لگا تھا۔ ایک نگاہ فرش پر خون میں لت پت ہوتی اریبہ پر ڈالتا، وہ لب بھینچتے ہوئے باقی ماندہ سیڑھیاں پھلانگتا اپنے کمرے میں جا گھسا۔

☆☆☆

پلٹ کر آنکھ نم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا
گئے دنوں کا غم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا
محبت ہو تو بے حد ہو جو نفرت ہو تو بے پایاں
کوئی بھی کام کم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا

وہ ان اشعار کی مکمل تفسیر تھا۔ وہ ہر احساس میں بہت شدت پسند تھا۔ اریبہ اس کے لیے کبھی کل کائنات تھی اور اب کچھ بھی نہیں، وہ اپنے لیے ایسی شریک حیات چاہتا تھا۔ جو صرف اسے دیکھے، اسے سوچے، اسے چاہے، اس کے علاوہ وہ اس کردار میں ذرا سی بھی بھول برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اریبہ نے تو پھر اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس کی محبت کا مضحکہ اڑایا تھا، اس سے بڑھ کر اس کی تذلیل کیا ہو سکتی تھی کہ وہ اس کے سچے موتیوں جیسے خالص احساسات و جذبات سے کھیل گئی تھی۔ اس کے ذہن میں اس کا امیج بری طرح بکھرا تھا۔ تو باقی کچھ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ اب اگر وہ اس کے سامنے ایڑیاں رگڑ کر مر بھی جاتی تو اسے بالکل افسوس نہ ہوتا۔ پتہ نہیں کیسی محبت تھی اس کی، یا پھر یہ محبت تھی ہی نہیں، وہ اپنے ہر عمل میں خود کو حق بجانب قرار دیتا تھا۔

فراز اور عاصم بھائی کے علاوہ بھابھی نے بھی ان گزشتہ چھ سالوں میں اریبہ کے متعلق اس کی غلط فہمی کو دور کرنا چاہا تھا مگر وہ کچھ سننے پہ آمادہ ہی نہیں تھا۔ سب کو ہار ماننا پڑی

تھی۔ یوں بھی اب وہ عباس تو نہیں تھا جسے وہ سب جانتے تھے۔ یہ تو کوئی سرد گلیشیر تھا جس میں جذبات و احساسات ڈھونڈے سے نہ مل پاتے۔ اسے اماں نے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ زندگی پہ ایک جمود سا طاری تھا۔ سلمان اریبہ سے بے حد اٹیچ تھا۔ پہلے اس کی بیماری اور اب اسے لگنے والی چوٹ نے اسے بہت سہما ڈالا تھا۔ اسے بہلانے کی عباس حیدر کی ہر کوشش ناکام ہوگئی تھی۔

"جی اماں... آپ نے یاد کیا۔" بلیک جینز پہ وائٹ ٹی شرٹ پہنے وہ اس عام حلیے میں بھی اپنی غضب کی دراز قامتی مضبوط کسرتی وجود اور فوجی ہیر کٹ میں اتنا چھایا ہوا، اتنا بھرپور نظر آرہا تھا کہ اماں اسے اپنی ہی نظر لگ جانے کے خوف سے نگاہ بھر کے نہ دیکھ پائیں۔

"ہاں آؤ بیٹھو، کچھ بات کرنی ہے۔" دل ہی دل میں آیت الکرسی پڑھ کر اس پہ دم کرتے ہوئے انہوں نے اپنے پہلو میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"کیا سوچا ہے تم نے؟" اس کے بیٹھنے کے بعد انہوں نے بلا کسی تمہید کے بات کی تھی۔

"کس بارے میں؟" وہ قدرے چونکا تھا۔

"اپنی زندگی کے بارے میں، کب تک یونہی رہو گے۔ دادو تمہیں سمجھاتے قبر میں اتر گئیں۔ ماں کو بھی لحد میں اتارو گے۔ بیٹے! تمہاری یہ اجاڑ زندگی میرے دل کا روگ بن چکی ہے۔ کیوں بوڑھی ماں کو تڑپاتے ہو۔"

عباس حیدر کے لب سختی سے بھینچ گئے تھے۔

"منع کرنے کے باوجود ایک ہی بات کو بار بار کرنا پتہ نہیں آپکو کیا لطف دیتا ہے۔" اس کے چہرے کی طرح اس کا لہجہ بھی ہر احساس سے عاری بالکل سپاٹ تھا۔

"اریبہ پھر واپس جارہی ہے۔ صرف تم اسے روک سکتے ہو بیٹے! میرے اندر جو جرم کا احساس ہے اسے..."

"پلیز اماں! وہ بات مت کریں مجھ سے جسے میں سننا بھی نہیں چاہتا۔" وہ سختی و برہمی سے کہتا ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا تھا۔

"رکو عباس! ابھی ٹھہرو، اریبہ آرہی ہے یہاں۔ بلایا ہے میں نے اسے، اب تم

دونوں کے درمیان جو بھی بات جھگڑے کا باعث ہے، ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر حل ہو گی۔ آخر اس مسئلے کو بھی نمٹانا ہے۔" اماں نے دوٹوک لہجے میں کہہ کر گویا اسے باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ اس کی ماں ہیں مگر ادھر جیسے مطلق اثر نہ دکھائی دیا تھا۔

"جب کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں اماں تو اس کا حل کیا نکالنا۔ آپ کو شاید یاد نہیں، میں اپنی زندگی کے فیصلے خود کیا کرتا ہوں، اور اگر آپ مزید کچھ بھول رہی ہیں، تو میں یاددہانی کرادوں، کہ اس مسئلے کو میں چھ سال پہلے نمٹا چکا ہوں۔ پلیز آئندہ مجھے زحمت مت دیجیے گا۔" بدلحاظ گستاخ لہجے میں کہتا وہ پیچھے ہی پلٹا۔ چوکھٹ پہ پتھر کی مورتی کی مانند ساکت کھڑی اریبہ کو دیکھ کر محض ایک پل کو ٹھٹکا تھا۔ اس کی پیشانی پہ بندھی پٹی پہ ایک پل کو اس کی نگاہ ساکت ہوگئی تھی پھر وہ اسی بےگانگی اور تنفر سمیت اس کے پاس سے نکلا چلا گیا تھا۔ اریبہ کی ساکت نگاہ تائی اماں کے دھواں ہوتے چہرے سے ٹکرائی، جو اس سے نگاہ چرا رہی تھیں۔ بنا کچھ کہے وہ پلٹی تھی اور تیز قدموں سمیت اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔

☆☆☆

سوٹ کیس بند کرنے کے بعد اس نے کاسمیٹکس کھولا وہ ضرورت کی دوسری چھوٹی موٹی چیزیں بیگ میں بھرنا شروع کردی تھیں۔ تائی اماں، بھابھی، فراز سب ہی اس کے یوں بے نیل و مرام لوٹ جانے پہ بے حد افسردہ تھے۔ فراز تو باقاعدہ خفا ہوا تھا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا بھابھی کہ آپ کے سارے تعلق ہی بھائی سے تھے۔ ہم تو کچھ نہیں۔"

اور وہ شکستہ سے انداز میں ہنس پڑی تھی۔ "نہیں فراز! اگر ایسا ہوتا تو میں یہاں نہ آتی۔ صرف تمہاری خاطر ہی تو آئی ہوں۔"

"تو پھر رک کیوں نہیں جاتیں میرے کہنے پہ۔" وہ جھلایا ہوا تھا۔

"رک نہیں سکتی احمق لڑکے، اور جانے والوں کو روکنا سراسر لاحاصل ہوا کرتا ہے۔ میں یہاں رکنے کے ارادے سے نہیں لوٹ جانے کے لیے آئی تھی۔" اس کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی یاسیت کا شکار ہوا تھا۔

"مجھے نہیں پتہ تھا، بھائی آج بھی اس قدر ہٹ دھرم، ضدی اور انا پرست ہوں گے۔ میں شرمندہ ہوں بھابھی آپ سے۔ ہوسکے تو مجھے معاف کر دیجیے، کہ آپ سے اتنے

جھوٹ بولے، صرف آپ کو یہاں بلانے کی خاطر۔ اماں کے فالج بھائی کے بیوی بچوں سمیت گھر چھوڑ جانے اور ابا کا بیمار رہنا، یہی وہ ہتھیار تھے نا جنھیں میں آپ کی کمزوری کے خلاف استعمال کرتا رہا تھا پھر یہ جھوٹ بھی کہ بھائی ہمیشہ کے لیے کینیڈا جا چکے ہیں، کبھی نہ لوٹ کر آنے کے لیے۔ بھابھی! میں کسی بھی صورت آپ کو یہاں بلوانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد کے تمام مسائل میرے نزدیک بہت ثانوی حیثیت رکھتے تھے اور اللہ گواہ ہے بھابھی! میں نے ہر طریقے سے کوشش کر کے دیکھ لی مگر بھائی۔"

"لیو اِٹ ناؤ فراز! اٹس اوکے۔ جانے دو جو ہوا۔" اس نے بہت ضبط سے کہتے ہوئے جبراً مسکرانا چاہا تو آنکھیں بھیگ بھیگ گئی تھیں۔ شدید اہانت اور بے مائیگی کا احساس اسے خون کے آنسو رلا رہا تھا مگر وہ خود پہ قابو رکھنا چاہتی تھی۔

"مجھے آپ کے حوصلوں پہ حیرانی ہے بھابھی! اتنی نازک سی ہو کر بھی آپ نے جس طرح حالات کے مقابل خود کو آہنی دیوار ثابت کیا ہے، وہ قابل ستائش ہے۔ میں بھائی کو کبھی معاف نہیں کروں گا کہ انھوں نے بے بنیاد بات پہ آپ کو اس قدر گہرا رنج پہنچایا۔" وہ آنکھوں میں آئی نمی اس کی نگاہوں سے بچانے کی غرض سے تیزی سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔

☆☆☆

عباس نے ختم ہوتے سگریٹ سے نیا سگریٹ سلگانے کے بعد گہرا کش لے کر دھواں بکھیرا تھا۔ بکھرے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیر کر سر جھٹکتا ہوا وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کی ایک ایک ادا سے اضطراب چھلک رہا تھا۔ وجیہہ چہرے پہ لاتعداد شکنیں تھیں جو اس کی ذہنی الجھن کی واضح غماز تھیں۔ اماں نے اریبہ کے معاملے میں اصل میں ہر قسم کا نفسیاتی حربہ آزما لینے کے بعد اس سے بول چال بند کر دی تھی اور اب ان کی طبیعت خراب تھی۔ فراز الگ منہ بنائے پھر رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل سلمان اس کے پاس آیا تھا۔

"پاپا آپ مما سے خفا ہیں؟" وہ ٹھٹکا گیا تھا۔ اپنے بیٹے کے سامنے بھی اسے اس نازک معاملے پہ جواب دہ ہونا پڑے گا۔ یہ اس نے سوچا تک نہ تھا۔

"پاپا نانو کہتی ہیں جب سامنے والا کسی بات کو مجبور کرے، تو آپ کو وہ سوال دوبارہ اس سے نہیں کرنا چاہیے مگر پاپا! میں نانو کے گھر جانا نہیں چاہتا۔ مما مجھے فورس کر رہی ہیں۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہنا چاہتا، مگر مما کہہ رہی ہیں۔ مجھے لازماً ان کے ساتھ جانا ہے

پاپا! آپ انھیں مناتے کیوں نہیں۔"

وہ ہچکیوں سے رونے لگا تھا۔

"سلمان ......سلمان بیٹے......" عباس بے چین سا ہو کر اس کی جانب بڑھا تھا۔

"رہنے دیں اس دکھاوے کی محبت کو بھائی! مبارک ہو آپ کو اپنی جھوٹی انا اور فضول کی ضد۔ اس کی پرواہ مت کریں۔" فراز جانے کب سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ لاتعلقی سے کہتا روتے بلکتے ہوئے سلمان کو لے کر چلا گیا۔ پیچھے وہ گم صم سا کھڑا رہ گیا تھا۔

"صاحب جی! آپ کا خط ہے۔" ملازم کی دستک کے بعد آمد اسے چونکا گئی۔ لفافے پر موجود ابو ظہبی کی مہر بتا رہی تھی کہ خط بھیجنے والا کون ہو سکتا ہے۔

اب وہ اس سے کیا چاہتی تھیں، اس کے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ آئی تھی۔ لبوں میں دبایا سگریٹ ایش ٹرے میں اچھالتے ہوئے وہ وائٹ لفافہ اٹھا کر چاک کرنے لگا۔

"عباس بیٹے! تم یہ خط پا کر حیران ہو گے، لیکن انسان کو جب تک ٹھوکر نہیں لگتی، اسے ہوش نہیں آتا۔ بیٹے! مجھے بھی دولت اسٹیٹس اور بینک بیلنس کا غرور تھا، میں اپنی بیٹی کی شادی اپنے سے بھی اونچی کلاس میں کرنا چاہتی تھی، جبکہ اس کے باپ کی خواہش اپنے بھائی کے بیٹے کے ہاں تھی، جس کے میں صرف نام سے واقف تھی اور یہی واقفیت میری شدید نفرت کا روپ دھار گئی۔ جب اریبہ باپ کی شہ پا کر پاکستان آئی، تو میں اپنی پہلی شکست پہ بہت تلملائی تھی مگر مجھے گمان تک نہ تھا۔ تقدیر مجھے اس طرح چاروں شانے چت گرا دے گی۔ اریبہ کا نکاح وہاں جن حالات میں بھی تم سے ہوا، اس سے تم بے خبر نہیں رہے ہو گے، مگر مجھے جب پتہ چلا تو میں تو جیسے غم و غصے سے پاگل ہو اٹھی۔ وہ میرا خواب تھی ایسا خواب، جسے میں کسی بڑی فیملی میں بیاہ کر پورا کرنا چاہتی تھی مگر وہ خاک میں مل گیا۔"

غم و غصے اور شدید قسم کی بے بسی کے ساتھ مجھے اپنی توہین اور شکست کا احساس نیم پاگل کر چکا تھا۔ پہلی بار فون کرنے پہ میں نے اریبہ کو بے نقط سنائی تھیں۔ اس کے احساسات کے مجروح ہونے کی پرواہ کیے بغیر۔ دوسری مرتبہ میں نے ہتھیار بدلا تھا۔ میں اسے محبت کے دام میں الجھا کر اس کی معصومیت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ میرا مقصد ہر قیمت پر اپنا مقصد حاصل کرنا تھا، اس کے لیے چاہے اریبہ کتنی ہی بری طرح سے برباد کیوں نہ ہوتی۔ مجھے پروا نہیں رہی تھی۔ حیران مت ہو اس وقت میں ماں بن کر نہیں، ایک عورت

بن کر سوچ رہی تھی، جسے اپنی شکست کا احساس جنونی بنا رہا تھا۔ جو کبھی ہاری نہیں تھی، اور غیر متوقع ہار پہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی ہر خوشی کو بھی داؤ پہ لگا کر اپنی ہار کو فتح و کامرانی میں بدلنے کی خواہاں تھی۔

اریبہ ولیمہ کے دن میرے یکسر بدلتے ہوئے انداز پہ جتنا حیران تھی، اس سے بڑھ کر خوش، مگر اس کی یہ خوشی میں نے تب غارت کر دی جب اگلی بار فون کر کے میں نے اسے ہر قیمت پہ واپس لوٹ آنے کا حکم دیا، وہ صاف انکاری ہو گئی تھی۔ اس کا یہ انکار ہی مجھے شاکڈ کر گیا تھا۔ اس کے پاپا کا اس کی خوشی میں شریک ہونا میرے لیے پہلے ہی کم اذیت ناک نہیں تھا۔ اس کے انکار نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔ بہت بیش قیمت زیورات تھے، جو میں نے بہت شوق سے اریبہ کے لیے ہی بنوائے تھے، مگر علی شیر نے وہ زیورات عباس کی دلہن کو تحفہ دے کر جیسے میرے اندر زہر بھر دیا تھا۔ میں ناگن کا روپ دھار چکی تھی، تب میں نے اریبہ کو دھمکی دی تھی۔ میں اسے کسی بھی طرح خوف زدہ کر کے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی، مگر وہ مجھ پہ عباس حیدر کو فوقیت دے رہی تھی۔ وہ اپنی ماں کی محبت پہ اپنے شوہر کی محبت کو ترجیح دے رہی تھی۔ میری دھمکی کے جواب میں اس نے رو رو کر اپنی خوشیوں کی بھیک مانگی تھی۔ وہ گڑگڑا کر ایک ہی بات کہتی رہی تھی، کہ اسے عباس حیدر سے محبت ہے۔ اس کا یہی گڑگڑانا، رونا، تڑپنا مجھے مزید پاگل بنا گیا۔ مجھے اس پہ ترس آنے کے بجائے غصہ آیا تھا۔ اس نے مجھ پہ کسی اور کو اہمیت کیوں دی، اور تب اس روز میں نے فون پہ تمہاری آواز پہچان لینے کے باوجود، یوں ظاہر کیا جیسے میں نے تمہیں اریبہ ہی سمجھا ہے۔ میں نے وہ سارا زہر تمہارے اندر بھر دیا، جو میرے وجود کو نیلا کرتا جا رہا تھا۔ وہ فہد جس کا سرے سے وجود نہیں تھا، میں نے اتنے یقین سے اس کے خلاف تمہیں بھڑکایا، کہ میں اپنی اس کامیابی پہ ہفتوں مہینوں خوش ہوتی رہی۔ مجھے خوف تھا، تم فون بند نہ کر دو، اس لیے میں نے مختصر سے لمحات میں بھی بھرپور طریقے سے جم کر اپنا کھیل کھیلا، اور مطمئن ہو گئی، مگر مجھے یہ خبر نہیں تھی، زمین پہ چال چلنے والوں کے خلاف تدبیر کرنے والا اوپر بھی موجود ہے، جو ہم جیسے غافل سرکش اور فسادی سوچ کے مالک کھلونوں کو ایک جنبش سے اٹھا کر پٹخ سکتا ہے۔

اریبہ میری منشا کے مطابق لوٹ آئی، مگر تم نے اسے طلاق نہیں دی تھی کہ اللہ کو یہ جوگ توڑنا نہیں تھا۔ دوسرا شاک مجھے اریبہ کی پریگنینسی کی خبر سے لگا۔ مجھے بہت شدت

سے احساس ہوا تھا، میں اپنی تمام تر سازش سمیت منہ کے بل جا گری ہوں، مگر وہی زعم جو انسان کو عمر بھر ایک فریب ایک دھوکے میں مبتلا رکھتا ہے۔ میں بھی اس سے نہ نکل پائی۔ میں نے اریبہ کا ابارشن کروانا چاہا، مگر میرا ہر ظلم چپ چاپ سہہ جانے والی اریبہ اس مقام پہ میرے مقابل آ گئی۔ یوں عباس حیدر کی محبت کی جیتی جاگتی نشانی کو دنیا میں آنے سے کوئی روک نہ سکا، کہ قدرت کو اس کا دنیا میں بھیجنا مقصود تھا، پھر کوئی کیسے یہ جرأت کر پاتا۔ اریبہ نے مجھ سے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا، مگر وہ بدل گئی تھی، اس کی خاموشی میں اداسی ویرانی کے ساتھ مجھے ایک غیر محسوس سی خفگی بھی جھلکتی محسوس ہوتی، جس کا اس نے کبھی مجھے احساس نہیں دلایا، اریبہ کی بے رنگ زندگی، سلمان کی زندگی میں باپ کی کمی کا خلا، اور علی شیر کی ملامت کرتی نگاہیں، مجھے شدتوں سے مجرم ہونے کا احساس دلاتیں۔ تب فراز کی چھٹی رخصت پہ میں نے اریبہ کو وہاں جانے پہ مجبور کیا تھا۔ میں اور فراز کسی نہ کسی طرح اریبہ کو وہاں بھیج کر اس معاملے کو سلجھانا چاہتے تھے۔

فراز نے مجھے تمہارے سرد رویے اور اریبہ کی واپسی کے متعلق بتایا تو مجھے لگا جیسے اللہ ابھی تک مجھ سے ناراض ہے۔ اب اس کے سوا میرے پاس کوئی حل نہیں عباس، کہ میں اپنے گناہ کا اعتراف کر کے معافی مانگ لوں۔ تمہاری اماں بالکل سچ کہتی ہیں، وہ ان کے نہیں تمہارے کہنے سے رکے گی اس کی عزت نفس اور انا کو کچلنے والے تم ہی تھے، تم ہی اب اس منا سکتے ہو بیٹے، ایک بار پھر التجا کرتی ہوں، کہ میری بیٹی کی خوشی تمہارے ہاتھ میں ہے۔

ایک مجبور ماں، شائستہ علی شیر کا خط عباس حیدر کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کی گود میں جا گرا۔ اس کے وجیہہ چہرے پہ تغیر نمایاں تھا۔ فراخ پیشانی پسینے کے لاتعداد قطروں سے بھیگ گئی تھی۔ اسے یاد آیا تھا اریبہ نے کس طرح رو رو کر اسے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی تھی۔

''مگر!'' اسے بے حد شرمندگی نے آن لیا۔ وہ سخت مضطرب سا ہو کر اٹھا تھا۔

☆☆☆

دھماکے سے دروازہ کھلنے کی آواز پہ اریبہ جو پیکنگ مکمل کرنے کے بعد بیگ کی زپ بند کر رہی تھی دہل کر مڑی، اور عباس حیدر کو دیکھ کر حیرت کی زیادتی سے منجمد ہو گئی۔

''واٹ از دس۔'' درمیانی فاصلہ گنا کر اس کے پاس آتے ہی اس نے انگشت شہادت سے بند ہوتے ہوئے سوٹ کیس کی سمت اشارہ کیا تھا۔ اریبہ جو متحیر اس کی اپنے

کمرے میں موجودگی کی وجہ سوچ رہی تھی اس سوال پہ اور لہجے کی تبدیلی پہ جیسے بے ہوش ہوتے بچی۔

"کہاں جا رہی ہیں، کہ تم واپس جا رہی ہو واپسے!" اگلا سوال وہ تھا جو اریبہ کو سناٹوں سے باہر لانے کا سبب بنا۔ اوہ تو گویا وہ ان سب کے مجبور کرنے پر اسے روکنے آیا تھا۔

"اتنی سرکش کب سے ہو گئیں تم اریبہ عباس حیدر! کہ کسی کی سنے بغیر اپنی من مانی پہ اتر آئیں؟" مزید دو قدم بڑھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ یوں بولا تھا جیسے کشیدگی کے چھ سال ان کے درمیان کبھی بھی نہ تھے۔

"اریبہ عباس حیدر نہیں، اریبہ علی شیر، اور آپ یہ سوال کرنے والے کون ہوتے ہیں؟" وہ اسے اس کی اوقات یاد دلا رہی تھی۔

"گواہان کی موجودگی میں تم نے بقائمی ہوش و حواس اپنے جملہ حقوق میرے نام کیے تھے، بھول گئیں۔" اسے پھر اپنی زیادتی کا احساس نہیں تھا اریبہ کو ایک بار پھر اس کے یکسر بدلے ہوئے انداز پہ حیرانی ہوئی۔

"اگر آپ کسی بھول میں ہیں، کہ میں آپ کے روکنے سے رک جاؤں گی تو ایسا بالکل نہیں ہے۔" اس کی بے بس کر دینے والی گہری نظروں سے نظریں چراتی وہ جس یقین سے بولی تھی۔ اس نے عباس کے لبوں پہ مبہم سی مسکراہٹ بکھیر دی۔

"عباس حیدر اگر کوئی بات کہتا ہے تو اسے پورا کروانا بھی جانتا ہے۔ جا کے دکھاؤ مجھے۔" سوٹ کیس کو زوردار ٹھوکر سے ایک طرف الٹ کر وہ دھونس بھرے لہجے میں بولا تو اریبہ سخت مشتعل ہو کے اسے گھورنے لگی تھی۔

"چاہتے کیا ہیں آپ، اس قسم کی فضول حرکات سے؟" وہ ہونٹ بھینچ کر چلائی تھی۔ لہجے میں موجود بے بسی، جھنجلاہٹ اور تپش بہت نمایاں تھا۔

"یہ بھی کوئی بتانے والی بات ہے۔ جانتی تو ہو تم" وہ مسکرا کر کہتا اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ اس کی نروس کرتی ہوئی نظریں اریبہ کے اندر سستی کا احساس بن کر دوڑ رہی تھیں۔

"اگر ایسی بات ہے تو مجھے روک کر دکھاؤ جا رہی ہوں میں۔"

ہینڈ بیگ اٹھا کر سامان کو پکڑتی ہوئی وہ آنچ دیتے لہجے میں جتا کر کہتی، جیسے ہی

دروازے کی طرف لپکی تھی۔ عباس نے فل کی پھرتی سے اس سمت مڑتے ہی اس کا ہاتھ دبوچا تھا اس سختی سے کہ اریبہ کو اپنے ہاتھ کی ہڈیاں ٹوٹتی محسوس ہوئیں۔ اسے یونہی کھینچتا ہوا بیڈ تک لایا اور زوردار جھٹکے سے اسے بستر پہ گرا دیا۔

"جا کر دکھاؤ مجھے، پھر دیکھنا کیا حشر کرتا ہوں میں تمہارا، یو آر پارٹ آف مائی فیملی۔ ناؤ سو بی کیئرفل نیکسٹ ٹائم۔" وہ گویا غرایا تھا اس کا یہ برہم روپ اور مشتعل رد عمل اریبہ کے حواس چھین لے گیا۔ وہ خوف سے پھٹی آنکھوں سمیت اس کا تنا ہوا چہرا اور انگارہ سے برساتی آنکھوں کو دیکھتی رہ گئی۔ کم از کم اب اسے اس سے اس حد تک اشتعال و زور زبردستی کی توقع نہیں تھی۔

"جب کوئی حق نہیں دیا تھا تو پھر یہ بھی کیوں؟" اس کے اندر جیسے کوئی شوریدہ سر لہر اٹھی تھی جو پورے وجود کو اسی غم و غصے میں بہا لے گئی، اس کی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں میں ہر منظر جیسے دھندلانے لگا تھا، مگر اس نے سختی سے آنکھیں پونچھ کر سر جھٹک دیا۔ وہ اب اتنی کمزور نہیں تھی، جتنا عباس حیدر اسے سمجھ رہا تھا۔ اس کی اس خوش فہمی کو اس کے منہ پہ مار دینا چاہتی تھی، جتنی تذلیل، جس قدر استحصال وہ اس کی کر چکا تھا اس کے بعد کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔

"آئی ایم سوری اریبہ! اگین سوری پلیز چپ ہو جاؤ میں تمہیں روتے نہیں دیکھ سکتا۔"

وہ اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھا اس کی منت سماجت کر رہا تھا۔ اریبہ نے سرخ آنکھوں سمیت اسے دیکھا، اور سائیڈ سے ہو کر بیڈ سے اتر گئی۔

"مجھے افسوس ہے مسٹر عباس، کہ میں آپ کی بات نہیں مان سکتی، کہ میں آپ کی فیملی کا حصہ نہیں ہوں نہ ہی میرا آپ سے کوئی تعلق ہے۔"

سرد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہتی وہ اس قدر تلخ ہو گئی تھی، کہ عباس حیدر ایک پل کو سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آیا یہ وہی اریبہ ہے، جو کبھی بہت بری طرح سب کے سامنے اس کے سفاک فیصلے کی بھینٹ چڑھ کر بھی حرف شکایت زبان پہ نہیں لاتی تھی۔

"اگر واقعی ایسا ہے، تو پھر ٹھیک ہے، مگر ایک شرط ہے، یہی بات تم میری آنکھوں میں دیکھ کر کہہ دو، میں تمہیں جانے سے نہیں روکوں گا۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلکے سے جھٹکے سے

اپنے سامنے لاتے ہوئے وہ مدھم لہجے میں کہہ گیا تھا۔

"ہاتھ چھوڑیں میرا۔" وہ اس سے نگاہ ملائے بغیر خفگی سے بولی۔

"اگر نہ چھوڑوں تو...... اریبہ میں یہ ہاتھ کبھی بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا میری محبت کی تم گواہ رہی ہو۔ جانتی ہو نا۔ میں مانتا ہوں یہ میری غلطی تھی کہ میں نے تمہاری بات پہ یقین نہیں کیا مگر پلیز مجھے معاف کر دو صبح کے بھولے کو۔"

اس کے دلکش پیکر کو نرمی سے بازوؤں کے حصار میں لیتا ہوا وہ سرگوشی سے ذرا بلند لہجے میں بولا تھا۔

"جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا وہ غلط تھا مگر میں کیا کروں، میرے مزاج کی شدت تم جانتی ہو غم و غصہ کی شدت نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ ابھی اگر تمہارے دل کا غبار نہیں دھلا تو میرا کندھا حاضر ہے جتنا مرضی رو لو مگر پھر سے جانے کی بات مت کرنا پھر شکایت بھی تمہیں ہوگی کہ میں غصے میں آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتا ہوں۔"

اس کا چہرا اٹھا کر نرمی سے آنسو صاف کرتا ہوا وہ مسکرا کر گویا ہوا۔ اریبہ کی بھیگی بھیگی پلکیں جھک گئیں۔ مطلع صاف ہو چکا تھا۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ وہ عباس کی بات آج بھی ٹال نہیں سکتی تھی۔ اپنی تمام ترکج ادائیوں اور ستم گری سمیت وہ آج بھی اس کے لیے جزو لازم تھا جس کے بغیر وہ ادھوری تھی اس کی تمام کج ادائیوں کو بھلا کر ایک گھر کی بنیاد رکھنا چاہتی تھی۔

